ڈاکٹر سلیم اختر
بحیثیت نقاد
ڈاکٹر جلیل اشرف

ڈاکٹر سلیم اختر: بحیثیت نقاد

از

ڈاکٹر جلیل اشرف

ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، لاہور (پاکستان)

اورنگ زیب قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ

نام کتاب : ڈاکٹر سلیم اختر: بحیثیت نقاد

مصنف : ڈاکٹر جلیل اشرف

اہتمام : عرفان احمد خان

ایڈیشن : پہلا ایڈیشن 5 جنوری 1999ء

(اس کتاب کا انڈین ایڈیشن 1998ء میں شائع ہو چکا ہے)

قیمت : 225 روپے

پبلشر : ٹی اینڈ ٹی پبلشرز،

E/101-S-31، بنک کالونی، سمن آباد،

لاہور (پاکستان) فون نمبر : 7576894 (042)

پرنٹر : زاہد بشیر پرنٹر، لاہور

ISBN NO: 969-8305-05-X

ACCESSION 13761
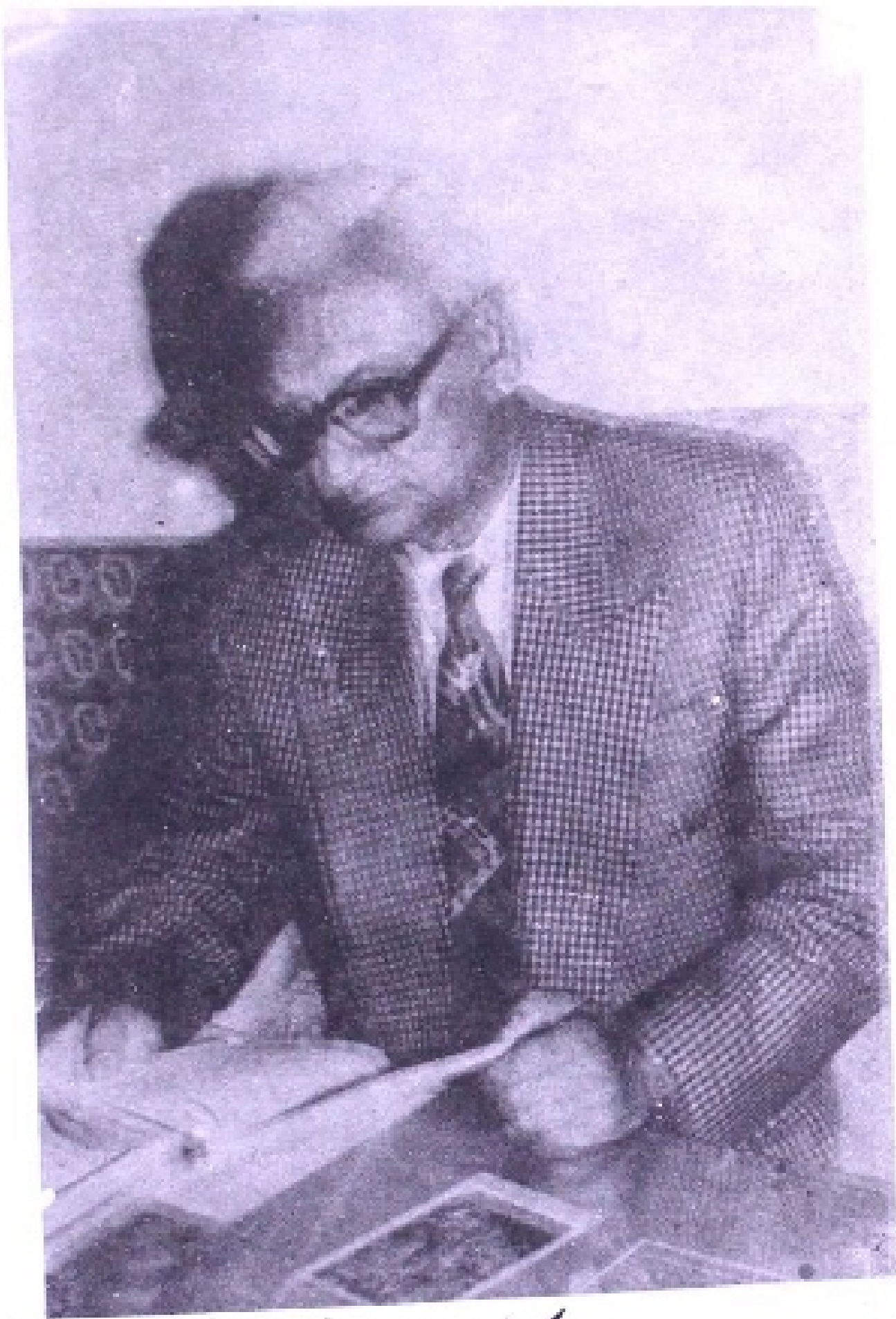
ڈاکٹر سلیم اختر

اپنے والدین کی پاک روحوں

کے نام

جن کی شفقتوں اور محبتوں

کی یاد

میرے لئے زندگی میں روشنی اور رہنمائی

کا باعث بنی رہی

جلیل اشرف

ترتیب

اورنگ زیب قاسمی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

پیش لفظ

ڈاکٹر سلیم اختر ایک کثیر الجہت ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ تنقید، نفسیات، افسانہ نگاری، تاریخ ادب، بچوں کے ادب کی تخلیق ــــــ یہ سب ان کے ادبی کارناموں کے مختلف پہلو ہیں۔ تنقید بطورِ خود ایک ایسی صنف ادب ہے جس کے حدود بہت دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ صنف جہاں خود متعدد ضمنی اصناف کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے وہاں ہر ذیلی صنف وسعت اور گہرائی میں بحرِ بے پایاں سے کم نہیں۔ سلیم اختر اس بحرِ بے پایاں کے ایسے شناور ہیں جو اس کی گہرائی سے نئے ادبی اور تنقیدی گوہر ڈھونڈ کے لائے ہیں۔

اپنے اس زیرِ تحریر دیباچے میں مجھے ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید نگاری کو موضوعِ گفتگو یا موضوعِ بحث نہیں بنانا ہے۔ سلیم اختر کی تنقید نگاری تو اس تحقیقی مقالے کا موضوع ہے ہی، جس کے لئے میں یہ چند تمہیدی سطور لکھ رہا ہوں۔

(۲)

چند برس قبل جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید نگاری پر پروفیسر وہاب اشرفی کی زیرِ نگرانی ایک اسکالر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں تو میرے لئے یہ اطلاع دلی مسرت کا باعث ہوئی۔ میری مسرت کا سبب یہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر سلیم اختر میرے دوست ہیں اور ان کے کام پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جا رہا ہے بلکہ سبب یہ تھا کہ پاکستان کے ایک نامور اور صفِ اول کے نقاد کے کام پر جس نے تنقید میں نئے اسلوب کی نشاندہی کی ہے ہندوستان میں مقالہ لکھا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ پاکستان کے ایک قابلِ قدر مصنف کے کام پر ہندوستان میں تحقیقی مقالہ لکھا جانا میری اس سوچ بچار کے چوکھٹے میں ٹھیک ڈھنگ سے بیٹھ سکتا ہے جو میری نظم و نثر میں جابجا نمایاں ہے۔ یعنی ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات میں لسانی، علمی، ادبی، سماجی اور ثقافتی کام کے ذریعے بہتری اور خوبصورتی کی صورت پیدا کرنا۔ اور اگر میری مسرت کا سبب

بھی ہو تو میں اس میں یہ اضافہ بھی کروں گا کہ ڈاکٹر سلیم اختر پر جن کے ادبی کارناموں پر ابھی متعدد تھیسس اور لکھے جائیں گے اور ان کا ایک سلسلہ چل نکلے گا، تحقیقی کام کی ابتدا ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ میں اسے آج کے دور میں ایک نیک فال سمجھتا ہوں۔

میں نے ادب کو زندگی سے کٹا ہوا ہوا میں معلق مفروضہ کبھی نہیں سمجھا۔ آج اگر ہندوستان اور پاکستان اپنی تہذیب اور کارناموں پر فخر کرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچے ہیں کہ ہندوستان میں بابری مسجد منہدم ہو جاتی ہے اور اس کے جواب میں پاکستان میں متعدد مندر توڑ پھوڑ دیئے جاتے ہیں اور اس کا جواب ہندوستان میں پھر مسلم کش فسادات کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اہل قلم حضرات اور دانشوروں کی زبان پر تالے لگ جاتے ہیں اور اس ماحول میں جس نے مذکورہ صورت حال پیدا کی ہندوستان کی ایک یونیورسٹی کا اسکالر پاکستان کے ایک مسلم ادبی حیثیت کے اہل قلم پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی خواہش کرتا ہے، اس کا نگراں اس کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یونیورسٹی تک اس خواہش کو پہنچاتا ہے اور یونیورسٹی اس موضوع پر اسکالر کو مقالہ لکھنے کی اجازت دیتی ہے اور اسے اس کام کے لئے سہولتیں بہم پہنچاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ابھی روشنی کی ایک کرن موجود ہے اور ہو سکتا ہے کہ روشنی کی یہ کرن آگے چل کر ہمارے عالم ظلمات کو عالم تجلیات میں بدل دے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کا ایک مستحکم رشتہ پیدا کرنے کے لئے دونوں ملکوں کے سیاست دان ناکام ہو چکے ہیں۔ یا تو یہ حضرات چاہتے نہیں کہ ان ملکوں کے باہمی تعلقات اچھے ہو جائیں اور یا پھر یہ اس صلاحیت اور اہلیت سے عاری ہیں جو اس عظیم مقصد کی تکمیل کا مرحلہ طے کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس ناکامی کا سبب کوئی بھی ہو اب وقت آ گیا ہے کہ اہل قلم اور دانشور حضرات اس مسئلے پر غور کریں اور سنجیدگی سے سوچیں کہ دونوں ملکوں کو قریب لانے کے لئے وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں اور اس ضمن میں جس قدر جلد وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں گے اتنا ہی دونوں ملکوں کی آنے والی نسلیں اُن کے اس احسان کے لئے اُن کی ممنون اور شکر گذار رہیں گی۔ جو قومیں یا حکومتیں اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے فتنہ و فساد کا بیج بو کر جاتی ہیں انہیں کوئی اچھے لفظوں میں یاد نہیں کرتا بلکہ تاریخ میں ان کا ذکر خراب ترین لفظوں میں کیا جاتا ہے۔

(۳)

جلیل اشرف کا زیر نظر مقالہ صحیح معنی میں ایک ادب پارہ ہے۔ دراصل یونیورسٹیوں میں لکھے ہوئے تحقیقی مقالوں کو مسودوں کی صورت میں دیکھنے کا اتفاق مجھے اس وقت ہوا جب میں ١٩٧٨ء میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کے طور پر جموں یونیورسٹی میں آیا۔ جہاں تک ان مقالات کو متن کے نقطۂ نظر سے دیکھنے

اورنگ زیب قاسمی

کا تعلق ہے میں اس وقت ١٩٩٣ء تک آتے آتے تو اس کام سے تھک گیا ہوں لیکن اب سے چند برس پہلے تک یہ صورت نہیں تھی۔ تحقیقی مقالات کو میں ہمیشہ خوش آمدید کہتا تھا اور اکثر و بیشتر مقالات میں پہلا باب کچھ اس طرح کے عنوان کا ہوتا تھا "معاشرتی و سماجی پس منظر" اور نہایت کم تعداد میں مقالات کو چھوڑ کر اس باب میں بالعموم خرافات کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا ہاں اگر مصنف نفس مضمون اور سیاسی اور سماجی پس منظر میں ایک ادبی اور سماجی رشتہ پیدا کر سکے تو کیا ہی کہنا ورنہ اس عنوان کے زیر تحت لکھا ہوا باب اور باقی کتاب ایک ایسے شعر کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو دو مختلف مصرعوں سے مل کر بنا ہوا اور اگر ایک مصرعے کو حشو سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے تو دوسرے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مجھے یاد ہے جب دہلی کے ایک پروفیسر نے ایک ادبی موضوع پر مقالہ لکھا اور اس کا بیشتر حصہ معاشرتی، سماجی اور سیاسی پس منظر پر مبنی لاتعلق مباحث کی نذر کر دیا تو قاضی عبدالودود کا یہ جملہ ملک بھر میں گونج اٹھا تھا کہ جس ادبی موضوع پر یہ تحقیقی مقالہ لکھا گیا ہے اُس کے سوا اس کتاب میں سب کچھ موجود ہے۔ جلیل اشرف کے مقالے میں مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ مصنف نے سیاسی سماجی یا معاشرتی پس منظر کے نام سے صفحات کی تعداد بڑھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ پہلے ہی باب میں سلیم اختر کے حالات زندگی کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی تصنیفات و تالیفات پر بھی اس طرح خامہ فرسائی کی ہے کہ شخصیت اور تخلیقی ادب ایک اکائی کی صورت میں قاری کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اصل میں ایک ادیب یا فن کار کی شخصیت اس کی تخلیقی ادب سے الگ ہستی نہیں رکھتی۔ شخصیت کی بھرپور تشکیل اور تکمیل ایک اہل قلم یا فن کار کی تخلیق ہی ہوتی ہے اور جلیل اشرف نے سلیم اختر کی شخصیت اور سلیم اختر کی تخلیقی ادب کو اس طرح ایک اکائی کی صورت میں پیش کیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں رہتا۔

میرے اگرچہ سلیم اختر کے ساتھ ١٩٥٦ء سے دوستانہ مراسم چلے آ رہے ہیں اور میں نے ان کی تقریباً تمام کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن ان کے متعلق اکثر باتیں جلیل اشرف کے مقالے ہی سے میرے سامنے آئی ہیں۔ مثلاً سلیم اختر نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی اور عبدالحمید عدم ان کے کلام میں اصلاح دیا کرتے تھے یا یہ کہ میٹریکولیشن تک پہنچتے پہنچتے بچوں کے لئے ان کی دو کتابیں "جادوگر کا انتقام" اور "فلم کی کہانی" شائع ہو چکی تھیں اور یہ بھی کہ اسی زمانے میں انہوں نے کئی ایسے مضامین بھی لکھے جو سائنس اور معلومات عامہ کے موضوعات پر تھے اور علامہ اقبال اور میر تقی میر پر بھی مضامین لکھے گویا بقول شیخ سعدیؒ

بالائے سرش ز ہوش مندی   می تافت ستارۂ بلندی

اس باب میں مصنف نے سلیم اختر کی مندرجہ ذیل تصنیفات اور تالیفات کا تعارف کراتے ہوئے ان کتابوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور آگے آنے والے ابواب کے لیے ایک ایسی تمہیدی فضا

پیدا کی ہے جیسے ایک بلند و بالا عمارت کے لئے بنیاد اٹھائی جاتی ہے۔

اگرچہ ڈاکٹر سلیم اختر بیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں لیکن مقالہ نگار نے اپنے موضوع کی حدود ہی میں رہنے کے لیے ان کی صرف مندرجہ ذیل کتابوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔

نگاہ اور نقطے، عورت، جنس اور جذبات، ہماری جنسی زندگی، تخلیق اور لاشعوری محرکات، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، افسانہ حقیقت سے علامت تک، ادب اور لاشعور، تنقیدی دبستان، اقبال اور ہمارے فکری رویے، ادب اور کلچر، اور شعور اور لاشعور کا شاعر غالب۔

بظاہر عورت، جنس اور جذبات یا ہماری جنسی زندگی ایسے موضوعات سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ موضوعات صرف جنس سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مذکورہ کتابیں NANCY FRIDAY یا HOWAR BARLEARA کی کتابیں نہیں ہیں۔ یہ ادب کے ایک مسلمہ حیثیت کے نقاد کی کتابیں جس کے لیے نفسیات ایک SPECIALISED SUBJECT کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہ کتابیں تنقیدی کتابوں کی ذیل میں آتی ہیں۔ چنانچہ جلیل اشرف لکھتے ہیں کہ سلیم اختر کی تنقید کو نفسیاتی تنقید کہنے کے بجائے ذہنی کشادگی کی تنقید کہنا زیادہ مناسب ہے ۔۔۔ محمد علی صدیقی نے قریب قریب یہی بات اپنے انداز سے کہی ہے۔ "افسانہ حقیقت سے علامت تک" کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "سلیم اختر تخلیقی تنقید کے قائل ہیں اور اردو افسانے پر تنقیدی مضامین کے اس مجموعے میں بھی جگہ جگہ ایک ایسے ذہن کی کارفرمائی ملتی ہے جو بہت غور و خوض کے بعد ایک موقف بناتا ہے اور پھر اسے اپنے تقابلی مطالعے کی بنیاد پر ایسے تنقیدی پیمانوں کے حوالے کرتا ہے جو اس کے لیے محترم اور قابل اعتنا ہیں"۔

مقالے کا دوسرا باب جو خاصا طویل ہے سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید کے بارے میں ہے۔ نفسیات سلیم اختر کا خاص موضوع ہے جس کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے سلیم اختر کی کاوش، لگن اور جذبہ تجسس کی داد دینا پڑتی ہے یہ جذبہ تجسس ہر اعتبار سے قابل تعریف اور باعث رشک ہے۔ سلیم اختر نے نفسیات اور ادبی تنقید کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے مشرق و مغرب کے مستند مصنفین کا بھرپور مطالعہ کیا ہے۔ اس فہرست میں مرزا رسوا، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، وحیدالدین سلیم، مسعود الحسن رضوی، پروفیسر احتشام حسین، نیاز فتحپوری، محمد حسن، میراجی، فرائڈ، لاانسلاٹ، وحید قریشی، محمد حسن عسکری، ژونگ، ژونگ سے متاثر ہونے والے اہل قلم، ڈاکٹر محمد اجمل، ابن فرید، سجاد باقر رضوی سب آجاتے ہیں۔ یہ فہرست خاصی طویل ہے ایڈلر کے ذکر میں اردو کے شعراء اور فکشن نگاروں مثلاً عبدالعزیز خالد اور میرزا ادیب کی مثالیں سلیم اختر کی بات میں وزن و وقار پیدا کرتی ہیں۔

اورنگ زیب قاسمی

تیسرا باب "تفہیم اقبال اور ڈاکٹر سلیم اختر" زیر نظر مقالے کا ایک بہت ہی اہم باب ہے۔ سلیم اختر کے "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" میں جو کچھ لکھا ہے اس کے مطالعے سے بڑی حد تک اقبال کی نفسیاتی گرہیں کھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ [1]

مذکورہ باب مقالے کا ایک بہت ہی وقیع باب ہے جس میں اقبال اور اقبالیات سے ڈاکٹر سلیم اختر کی ہر کتاب زیر بحث آگئی ہے یہ باب لکھنے میں جلیل اشرف کو بہت محنت کرنی پڑی ہوگی لیکن اس باب کی بدولت تحقیقی مقالے کا پایہ بلند سے بلند تر ہوگیا ہے اور یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اقبال کی نفسیات کو ان کی شاعری یا نثر سے الگ کر کے دیکھنے اور اس پر بحث کرنے سے بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی نامناسب نہیں ہوگا کہ جہاں تک مطالعۂ اقبال کا تعلق ہے سلیم اختر نے دیدہ ریزی اور کاوش فکر سے نقد و نظر کے نئے جادے تراشے ہیں۔ ان کی کتاب "اقبال اور ہمارے فکری رویے" سلیم اختر کے اس فکری رویے کی ایک روشن مثال ہے اس لیے اقبال پر سلیم اختر والے باب کا اس طرح سے بھرپور ہونا ضروری تھا۔

میں نے اس دیباچے کے شروع میں لکھا ہے کہ سلیم اختر کی ادبی شخصیت کئی ابعاد کی حامل ہے۔ یہ ایک کثیر الجہت شخصیت ہے۔ چنانچہ انشائیہ اور افسانے کے تعلق سے بھی مجھے اپنے یہ الفاظ دہرانا پڑ رہے ہیں کہ انشائیہ اور افسانہ بھی سلیم اختر کے SPECIALISED SUBJECTS ہیں جہاں تک انشائیہ کی ابتدا کا تعلق ہے پاکستان میں یہ بحث ایک نازک دور میں داخل ہو چکی ہے کہ اس صنف کا موجد کون ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جلیل اشرف اس خارزار سے صحیح سلامت گزر گئے ہیں۔

---

[1] اس باب میں راقم التحریر کے بھی چند اقتباسات ماہنامہ "شب خون" کے حوالے سے شامل کیے گئے ہیں۔ جن کا ذکر میں کسی بحث کے پیش نظر نہیں بلکہ ایک غلطی کے ازالے کے طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ اقتباسات بھی اپنی جگہ صحیح ہیں اور ان کا محل استعمال بھی ۔۔۔ لیکن میں نے "شب خون" کو جب بھی یہ مضمون بھیجا تو اس کا عنوان میں نے دیا "عطیہ فیضی، ویگے ناسٹ اور اقبال"۔ "شب خون" میں جب یہ مقالہ چھپا تو اس کا عنوان تھا۔ "اقبال کی زندگی میں دو اہم عورتیں" مجھے عنوان میں تبدیلی ناگوار گزری۔ چنانچہ کچھ مدت بعد اپنے عزیز دوست شمس الرحمن فاروقی سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے اس بات کا ذکر کیا۔ وہ اس تبدیلی سے بالکل بے خبر تھے ۔۔۔ اور اپنا مضمون بھی میں نے فاروقی صاحب کے پتے پر الہ آباد کے پتہ پر بھیجا تھا۔ وہیں دفتر میں عنوان تبدیل کر دیا گیا ہوگا۔ اس سلسلے میں میری گزارش یہ ہے کہ میرے اس مضمون کا حوالہ جب دیا جائے تو "اقبال کی زندگی میں دو اہم عورتیں" کے عنوان سے نہیں بلکہ "عطیہ فیضی، ویگے ناسٹ اور اقبال" کے عنوان سے دیا جائے۔

حرف اول

کسی بھی تحقیقی مقالے کے لئے موضوع کا انتخاب انتہائی مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب تحقیق کار اپنے میلان اور رجحان کے مطابق کام کرنا چاہے۔ تنقید سے میری دلچسپی جیسی کچھ بھی ہے دراصل اس پس منظر سے قائم ہوئی ہے کہ کسی ادب کی تحلیل اور تجزیہ ہی اس سے حظ اٹھانے کی سبیل پیدا کرتا ہے۔ اگر وہ صاحب علم و دانش ہے۔ اس کا مطالعہ وسیع ہے۔ عالمی ادبیات سے اس کی واقفیت ہے، ادب کے مختلف دھاروں سے آشنا ہے۔ روایات پر اس کی نظر ہے اور جدت سے اس کی طبیعت ابا نہیں کرتی اس کا ایک واضح نقطۂ نظر بھی ہے۔ وہ تجزیہ اور تحلیل کے مرحلے سے گذر سکتا ہے۔ تنقیدی محاکمہ اور تقابلی مطالعے کی اس میں صلاحیت ہے۔ نیز اس کا ذہن آزادانہ نتائج اخذ کر سکتا ہے تو ادب کی متن اور اقدار شناسی میں اس کی نگارشات اساسی اہمیت کی حامل قرار پائیں گی۔

ایسے نقاد کم ہیں زیادہ ہو بھی نہیں سکتے۔ میرے نقطۂ نظر سے ڈاکٹر سلیم اختر میں اگر وہ خوبیاں ہیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ میں انہیں پڑھتا رہا ہوں۔ ان کی نفسیاتی تنقید کے بھید بھاؤ سے فی الجملہ خود کو آگاہ تصور کرتا ہوں موصوف کی کتابیں بھی مجھے حاصل ہوتی رہی ہیں، چنانچہ سلیم صاحب کے ذہن اور ان کی زبان نیز اُن کے سلیقۂ اظہار کو سمجھنے میں مجھے آسانی ہوئی ہے۔ انہی وجوہات سے میں اس فیصلے پر پہنچا کہ میں اپنا تحقیقی مقالہ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید نگاری کے موضوع پر سپرد قلم کروں تو یہ میری ادبی دلچسپی کا ایک خاص موضوع ہوگا اور میرے ہم وطن بھی موجودہ عہد کے اس نقاد کے طرز فکر اور روش اظہار کو شاید کچھ بہتر سطح پر جان سکیں گے اور یہ مقالہ آئندہ تخلیقی کاموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بھی ممکن ہے کسی اعتبار سے نشان راہ کا کام دے۔

مجھے مسرت ہے کہ اس تحقیقی کام کی نگرانی اور میری رہنمائی کے لئے پروفیسر وہاب اشرفی نے منظوری عطا فرمائی جس کے لئے موصوف کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں کون واقف نہیں ہے کہ ڈاکٹر وہاب اشرفی اردو دنیا کے ایک ممتاز نقاد اور صاحب طرز ادیب ہیں عالمی تناظر

جہاں تک افسانے کا تعلق ہے ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "افسانہ حقیقت سے علامت تک" اس باب میں زیر بحث رہی ہے اور سلیم اختر کے افکار و خیالات پر بات کرتے ہوئے علامتی افسانہ، تجریدی افسانہ، افسانے میں نفسیاتی محرکات، مختصر افسانہ اور ناولٹ اور ناول کے عناصر ترکیبی پر جلیل اشرف نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

عورت اور مرد کے باہمی رشتوں اور جنسی موضوعات اور مسائل پر اردو میں کم لکھا گیا ہے۔ جلیل اشرف نے صحیح لکھا ہے کہ "ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی بساط بھر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔"

تنقید کے موضوع پر سلیم اختر کی کتاب "دبستان تنقید" ایک اہم کتاب ہے جس میں مختلف مضامین کی صورت میں تنقید کے اہم ترین دبستانوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب پر اور سلیم اختر کے اسلوب پر بھی بحث بھی اس مقالے میں کی گئی ہے۔

میں نے زیر نظر سطور کے شروع میں لکھا ہے کہ اس تحقیقی مقالے کے پہلے باب کے مطالعے سے سلیم اختر کی زندگی کے بعض ایسے گوشے قاری کے سامنے آتے ہیں جن سے ہم لوگ اس وقت تک بے خبر تھے اور اب جب کہ میری یہ مختصر بیانی اختتام کو پہنچ رہی ہے مجھے یہ کہتے ہوئے دلی مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ سلیم اختر کے کام پر بحث و تمحیص کا حق جس طرح جلیل اشرف نے ادا کیا ہے ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ جلیل اشرف نے ایک تو سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہ اپنی جگہ بڑی بات ہے۔ دوسرے انہوں نے اپنے اس مقالے کے ذریعے سے ان رستوں کی نشاندہی کر دی ہے جن پر چل کر دوسرے مصنفین سلیم اختر کے کام کے نئے پہلوؤں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح اس بحر زخار میں نئے گوہر تلاش کر کے لا سکتے ہیں۔ میں اس مقالے پر ڈاکٹر جلیل اشرف اور ان کے سپروائزر پروفیسر وہاب اشرفی کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

جگن ناتھ آزاد
۱۶ فروری ۱۹۹۳ء

اورنگ زیب قاسمی

بھی تحقیق و تنقیدی نظریات سے کلی طور پر واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اپنی نگارشات میں اس کے قابل ذکر اور لائق تحسین نمونے پیش فرما چکے ہیں۔ بہر طور پروفیسر وہاب اشرفی صاحب نے میرے منصوبے کو APPROVE کیا۔ کام کا خاکہ مرتب ہوا اور میں نے اس موضوع پر اپنا کام شروع کردیا۔ جس وقت کام کا منصوبہ تیار ہوا تھا چند ہی کتابیں میرے پیش نظر تھیں۔ رفتہ رفتہ میرا مطالعہ آگے بڑھا تو بہت سی نئی کتابیں اور میرے موضوع سے متعلق علمی مواد میرے سامنے آیا۔ جس سے میرے کام کا ابتدائی خاکہ متاثر ہوا اور اس میں میرے تنقیدی مطالعہ کے لئے نئے فکری زاویے اور خطوط سامنے آئے۔ جن کو بنیادی خاکے میں مفید اضافوں کے ساتھ شامل کیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی نگارشات کا سرمایہ قابل لحاظ تھا، موضوعات متنوع ——— ان سبھوں پر حکم لگانا آسان نہیں۔ لیکن میں نے اپنے ریسرچ سپروائزر کے مشورے کی رہنمائی اور اپنے مطالعے کی روشنی میں اس سلسلے کو جاری رکھا اور رفتہ رفتہ میرا مقالہ اپنی تکمیل کی منزل کی طرف آگے بڑھتا ہوا نظر آیا۔ میں نے تمام متعلقہ مضامین کتابیں، تراشے وغیرہ جمع کیے ——— تب ہی لکھنے کی طرف رجوع کیا۔ اس کا اظہار میرے لیے باعث فخر و انبساط ہے کہ استاذی پروفیسر وہاب اشرفی نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی، مقالے کو رطب و یابس سے پاک رکھنے کا گر سکھایا، انفرادی انتخاب کے فن سے آشنا کیا، تحلیل و تجزیے کے ہر مرحلے میں مشکل کشائی کی۔ میری کوشش یہ رہی کہ ڈاکٹر سلیم اختر اپنے ادبی شعور نیز اپنی فکری نگارشات اور گذارشات کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو میرے مقالے کے دائرے میں سمٹے ہوئے نظر آئیں۔ اگرچہ کوئی بھی مقالہ یا مطالعہ موضوع مقالہ سے ہر سطح پر انصاف کرسکے یہ مشکل بات ہے اور اکثر ایسا نہیں ہوتا بہر نوع میری کوشش یہ رہی ہے کہ ان کی تمام کتابیں زیر بحث آجائیں۔ اختلافی مسائل پر بھی خوب سی روشنی پڑ جائے اور بحیثیت مجموعی سلیم اختر صاحب کی شخصیت اور شعور اس مقالے میں جھلکنے لگے۔ انہی امور کے پیش نظر اس مقالے کا خاکہ مرتب کیا گیا اور اس میں ضروری اضافے عمل میں آئے۔ اس لیے ابواب اس طرح قائم کیے گئے بلکہ ان میں ترمیم کا سلسلہ بھی رہا۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ پاکستان اور ہندوستان ایک دوسرے سے قریب بھی ہیں اور دور بھی۔ دور اس لیے کہ ایک ایک کتاب، مضمون، رسالے وغیرہ کے حصول میں اب بھی مہینوں لگ جاتے ہیں۔ اس مشکل پر قابو پانا اکثر میرے لیے بھی صبر آزما ثابت ہوا۔ بہر نوع یہ معاملہ مکمل ہوا۔ نظر ثانی کی منزل سے گذرا۔ اور میرے لائق سپروائزر نے اس کو پیش کرنے کی منظوری دیدی۔ اس کا فیصلہ تو میرے قاری میرے نقاد ہی کرسکتے ہیں کہ میں اپنے موضوع سے کس حد تک انصاف کرسکا ہوں اور اپنے طریق رسائی میں کہاں تک میرا نقطۂ نظر معروضی رہا ہے۔ راقم الحروف نے امکانی سطح پر اس امر کی کوشش بھی کی ہے کہ اس میں کسی کی جانبداری یا دلآزاری کا پہلو نہ ہو۔ تعصبات سے الگ رہنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، میں کسی کا طرفدار نہیں لیکن خواہ مخواہ کسی کی بے ادبی اختیار کرنے کی ناروا جرأت بھی نہیں کرسکتا ——— یہاں میں عرض کرتا چلوں کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی کتاب "ہم سفر جگنوؤں کا" (مجھے بالکل آخری وقتوں میں ملی) تب تک میں بہت کچھ لکھ چکا تھا۔ اسی لئے اس کتاب کا اثر میری کتاب پر کبھی محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کتاب (شاید پہلے مل جاتی تو میری رائے نہ جانے کیا ہوتی) بالکل آخری وقت میں میرے مطالعے میں آئی۔ میں اس سے استفادہ کرسکا مگر اپنے مقالے میں اس کے زیر اثر کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

میں استاذی پروفیسر وہاب اشرفی کا تہ دل سے سپاس گذار ہوں ہی ——— اس مرحلے میں زندگی کی شریک سفر پروفیسر خورشید جہاں، صدر شعبۂ اردو ونوبا بھاوے یونیورسٹی کا شکریہ کس طرح اور کن الفاظ میں ادا کروں کہ انہوں نے میرے اس ادبی سفر میں بھی تبادلۂ خیال، مواد کی جستجو اور حقائق کے تجزیے میں بھی حق رفاقت ادا کیا اور سب سے زیادہ یہ کہ میرے فرائض منصبی کے ماسوا معاملات زندگی کی بہت سی ذمہ داریوں کو میرے لیے کم کیا۔ تاکہ میں زیادہ سے زیادہ وقت علمی مطالعے میں صرف ہو سکے۔ ہم دونوں دو نہیں بلکہ ایک ہیں۔ اس لئے دعائیں کسے دوں؟ ممنون کس کا ہوں۔

اس مقالے کی اشاعت میں اگر فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کی مالی مدد اور اخلاقی تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا تو میں اس کتاب کی اشاعت اور طباعت کے لیے شاید اس قدر اہتمام نہ کرسکتا جو اس کے بعد ہی ممکن ہوسکا۔

میں ان تمام احباب اعزا کا بھی ممنون لطف کرم ہوں جنہوں نے اس کام کی انجام دہی پر مجھے مبارکباد دی اور اس طرح آئندہ کاموں کے لیے میری حوصلہ افزائی کی۔

ڈاکٹر جلیل اشرف
شعبۂ اردو
مارکھم کالج آف کامرس
ہزاری باغ
۱/۵/۸۳ء

اورنگ زیب قاسمی

پہلا باب

ڈاکٹر سلیم اختر

(الف) حالات زندگی
(ب) تصنیفات و تالیفات

نام سلیم اختر۔ والد کا نام عبدالحمید تھا۔ ان کا انتقال ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کو بمقام لاہور ہوا۔ یہ نسلاً قریشی ہیں۔ ان کے بزرگوں میں کوئی صاحب قاضی بھی ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا خاندان قاضیوں کا خاندان کہلاتا ہے۔ چنانچہ ان کے والد اپنے نام کے ساتھ قاضی اور قریشی لکھا کرتے تھے۔ ان کے دادا قاضی عبدالحکیم قریشی تھے۔ اور انہوں نے اس زمانے میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا جب لوگ بی۔ اے پاس کرنے والے کو دور دور سے دیکھنے آتے تھے۔ آبائی طور پر پسرور اور سیالکوٹ سے تعلق تھا۔ جہاں ان کے خاندان کے کچھ لوگوں کی زمینیں اور جائداد تھیں۔

ان کی والدہ کا نام رضیہ بیگم تھا۔ ان کا انتقال ۲۰ر اپریل ۱۹۸۶ء کو بمقام لاہور ہوا۔ ان کی والدہ گاؤں کی تھیں اور ان کے گاؤں کا نام رتا تھیرا تھا۔ گاؤں کی ہونے کے باوجود سلیم صاحب کی والدہ پڑھی لکھی تھیں گرچہ انہیں آج کے مفہوم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ قرار نہیں دیا جاسکتا موصوف کی والدہ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ نانا کا نام نور حسن تھا اور یہ لوگ اپنے علاقے کے اچھے زمیندار تھے۔

سلیم اختر کے بہن بھائیوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ سلیم اختر سب سے بڑے ہیں۔ ان کے بعد لاہور ہی میں ان کی دو بہنیں پیدا ہوئیں نسیمہ خالدہ اور شمیمہ خالدہ۔ ان میں سے بڑی ان دنوں راولپنڈی میں ہیں اور چھوٹی گوجرانوالہ میں۔ یہ دونوں ہی شادی شدہ اور بال بچے دار ہیں۔ ان کے بعد پونا میں ایک بھائی پیدا ہوئے جن کا نام خالد حمید ہے۔ یہ ان دنوں نیوجرسی (امریکہ) میں PHYSISTHOSAPYST ہیں ان کے بعد انبالہ شہر میں ان کے دوسرے بھائی عابد حمید پیدا ہوئے۔ اسکول میں غلطی سے ان کا نام عابد حسین درج ہو گیا۔ چنانچہ وہ عابد حسین ہی کہلاتے ہیں۔ سب سے چھوٹی بہن روحیہ راولپنڈی میں پیدا ہوئیں۔ یہ آج کل لاہور

اورنگ زیب قاسمی

میں ہیں اور شادی شدہ ہیں۔

بچپن سے ہی سلیم صاحب کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی تھی اپنے بچپن کے ابتدائی دنوں میں وہ کھلونوں سے شاید کھیلے ہوں لیکن ہوش سنبھالتے ہی وہ مطالعے کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

"مجھے بچپن میں کھلونوں سے کھیلنا تو یاد نہیں لیکن کتابیں پڑھنا یاد ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ والدین ایسے ملے جنہیں خود مطالعہ کا شوق تھا۔ اس لئے مجھے کبھی بھی چھپ چھپ کر مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ مطالعہ کی رفتار اور میری ذہنی استعداد کا یہ عالم تھا کہ میں چوتھی جماعت تک تیرتھ رام فیروزپوری کے جاسوسی تراجم اور ایم اسلم کے لاتعداد ناول پڑھ چکا تھا اور آٹھویں جماعت تک میں ترقی پسند ادیبوں کو پڑھ رہا تھا۔ میرے لکھنے کا بھی کچھ ایسا ہی حال رہا پہلی کہانی پانچویں جماعت میں بچوں کے ایک رسالہ میں چھپی جبکہ آٹھویں جماعت میں ایک قلمی پرچہ میں دو افسانے طبع ہوئے" [1]

جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو اگست ۱۹۴۰ء میں ان کے والد صاحب کو عراق اور ایران بھیج دیا گیا ان دنوں سلیم صاحب کی ایک پھوپھی فورٹ سنڈیمن میں رہتی تھیں وہ انہیں کے پاس بھیج دیئے گئے۔ فورٹ سنڈیمن بلوچستان کا آخری شہر ہے اور اس کے بعد ہی آزاد قبائلی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں وہ ایک سال رہے۔ ان کا یہ ایک سال کا زمانہ آوارہ خرامی میں گزرا۔ اس کے بعد وہ بمبئی آگئے یہاں ان کی دوسری پھوپھی رہتی تھیں۔ سال بھر بعد ان کے والد واپس آئے تو ان کی پوسٹنگ پونا میں ہو گئی اور چند ماہ بعد سلیم صاحب کو ان کے والد نے پونا بلا لیا۔

وہ اگرچہ تیسری جماعت میں پڑھتے تھے لیکن ایک سال ضائع ہو جانے کے باعث انہیں دوسری جماعت میں داخلہ ملا۔ یہ ایک دینی انجمن کا پرائمری اسکول تھا۔ اسکول کے سامنے ہی ایک خاتون پیر حضرت باوا جان کا مزار تھا۔ سلیم اختر اور ان کے خاندان کے افراد پونا چھاؤنی میں واقع بھگوان داس کی چال میں رہتے تھے۔ اسی چال کے سامنے مشہور شاعر عبدالحمید عدم کا مکان تھا۔ عدم صاحب ان کے والد کے دوست بھی تھے اور رفیق کار بھی جہاں پر سلیم صاحب رہتے تھے۔ وہاں سے قریب ہی ایک سنیما "رین بو ٹاکیز" تھا۔ سلیم صاحب کو پونا بہت پسند تھا۔ یہاں وہ ڈھائی سال کے قریب رہے پھر ان کے والد کا تبادلہ انبالہ میں کر دیا گیا۔ یہاں وہ قیام پاکستان تک رہے پھر ۱۵ر نومبر ۱۹۴۷ء میں سب لوگ لاہور آگئے۔ لاہور آنے سے قبل تک کا زمانہ سلیم اختر صاحب نے مختلف شہروں اور علاقوں کو دیکھنے اور سمجھنے میں گزارا۔ جیسا کہ انہوں نے راقم الحروف کو ایک خط کے جواب میں لکھا۔

---

[1] زندگی کے موثر ترین اثر ڈاکٹر سلیم اختر مشمولہ ماہنامہ کتاب لاہور اکتوبر ۱۹۷۰ء

"میں ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء کو لاہور میں پیدا ہوا میرے والد ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم تھے اور انگریزوں کے زمانے میں خاصی جلدی جلدی تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ والد کے تبادلوں کے سلسلے میں قیام پاکستان تک بمبئی، پونا اور انبالہ شہر میں رہے۔ یوں مجھے یہ علاقے بھی دیکھنے کا موقع مل گیا"

سلیم اختر صاحب کی ابتدائی تعلیم لاہور ہی میں ہوئی۔ ان کے والد صاحب نے انہیں ایک انگریزی اسکول میں داخلہ دلوا دیا جو کہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی امتیاز پسندی تھی۔ ان کے والد خوش خوراک بھی تھے اور خوش لباس بھی۔ انہیں ہر معاملے میں اسٹینڈرڈ کا خیال رہتا تھا۔ اسی لئے انہوں نے عام دستور کے مطابق انہیں کارپوریشن یا کسی انجمن کے اسکول میں داخل کرانے کے بجائے انگریزی اسکول میں داخل کرایا۔ جس طرح وہ خود اچھے کپڑوں اور جوتوں کے شوقین تھے۔ اسی طرح وہ اپنے بیٹے کو بھی دیکھنا پسند کرتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد جب سلیم اختر صاحب دوبارہ لاہور پہنچے تو یہاں انہوں نے ساتویں جماعت میں داخلہ لیا۔ کچھ ماہ بعد ہی ان کے والد کا تبادلہ راولپنڈی ہو گیا۔ یہاں وہ بہت دنوں تک رہے۔ راولپنڈی آنے کے بعد مسلم ہائی اسکول میں ان کا نام آٹھویں جماعت میں درج کرایا گیا۔ دو سال بعد اس اسکول کو چھوڑ کر ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ۱۹۵۱ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج اصغر مال راولپنڈی سے ۱۹۵۳ء میں ایف۔ اے سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۵۵ء میں اسی کالج سے بی۔ اے۔ پاس کیا۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ان کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ چند برسوں کے لئے منقطع ہو گیا۔ ان کی چھوٹی بہن شادی کے لائق ہو چکی تھیں۔ سب سے بڑا بھائی ہونے کے ناطے سلیم اختر صاحب نے اپنے فرض کو محسوس کیا۔ گھر والوں کو اس وقت سلیم اختر سے مدد کی ضرورت تھی۔ لیکن ملکی حالات ایسے نہ تھے کہ کوئی اچھی سی ملازمت ہاتھ لگ جاتی۔ ان کے والد ان دنوں سیالکوٹ میں اپنی ملازمت پر تھے۔ سلیم اختر صاحب اپنے ایک دوست ظفر اقبال سے ملنے پشاور گئے۔ وہیں "روزنامہ شہباز" کے ایڈیٹر شریف فاروق سے ان کی ملاقات ہو گئی اور شریف فاروق نے انہیں اپنے اخبار میں بطور سب ایڈیٹر رکھ لیا۔ پڑھنے لکھنے سے رغبت رکھنے والے سلیم اختر کے لئے یہ کام بڑا مناسب تھا۔ انہوں نے دن رات محنت کی۔ راتوں کو انگریزی خبروں کا اردو میں ترجمہ کرتے اور دن کا وقت بچوں اور عورتوں کا صفحہ مرتب کرنے میں گزارتے اس کے علاوہ مراسلوں کو درست کرتے۔ نامہ نگاروں کی ارسال کردہ خبروں کی نوک پلک سنوارتے اور کبھی کبھی ایڈیٹوریل بھی لکھتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت میں جو اضطراب تھا اس کی وجہ سے جلد ہی اس کام سے اکتا گئے۔ ان کے والد

اورنگ زیب قاسمی

کا تبادلہ سیالکوٹ سے لاہور ہو گیا۔ سلیم اختر صاحب بھی لاہور واپس آ گئے۔ یہ ۱۹۵۸ء کا زمانہ تھا۔ لاہور آ کر انہوں نے لائبریری سائنس کا ڈپلومہ حاصل کرنے کے لئے داخلہ لیا اور ایک سال بعد وہ لائبریری سائنس میں ڈپلومہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اس کے متعلق انہوں نے خود ہی ذرا مزاحیہ انداز میں مجھے لکھا کہ:

"میں نے لائبریری سائنس (پنجاب یونیورسٹی) میں داخلہ لیا جہاں سے ایک سال بعد ڈپلومہ ان لائبریری سائنس کا امتحان پاس کیا۔ میں ساری یونیورسٹی میں تھرڈ آیا (کیوں کہ ہم تین طالب علم ہی پاس ہوئے تھے)"

لائبریری سائنس کا ڈپلومہ لینے کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بطور اسسٹنٹ لائبریرین ملازمت کر لی یہاں ان کا کام کتابیں ایشو کرنا اور پھر وصول کرنا تھا۔ اس کام کے دوران اکثر لوگوں سے ان کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ جلد ہی وہ یہاں سے بھی اکتا گئے اس کے بعد پنجاب پبلک لائبریری میں ملازم ہو گئے۔ یہاں وہ دو برسوں تک رہے۔ اسی دوران انہوں نے ۱۹۶۱ء میں پرائیوٹ طور پر ایم۔ اے کا امتحان دیا اور سکنڈ ڈویژن میں ایم۔ اے میں کامیاب ہوئے بغیر کسی کی رہنمائی اور مشورہ کے انہوں نے ملازمت کے دوران یہ کام انجام دیا تھا۔ اس سے سلیم اختر صاحب کے ارادے کی پختگی، استقلال اور ثبات قدم کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی سال کے آخر میں "ایمرسن کالج ملتان" میں اردو کے لیکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ فروری ۱۹۶۲ء سے جنوری ۱۹۷۰ء تک ملتان میں رہے۔ پھر ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج وحدت روڈ لاہور میں ہو گیا۔ یہاں سے وہ جون ۱۹۷۰ء میں پاکستان کے سب سے بڑے اور مشہور کالج یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں تبدیل ہو کر آ گئے۔ اسی سال انہیں اسسٹنٹ پروفیسر کا عہدہ ملا اور اسی حیثیت میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

دوسرے پروفیسروں کی طرح سلیم اختر صاحب نے کسی دوسرے سبجکٹ میں ایم۔ اے نہیں کیا یہاں تک کہ اپنے پسندیدہ مضمون "نفسیات" میں بھی انہوں نے ایم۔ اے کرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا حالانکہ اس مضمون میں ان کا مطالعہ کافی وسیع ہے اور وہ چاہتے تو نہایت آسانی سے اس میں ایم۔ اے کر سکتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بہت سے حضرات انہیں اردو کے بجائے نفسیات کا پروفیسر سمجھتے ہیں اور اسی حیثیت سے ان کو یونیورسٹی میں تلاش کرنے چلے آتے ہیں۔ سلیم اختر صاحب کو نفسیات سے شروع سے ہی کافی دلچسپی رہی ہے۔ اسی لئے جب پی ایچ ڈی کے لئے انہوں نے موضوع کا انتخاب کیا تو وہ موضوع تھا۔ "اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان"، پاکستان میں کسی زندہ شخصیت پر پی ایچ ڈی کے لئے موضوع نہیں دیا جاتا اور نہ ہی جدید رجحانات پر عام طور سے کام کرنے اجازت ملتی ہے۔ اس

اعتبار سے سلیم اختر صاحب خوش قسمت نکلے کہ انہیں ان کا پسندیدہ موضوع مل گیا۔ ۱۹۶۷ء میں ان کا موضوع منظور ہوا اور دو سالوں کی انتھک محنت کے بعد ان کا مقالہ تیار ہو گیا۔ ۱۹۶۹ء میں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ ان کی تھیس کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔

یکم اپریل ۱۹۶۲ء میں سلیم اختر صاحب کی شادی سعیدہ صاحبہ سے ہوئی۔ سعیدہ اختر خود بھی لاہور کے ایک گرلس کالج میں اردو کی معلمہ ہیں، اچھے ذوق کی مالک ــــ ایک اچھی استاد ہیں۔ صہبا لکھنوی کے قول کے مطابق " ان کے (سلیم اختر کے) تخلیقی سفر میں ان کی بیگم کا بہت کچھ حصہ ہے کہ انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں سے گھر کے ماحول کو بے حد خوشگوار بنا رکھا ہے "۔ [۱]

سلیم اختر صاحب کے گلشن حیات میں تین پھول کھلے ہیں۔ یہ پھول ہیں سائکہ، ارم اور جرات۔ تینوں بچے ملتان میں ہی پیدا ہوئے۔ سائکہ ۱۹۶۲ء کے دسمبر مہینے میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے بھی باپ والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔ ارم جس کی پیدائش اپریل ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔ بی۔ اے پاس کر چکی ہیں اور جرات سلیم فروری ۱۹۷۰ء میں پیدا ہوئے انہوں نے ایف ایس سی (پری میڈیکل) امتحان پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا اس طرح ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کا یہ چھوٹا سا خاندان نہایت سوجھ بوجھ کے ساتھ ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن ہے۔

سلیم اختر صاحب کے دادا عبدالحکیم قریشی اور والد قاضی عبدالحمید دونوں ہی ملٹری اکاؤنٹس جنرل سے وابستہ رہے۔ دونوں کا پیشہ قطعی غیر شاعرانہ نوعیت کا تھا۔ اس کے باوجود انہیں مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ اچھے ادیبوں اور شاعروں سے ان کی دوستی بھی تھی۔ اختر شیرانی اور عبدالحمید عدم سلیم اختر صاحب کے والد کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ عبدالحمید عدم ملٹری اکاؤنٹس میں ان کے والد کے رفیق کار بھی تھے اور پونا میں دونوں ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ سلیم اختر صاحب نے اپنے خاکے "حضور عدم آیا ہے" میں اس دور کے متعلق کچھ تفصیلات لکھی ہیں۔

" اباجی اور عدم دونوں ہم نام بھی تھے۔ ہم کار بھی اور ہم مشرب بھی .... اباجی کی مانند عدم بھی ملٹری اکاؤنٹس میں تھے اور سال بھر کے لئے مڈل ایسٹ بھیجے گئے تھے۔ وہاں ایران و عراق میں ان کا قیام رہا تھا اور دراصل وہیں اباجی اور عدم کی دوستی کا آغاز ہوا تھا "۔

ہر نئے لکھنے والے کی طرح سلیم اختر صاحب نے بھی سب سے پہلے شاعری ہی سے ابتدا کی۔ عدم صاحب

---

[۱] شخص و عکس از صہبا لکھنوی۔ افکار جون ۱۹۸۵ء

اورنگ زیب قاسمی

ان کی لکھی ہوئی نظموں کی اصلاح کرتے تھے۔ ان کی پیشن گوئی تھی کہ آگے چل کر یہ لڑکا بہت کچھ بنے گا۔ سلیم اختر صاحب کے والد اگرچہ خود ادیب نہ تھے لیکن ادیبوں سے دوستی اور جان پہچان خوب تھی۔ بیٹے کے شوق کو دیکھ کر وہ ہر ادبی محفل میں اسے بھی ساتھ لے جاتے۔ ایسی ہی کسی محفل میں سلیم اختر کی ملاقات ابن انشاء سے ہوئی۔ بعد میں جنہوں نے اسکول میں ایک تقریری مقابلے کے لئے سلیم اختر کو ایک تقریر لکھ کر دی تھی۔

مطالعے کے شوق کو دیکھتے ہوئے ان کے والد نے انہیں کتابیں پڑھنے سے کبھی منع نہیں کیا بلکہ بچوں کے کئی رسالے انہوں نے بیٹے کے لئے جاری کرا دیئے۔ کتابوں کے لالچ میں سلیم اختر صاحب عدم کے یہاں خوب جاتے تھے اور وہاں سے رسائل لا کر پڑھا کرتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں جب سلیم اختر مسلم ہائی اسکول انبالہ میں چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے تو ان کی کہانی "ایک مصور" بچوں کے ایک رسالہ "تعلیم و تربیت" میں شائع ہوئی۔ یہ سلیم اختر کی زندگی کا ایک خوشگوار اور دلچسپ تجربہ تھا۔ اس کا بیان انہوں نے اپنے ایک مضمون "میں ادیب کیسے بنا؟" میں بڑے دلچسپ پیرائے میں ذکر کیا ہے :

" مجھے بچپن ہی سے مطالعے کا بہت شوق تھا۔ میرے والد محترم خود مطالعے کے شوقین تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے رسالے یا کتابیں پڑھنے سے کبھی منع نہیں کیا۔ منع کیا کرنا وہ تو مجھے کتابیں خریدنے کے لئے پیسے دیتے تھے۔ یہی نہیں، انہوں نے بچوں کے کئی اچھے پرچے میرے نام جاری کرا رکھے تھے۔ میں چوتھی جماعت میں تھا۔ جب "تعلیم و تربیت" کا خریدار بنا یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔ اس زمانے کا "تعلیم و تربیت" آج کے "تعلیم و تربیت" سے خاصا مختلف تھا۔ ایک تو اس کا سائز بڑا ہوتا تھا اور دوسرے اس کا سرورق الگ ہوتا تھا، جس کے اندر کی طرف بڑی خوبصورت تصویریں ہوتی تھیں اور اس ٹائٹل کو چارٹ کے طور پر کمرے میں لٹکایا جا سکتا تھا۔ میں نے بھی کئی ایسے ٹائٹل گتے پر چسپاں کر کے اپنے کمرے میں لٹکا رکھے تھے۔ اس دور کے "تعلیم و تربیت" میں "ننھے مصور" کے نام سے بچوں میں تصویری مقابلہ ہوا کرتا تھا اور جس کی تصویر سب سے اچھی ہوتی اسے ایک روپے کا انعام ملتا تھا۔ میری بھی اس میں دو تین تصویریں شائع ہوئیں، اور ایک تصویر پر مجھے انعام بھی ملا۔ جس سے میں نے اسی قیمت کی دو کتابیں فیروز سنز سے خریدیں۔ ان میں سے ایک "بھیڑوں کی برکت" تو مجھے اب تک یاد ہے۔

میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ میرے دل میں لکھنے کا شوق کیوں پیدا ہوا۔ لیکن یہ حقیقت

بے کہ بچوں کے رسالے اور کہانیوں کی کتابیں پڑھتے پڑھتے میرا بھی جی مچل اٹھتا ان دنوں سعید لخت صاحب تعلیم و تربیت کے ایڈیٹر تھے۔ اور چچا بن کے بچوں کے خطوط کا جواب دیتے تھے ایک دن موج میں آکر میں نے بھی انہیں ایک خط لکھ دیا۔ اب مجھے یہ تو یاد نہیں کہ اس انٹ شنٹ خط میں میں نے کیا کچھ لکھا، لیکن ایک حماقت ہوگئی یعنی میں نے کچھ اس طرح کا فقرہ لکھا کہ "میرا دل طاقت ور نہیں"، اور "طاقت" کو میں نے "ط" کی بجائے "ت" سے لکھ دیا۔ اس پر چچا جان نے میرا خوب ریکارڈ لگایا تو یہ تھی میری ابتدائی کوشش۔ اس کے بعد جب میں چھٹی جماعت میں تھا تو میں نے ایک کہانی لکھی "ایماندار منصور" یہ کہانی میں نے ڈرتے ڈرتے "تعلیم و تربیت" کو بھیج دی۔

میں ان دنوں انبالہ میں رہتا تھا اور وہاں مسلم ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ کہانی کیا بھیجی، میرے تو دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑ گئی۔ ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے کہانی چھپنے کی دعا مانگا کرتا۔ انبالہ شہر میں سائیں توکل شاہ اور سائیں لکھی شاہ دو بزرگوں کے مزار تھے میں نے ان دونوں کے نام منت مانی کہ اگر کہانی چھپ گئی تو پانچ آنے کی نیاز دوں گا...... خیر صاحب میری دن رات کی دعائیں قبول ہوئیں اور میری یہ کہانی چھپ گئی۔" [۱]

میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کی کئی کہانیاں چھپ چکی تھیں۔ یہاں تک کہ بچوں کے لئے ان کی دو کتابیں "جادوگر کا انتقام" اور "فلم کی کہانی" بھی شائع ہوگئیں۔ ان کا پہلا افسانہ "قربانی اور ساحرہ" لاہور کے ایک فلمی رسالے میں شائع ہوا انہوں نے کئی ایسے مضامین بھی لکھے جو سائنس اور معلومات عامہ کے موضوعات پر تھے۔ اسی دوران میں انہوں نے علامہ اقبال اور میر تقی میر پر بھی مضامین لکھے۔ یہاں پر ان مضامین سے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

"علامہ اقبال جو ترجمان حقیقت اور حکیم الامت کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں انہوں نے مسلمانوں کو ذلت اور پستی سے نکال کر بام عروج تک پہنچانے کے لئے جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں وہ انہیں ابدالآباد تک زندہ رکھیں گی۔

لیکن یہی نہیں کہ اقبال نے مُردوں کے مردہ دلوں میں زندگی کا خون دوڑا دیا بلکہ اقبال

---

[۱] میں ادیب کیسے بنا از ڈاکٹر سلیم اختر۔ ماہنامہ تعلیم و تربیت اپریل ۱۹۸۵ء لاہور

اورنگ زیب قاسمی

بچوں کے بھی محبوب شاعر ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے جو نظمیں لکھی ہیں وہ نہایت آسان ہیں اور انہیں کہانیوں کی صورت میں پیش کیا ہے تاکہ بچے غیر شعوری طور پر بہترین اخلاقی باتیں جان لیں"۔ [۱]

میر تقی میر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ، نرم اور باریک آواز، آہستہ رفتار، کم گو، یہ ہے اس باکمال اور نازک مزاج شاعر کا مختصر سا حلیہ۔ جس کی غزلوں کو لوگ دوسرے شہروں میں سوغات کے طور پر لے جایا کرتے تھے۔ باپ کا نام میر عبداللہ تھا۔ اور اس کا اپنا نام میر تقی اور تخلص میر تھا" [۲]

میر کی شاعری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میر کی زبان صاف اور خیالات اونچے اور روانی ایسی جیسے بہتا ہوا دریا۔ ان کی تاثیر نے اسکو اردو کا سعدی بنا دیا ہے۔ کئی لوگوں نے اس کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ چنانچہ خاقانی ہند ذوق کہتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

انہیں کیا معلوم کہ میر صاحب کی تمام عمر غریبی، مصیبت اور رنج و اندوہ میں گذری جس کی وجہ سے ان کا دل یاس انگیز اور طبیعت درد خیز ہے۔ اور یہی چیزیں غزل کی جان ہیں۔" [۳]

ان تینوں اقتباسات سے سلیم اختر کا تنقیدی شعور صاف جھلکتا نظر آرہا ہے۔

یہ مضامین دراصل ان کی ذہنی تربیت کر رہے تھے اور آگے چل کر انہیں ایک ممتاز نقاد بنانے والے تھے گو یہ تحریریں بچگانہ تھیں آج ان میں کسی طرح کے تنقیدی شعور کی تلاش بے سود ہوگی لیکن یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ مضامین آٹھویں یا نویں جماعت کے ایک طالب علم نے لکھے تھے۔

سلیم اختر نے کالج میں فلسفہ، نفسیات اور تنقید کا بطور خاص مطالعہ کیا تھا۔ اور انٹرمیڈیٹ تک وہ اتنا کچھ پڑھ چکے تھے کہ بہت سے لوگ ایم اے تک بھی نہیں پڑھ پاتے۔ ان کے وسیع مطالعے کی بنا پر ان کے استاد ان سے گفتگو کرتے وقت استاد نہ رہتے بلکہ انہیں برابری کا درجہ دیتے۔ اسی زمانے میں تنقیدی موضوعات پر ان کے چند مضامین راولپنڈی کے اخبار "تعمیر" میں شائع ہوئے ۱۹۵۵ء میں

---

[۱] اقبال بچوں کے شاعر کی حیثیت سے از ڈاکٹر سلیم اختر مشمولہ تعلیم و تربیت اپریل ۱۹۸۵ء لاہور

[۲، ۳] نازک مزاج شاعر میر از ڈاکٹر سلیم اختر سہ ماہی بہار نومبر ۱۹۵۲ء

ان کا ایک مقالہ "غزل میں تصورِ محبوب" نیرنگِ خیال راولپنڈی میں چھپا۔ یہ مضمون وہ پہلے بھی کالج کی ایک تقریب میں پڑھ چکے تھے اور اس کا کافی چرچا ہوا تھا۔ اسی زمانے میں ان کے تین مقالے "ابن الوقت"، "اکبر کی شاعری"، اور "اکبر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی" ہمایوں، لاہور میں شائع ہوئے۔ یہ سارے مضامین ان کے مجموعۂ مضامین "نگاہ اور نقطے" میں شامل ہیں۔

اے۔ بی۔ اشرف نے اس کتاب کے متعلق اپنے ایک تجزیے میں کہا ہے:

"تنقید میں تجزیے کی اہمیت اتنی مسلم ہے کہ اب کسی کو انکار نہیں ہو سکتا یہ الگ بات ہے کہ تجزیہ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ کیونکہ تجزیے میں انفرادی نقطۂ نگاہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نقاد کا تجزیہ مختلف صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ بعض نقاد عمرانی معاملات کو پیشِ نظر رکھ کر ادبی تخلیق میں اجتماعی حقائق کا سراغ لگاتے ہیں۔ بعض دوسرے کسی تخلیق میں حسن کی تلاش پر اکتفا کرتے ہوئے اس کی نوعیت کو محض جمالیات تک محدود کر دیتے ہیں۔ نفسیاتی دبستان کے نقاد ادیب کے جذباتی نظام کے مختلف پہلوؤں کو علمِ نفسیات کی روشنی میں جانچ اور پرکھ کر نتائج نکالتے ہیں۔ چنانچہ سلیم اختر نے اس آخری طریق کار پر اپنے تجزیے کی بنیاد رکھی ہے۔ "نگاہ اور نقطے" کے بیشتر مضامین میں اسی طریق کار کو اپنایا گیا ہے۔" [1]

بی۔ اے کے بعد سلیم اختر کی زندگی کا سلسلہ کچھ ایسا رہا کہ وہ بطورِ خاص تنقید نہیں لکھ سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سرتا سر نفسیات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ نفسیات سے ہی متعلق تھا۔ بالخصوص ۱۹۵۱ء میں جب حنیف رامے نے اپنا ہفت روزہ "نصرت" جاری کیا تو اس میں سلیم اختر نے تواتر سے جنس کے نفسیاتی پہلوؤں پر مضامین لکھے یہ مضامین بے حد متنازعہ فیہ ثابت ہوئے۔ اور اگر اس دور کے "نصرت" کے پرچے دیکھے جائیں تو ان میں مردوں اور عورتوں کی موافقت اور مخالفت میں بڑے تیز و تند مگر دلچسپ خطوط ملیں گے۔ یہ مضامین "عورت جنس اور جذبات" اور "ہماری جنسی زندگی" میں شامل ہیں۔ "عورت جنس اور جذبات" بے حد مقبول کتاب ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

۱۹۶۲ء میں جب سلیم اختر بحیثیت لکچرار ملتان گئے تو صحیح معنوں میں ان کی تنقید نگاری کا آغاز ہوا۔ وہ نفسیات کا اتنا گہرا اور وسیع مطالعہ کر چکے تھے کہ جب انہوں نے تنقید لکھنی شروع کی تو کسی شعوری کاوش کے بغیر ہی خود بخود ان کا ایک نفسیاتی انداز نظر بن گیا۔ ایسا اس لئے بھی ہوا کہ نفسیات کے ذریعے تخلیق کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کی شخصیت کا مطالعہ بھی ممکن ہے اور سلیم اختر کو تخلیق کے مقابلے میں تخلیق کار نے ہمیشہ سو گیا ہے۔

ملتان میں ان دنوں اچھا خاصا ادبی ماحول بن گیا تھا۔ اگرچہ طبعاً وہ مجلسی آدمی نہیں تھے اور بھیڑ بھاڑ سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی وہ وہاں کی ادبی اور تنقیدی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ اور اپنے افسانے اور تنقیدی مقالات پڑھ کر سناتے تھے۔ ابتدا میں ان کے افسانے جنسی رنگ لئے ہوئے تھے۔ جس سے ملتان کے ذہنی پسماندہ ماحول میں ان کے افسانوں نے ایک ہلچل مچا دی۔ اسی طرح تنقید کا نفسیاتی انداز بھی لوگوں کے لئے خاصا چونکا دینے والا ثابت ہوا۔ ان کے مقالات اور افسانے ملک کے مقتدر ادبی رسالوں مثلاً "فنون"، "سیپ"، "ادبی دنیا"، "نگار"، "نئی قدریں"، "اوراق"، میں شائع ہونے شروع ہو چکے تھے۔ ان کے بعض مقالات جیسے "غالب کی نرگسیت" یا "باغ و بہار کے درویش عاشق" کا بہت نوٹس لیا گیا۔ اس دور کی تنقیدی کاوشیں تنقیدی مقالات کے پہلے مجموعے "نگاہ اور نقطے" میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"نگاہ اور نقطے" بارہ مقالات پر مشتمل ہے۔ ایک دو کو چھوڑ کر سارے مقالات عملی تنقید کے دائرے میں آتے ہیں اور آپ جانتے ہیں عملی تنقید، معتبر بننے کے لئے نقاد سے خوش فکری و خوش ذوقی سے کہیں زیادہ تاریخ، ادب، عمرانیات اور نفسیات کے گہرے مطالعے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہر چند کہ سلیم اختر نے ان علوم کے ماہرین کے حوالوں سے اپنے مقالات کو گراں بار اور اپنے قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی، پھر بھی ان کی تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعہ اس باب میں نہایت وسیع ہے اور اسی وسعت مطالعہ نے ان کی طرزِ فکر اور طرزِ بیان کو انفرادی لب و لہجہ سے آشنا کیا ہے۔ یہ لب و لہجہ، نمودِ علم، بے جا تعریض و تنقیص، خود نمائی، و خود ستائی اور احساس کمتری یا برتری کی اس جھلاہٹ سے پاک ہے جو آج کی تنقیدی تحریروں کی خصوصیت بن گئی ہے۔ سلیم اختر کا تنقیدی لب و لہجہ دراصل خود اعتمادی، خود پوشی اور دلی دیانت، کشادہ فطری، بے باکی، خوش فکری، خوش ذوقی، طبیعت کی نرمی، اور تخلیقی شگفتگی سے عبارت ہے۔ اس لئے ان کا لب و لہجہ پھول کی پتی کی طرح نرم و نازک، شبنم کی طرح خنک و شفاف اور ندی کی طرح سبک خرام و نغمہ بار ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لب و لہجہ میں مردانہ پُر اثر انداز ہونے اور سینے کا جگر کاٹ دینے کی صلاحیت ہے۔" [2]

---

[1] نگاہ اور نقطے۔ ایک تجزیہ۔ اے۔ بی۔ اشرف۔ ادب اور سماجی عمل۔

[2] تبصرہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مشمولہ نگار جون جولائی ۱۹۶۶ء

اورنگ زیب قاسمی

اس کتاب میں صرف غالب پر ہی تین مضامین ہیں انہوں نے غالب کا مطالعہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "غالب کے کلام میں نرگسیت ایک قوی رجحان کی صورت ہی میں نہیں ملتی بلکہ یہ رجحان ایک مخصوص انداز سے اظہار بھی پاتا ہے۔"

سلیم اختر نے غالب کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جو رنگ بدل بدل کر ان کی نظم و نثر میں جلوے دکھاتی رہی ہے۔

"باغ و بہار کے درویش عاشق" اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اہم مضمون ہے۔ باغ و بہار کے درویش عاشقوں اور اردو غزل کے عاجز اور مظلوم عاشقوں کے درمیان جو گہری مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے اس کا چونکا دینے والا انکشاف ڈاکٹر سلیم اختر نے پہلی بار کیا ہے۔ دراصل جدت اور چونکا دینے والی خصوصیت سلیم اختر کے مزاج کا اہم حصہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مطالعہ کرتے وقت ان کی نظر ہمیشہ ایسی چیزوں کی طرف جاتی ہے جہاں کسی اور کی نگاہ نہیں پہنچی۔ غزل اور باغ و بہار کے عاشقوں کے متعلق سلیم اختر کا خیال ملاحظہ ہو:

"اگر باغ و بہار کے چاروں درویش عاشقوں کا اردو غزل اور بالخصوص میر کی غزل کے پس منظر میں مطالعہ کیا جائے تو ان سب کا کردار غزل کے روایتی عاشق سے ملتا جلتا نظر آئے گا جس میں ان درویشوں ہی کی مانند ایک خاص طرح کی عاجزی، بے کسی، محبوب کی کج ادائیوں پر بھی اس کے ذری صدقے جانا، زمانے کے ستم برداشت کرنا مگر حرف شکایت لب پر نہ لانا اور اگر شکایت کی بھی تو عاجزی اور حلیمی سے یوں زمانے سے نبرد آزما ہو کر ماحول پر چھا جانے والی صحت مند جارحیت سے غزل کا روایتی عاشق نا آشنا ہے۔"[1]

سلیم اختر نے متنوع موضوعات پر بہت سے مصنفین کا مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ انہوں نے کن ذہنوں سے خصوصی اثرات اخذ کئے تاہم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ نفسیات سے رغبت کی بنا پر پہلے فرائڈ اور بعد میں یونگ سے بطور خاص متاثر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ فرائڈ نے لاشعور کے تصور اور یونگ نے اجتماعی لاشعور کے نظریے سے انسانی ذہن، شخصیت اور تخلیق کار کو سمجھنے کے لئے جو زاویۂ نظر مہیا کیا اس نے بیسویں صدی کے ذہن پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے۔ سلیم اختر طالب علمی کے زمانے ہی سے فرائڈ سے بہت متاثر رہے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے زندگی اور ادب کا مطالعہ بڑھتا گیا اور فکر و نظر

---

[1] تبصرہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری بشمولہ نگار جون جولائی ۱۹۶۶ء

اورنگ زیب قاسمی

میں وسعت آتی گئی فرائڈ کے اثرات کی شدت میں کمی آنے لگی۔ فرائڈ اور یونگ کے علاوہ ارنسٹ جونز سے بھی وہ متاثر نظر آتے ہیں یہ اسی کا اثر ہے کہ وہ تخلیقات کے نفسیاتی مطالعے سے تخلیق کار کی نفسیاتی اساس تک جا پہنچتے ہیں۔ ارنسٹ جونز نے اس نقطۂ نظر سے ہیملیٹ کا مطالعہ کیا تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اسی نقطۂ نظر سے میر تقی میر کا مطالعہ کیا۔ میر تقی میر پر سلیم اختر کا یہ مقالہ بہ عنوان "شعر مرا برہان گیا" پہلے شاعری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا اور اب ان کے تنقیدی مقالات کے مجموعے "تخلیق اور لاشعوری محرکات" میں شامل ہے۔ انگریزی نقادوں میں انہیں ہربرٹ ریڈ، لائنل ٹریلنگ، آئی۔ اے۔ رچرڈس، ڈیوڈ ڈیشز، ماڈ باڈکن نے بھی متاثر کیا ہے۔ لیکن ان نقادوں کا مطالعہ صرف لطف اٹھانے کی حد تک کیا گیا۔ غالباً اس کی وجہ ان نقادوں کا نقطۂ نظر نفسیاتی ہونا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے خود ہی میرے نام ایک خط میں اعتراف کیا ہے۔

"........ لیکن اس حد تک کہ میں نے ان کی تنقید سے لطف اٹھایا۔ شاید اس کی یہ وجہ بھی ہو کہ ان کا مجموعی نقطۂ نظر بھی نفسیاتی رہی ہے۔ ..."

اردو ادیبوں میں سلیم اختر کو خاص طور سے ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے مصنفین سے لگاؤ رہا ہے۔ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت اور احمد ندیم قاسمی ان کے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ نقادوں میں وہ احتشام حسین، عزیز احمد اور آل احمد سرور کو پسند کرتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان نقادوں میں کوئی بھی نفسیاتی نقاد نہیں ہے۔ احتشام حسین نے جس طرح مارکسی نقطۂ نظر سے ادب اور زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی اس نے سلیم صاحب کو بطور خاص متاثر کیا ہے جبکہ عزیز احمد کے تجزیاتی انداز اور آل احمد سرور کے شگفتہ اسلوب کو وہ پسند کرتے ہیں۔ غیر ترقی پسند نقادوں میں کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد بھی انہیں پسند ہیں۔ یہ تینوں نقاد الگ الگ ذہن، فکر اور اسلوب کے حامل ہیں لیکن تینوں میں ایک مشترک خصوصیت ہے کہ انہوں نے بلا خوف اپنی رائے کا اظہار کیا دنیا کی مخالفت کی پروا نہ کی سلیم اختر کو ذاتی طور پر ان تینوں نقادوں کے تنقیدی نظریات سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جس بے باکی سے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جس ثابت قدمی سے مخالفین کے حملوں کو برداشت کیا ہے اس نے سلیم اختر کو بے حد متاثر کیا۔ ان نقادوں کو پسند کرنے کا سبب بھی یہی ہے۔ وہ خود بھی کسی نہ کسی وجہ سے مخالفین کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر میں جو استقامت ہے وہ شاید تینوں نقادوں کے اثر کا نتیجہ ہے۔

وہ ذاتی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ایک نقاد کو ہر طرح کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ لیکن اسے کسی خصوصی

اثرات قبول نہیں کرنے چاہئیں۔ کیونکہ تخلیق یا تخلیق کار کے آزاد مطالعے میں یہ امر مانع ثابت ہوتا ہے۔ اسی لئے انہیں وہ نقاد سخت ناپسند ہیں جن کی اپنی کوئی رائے نہیں اور جو ہمیشہ دوسرے نقادوں کے حوالوں اور ان کی آرا کی تلاش میں رہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مطالعہ سب کا کیا لیکن نفسیات کے بنیادی تصورات کو چھوڑ کر ہر معاملے میں آزادی سے اپنی رائے قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ رائے قابل قبول بھی ہو سکتی ہے اور نہیں بھی۔ زیادہ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ نقاد اپنی بات کھل کر کہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کو اگر کسی مکتبۂ فکر سے وابستہ سمجھا جا سکتا ہے تو وہ نفسیات کا مکتبۂ فکر ہے۔ نفسیاتی مطالعے کے سلسلے میں انہیں نفسیات کے اس شعبے سے خصوصی شغف ہے جسے تحلیل نفسی کا نام دیا جاتا ہے۔ جو خاص فرائڈ کا طریقۂ علاج تھا۔ سلیم اختر نے راقم الحروف کو ایک خط میں لکھا ہے:

"تحلیل نفسی بنیادی طور پر ذہنی مریضوں کے علاج کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ لیکن لاشعور کے حوالے سے ہم لکھنے والوں کے نیوراسس NEUROSIS ان کی ABNORMALITY اور ان کے کردار کے ٹیڑھے پن کو بھی سمجھ سکتے ہیں اگر صرف اسی نقطۂ نظر سے ہی ہم تخلیق کاروں کا جائزہ لیں تو میر سے لیکر میراجی تک ایسے کئی لکھنے والے مل سکتے ہیں جن کی شخصیت میں کسی نہ کسی طرح نفسیاتی کمی پائی جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر لکھنے والا ذہنی مریض ہوتا ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ادیب میں کسی طرح کی ABNORMALITY پائی جاتی ہے اور اس ABNORMALITY کا اس کی تخلیقات سے کچھ رشتہ بھی بنتا ہے تو نقاد کا فرض ہے کہ اس کا مطالعہ کرے اور اس مقصد کے لئے تحلیل نفسی سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ میں نے اپنی کتاب "شعور اور لاشعور کا شاعر غالب" میں غالب کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا اور اس کی تخلیقی شخصیت کی اساس بننے والی نفسیاتی وجوہات کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔"

اگرچہ ترقی پسند ادیب نفسیات کے خلاف ہیں کیونکہ ان کے بموجب نفسیات فرد کا علاج کرتی ہے سماج کا نہیں مگر سلیم اختر عمومی طور پر ادب اور زندگی میں ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں۔ اس لئے بھی کہ اس تحریک نے ادب کو رومانیت کی دلدل سے نکال کر عصری شعور کی تلخی سے آگاہ کیا اسی لئے جب وہ تنقید میں نفسیاتی تجزیہ نہیں کرتے تو غیر شعوری طور پر ان کا انداز ترقی پسندوں جیسا ہو جاتا ہے چنانچہ جب بھی انہوں نے ماحول یا روح عصر کی بات کی ہے تو وہ بالعموم عمرانی اور سماجی حوالے سے۔ اگرچہ ادب اور زندگی کے بارے میں بعض اوقات مارکسی نقاد جس غلو کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ انہیں پسند نہیں۔ لیکن جہاں تک

اورنگ زیب قاسمی

ان کی تحریروں میں سماجی شعور کا تعلق ہے تو اس سے انکار ممکن نہیں اور بحیثیت نقاد یا افسانہ نگار انہوں نے اپنی تحریروں میں اسے ملحوظ بھی رکھا ہے۔

جہاں تک کسی مکتبۂ فکر سے وابستگی کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلیم اختر جدا NONCONFORMIST ہیں اگرچہ اپنے مخصوص حالات، معاشرتی حیثیت، اقتصادی مسائل اور سرکاری ملازم ہونے کی بنا پر ان کی زندگی سمجھوتوں کی ایک داستان ہے لیکن اس کے باوجود جب کبھی موقع ملا وہ علامات یا اشارات کی صورت میں بالخصوص اپنے افسانوں میں اپنی بات کر جاتے ہیں اسی طرح وہ اپنی تنقید میں بھی بطور خاص اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ نصیب جہالت، ناداری اور مسلمات یا کلیشے کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ جسے انگریزی میں CANSAGE OF CONVICTION کہتے ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ یہ خصوصیت ان میں بھی ہے اسی لئے تنقید میں رائے کے اظہار میں بلا جھجک اور دو ٹوک انداز اختیار کرتے ہیں "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کے سلسلے میں جو مخالفت کی جاتی رہی ہے اس کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے کہ انہوں نے کسی طرح کی رعایت برتے بغیر معاصر ادیبوں کے بارے میں رائے کا اظہار کر کے جانتے بوجھتے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔ "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ایک ایسا مضمون ہے جس کی مذہبی حلقوں اور اقبال کے مجاوروں نے بہت زبردست مخالفت کی۔ اس لئے کہ علامہ اقبال کو اس مضمون میں پہلی دفعہ حکیم الامت کے برعکس ایک مرد کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی جماعت یا گروہ کے خلاف نہیں تھے نہ ہی دوسرے نظریات کے خلاف ہیں۔ لیکن جہالت اور یبوست کے خلاف یقیناً ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر ان نقادوں میں سے ہیں جو نئے خیالات یا تصورات سے الرجک نہیں ہوتے اسی لئے وہ نثری نظم کے تجربے کے حق میں ہیں۔ بھارت میں اور بالخصوص تامل ناڈو میں جو حضرات آزاد غزلیں لکھ رہے ہیں وہ ان سے بھی رابطہ رکھتے ہیں چنانچہ اسی موضوع پر علیم صبا نویدی کی مرتبہ کتاب میں ان کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔

سلیم اختر اب تک تیس کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں۔ جہاں تک تنقیدی کتابوں کا تعلق ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ
۲) نگاہ اور نقطے
۳) افسانہ حقیقت سے علامت تک
۴) ادب اور لاشعور
۵) تنقیدی دبستان

6. اقبال کا نفسیاتی مطالعہ
7. اقبال اور ہمارے فکری رویے
8. تخلیق اور لاشعوری محرکات
9. ادب اور کلچر
10. شعور اور لاشعور کا شاعر غالب

یہ سب کتابیں طبع زاد ہیں۔ جہاں تک ان کتابوں کے مجموعی مطالعے کا تعلق ہے تو پہلی بات تو یہ کہ ان میں بنیادی سوچ نفسیاتی ہے اگرچہ ایسے مقالات بھی ہیں (بالخصوص ادب اور کلچر میں) کہ جن میں انداز نفسیاتی نہیں لیکن بقیہ کتابوں کے بیشتر مقالات نفسیات کی روشنی میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ انہوں نے نفسیات کے حوالے سے تخلیقات اور تخلیق کاروں کو ایک نئے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

سلیم اختر نے راقم الحروف کے اس سوال کا کہ انہیں اپنی کونسی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے؟ اس طرح جواب دیا ہے کہ:

"جہاں تک میری پسندیدہ کتاب کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں اگرچہ بات وہی پرانی ہے کہ باپ کی نظر میں تمام بچے یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک آدھ بچہ لاڈلا بھی ہوتا ہے۔ تو اسی انداز پر اگر آپ میری لاڈلی کتاب کے بارے میں پوچھیں تو میں "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کا نام لوں گا۔"

سلیم اختر کی یہ کتاب پاکستان کی حد تک تو BEST-SELLER قرار دی جا چکی ہے اس وقت اس کا مارکیٹ میں چودھواں ایڈیشن فروخت ہو رہا ہے۔ وہ ہر ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے تاریخ اشاعت تک یہ کتاب UP TO DATE رہتی ہے ہر سال سوا سال کے بعد اس کتاب کا ایک نیا ایڈیشن چھپ جاتا ہے۔ جیسا کہ سلیم اختر نے مجھے خود بتایا ہے۔ اب پھر سے وہ اسے مکمل طور پر دوبارہ لکھنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ کئی سال ہوئے کہ حکومت پاکستان نے اس کتاب کو سول سروس کے اعلیٰ ترین امتحان C.S.S کے نصاب میں بھی شامل کر دیا ہے جو کہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

سلیم اختر کو اپنی کتاب "ادب اور لاشعور" بھی بہت پسند ہے اس کی وجہ وہ بتاتے ہیں کہ "ادب، اس کے جملہ مسائل اور بعض ادبی اصناف کا جس طرح سے میں نے نفسیاتی مطالعہ کیا ہے وہ اب تک کسی سے نہ ہو سکا۔ اگرچہ بعض نقادوں نے کچھ موضوعات کا نفسیاتی محاکمہ کیا ہے لیکن ادب اور لاشعور میں جس محنت مطالعہ اور لگن سے انہوں نے کام کیا ہے اس طرح بالعموم نہیں کیا جاتا۔ یہ کتاب خاصی مشکل ہے اور

اورنگ زیب قاسمی

عام ذہن کے قاری کے لئے نہیں ہے۔ اس کتاب سے صحیح معنوں میں وہی قاری فائدہ اٹھا سکتا ہے جسے ادب اور نفسیات کے مباحث سے کم از کم بنیادی واقفیت تو ضرور ہو۔

انہیں شعور اور لاشعور کا شاعر غالب، بھی بہت پسند ہے۔ اس پسندیدگی کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں:

"اگرچہ مجھ سے پہلے بھی غالب کا نفسیاتی مطالعہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بھی غالب کے نفسیاتی مطالعے میں کچھ CONTRIBUTION کیا ہے میں نے کوشش کی ہے کہ ان نفسیاتی محرکات نے غالب کی شخصیت کی تشکیل کی اور تخلیقی شخصیت کو فعال بنایا ان کا کھوج لگایا جائے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ غالب کی نرگسیت، جیسا مقالہ شاید ہی کسی نے لکھا ہو اسی طرح "مرد عاشق کی مثال غالب" یا "غالب آتش زیر پا" جیسے مقالات میں میں نے غالب کی شخصیت کے جس نفسیاتی پہلو سے نقاب اٹھایا ہے غالباً اور کسی نے ایسا نہیں کیا شاید اسی لئے اس کتاب کا بہت زیادہ نوٹس لیا گیا ہے۔"

"شعور اور لاشعور کا شاعر غالب" پر ٹی وی اور ریڈیو سے تبصرے نشر کئے گئے اور اخبارات و جرائد نے بھرپور انداز سے اس کی تعریف کی اور سب مبصرین نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ مطالعہ غالب میں یہ کتاب مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے خود کو ہمیشہ ایک سیدھا سادہ نقاد سمجھا ہے نہ وہ خود کو محقق سمجھتے ہیں اور نہ ہی کبھی ادبی مؤرخ ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو نہ صرف ان کے محقق ہونے کی دلیل ہے بلکہ ادبی مؤرخ بھی۔ یہ کتاب ہے "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"۔ اس کتاب کے بارے میں مختلف مبصرین کی آراء درج ذیل ہیں:

"پچھلے دس بارہ سال کے اندر ہی جن لوگوں کے نام تیزی سے آگے آئے ہیں اور اردو تحقیق و تنقید میں جن قلم کاروں کا اعتبار روز بروز بڑھتا نظر آ رہا ہے ان میں میرے مطالعے کی حد تک سلیم اختر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ چاہیں تو اپنے ذوق و مطالعہ کی مطابقت سے ان میں بعض ناموں کا اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ ان سب تحریروں میں علم و فکر مطالعہ و محنت اور سنجیدگی و توازن کے قابل رشک آثار نظر آتے ہیں اور میں انہیں آثار کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اردو تحقیق و تنقید کا مستقبل خاصا روشن ہے۔"

ان کی زیر بحث کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کا پہلا ایڈیشن چھوٹے سائز پر منظر عام پر آیا تھا۔ اب اس کتاب کا آٹھواں خوبصورت ایڈیشن بڑے سائز پر بہت کار آمد اضافوں کے

ساتھ میرے سامنے ہے اسے دیکھ کر جہاں مجھے سلیم اختر کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں اور ان کے کام کی رفتار و مقدار پر رشک آتا ہے وہاں یہ خوشی بھی محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے آج سے کم و بیش پندرہ سال پہلے جو کچھ کہا تھا اور جسے اس وقت بعض دوستوں نے غالب کی طرفداری خیال کیا تھا وہ لفظ بہ لفظ درست ثابت ہو رہا ہے۔ ہر چند کہ تازہ ایڈیشن اپنے اندر وہ سب کچھ رکھتا ہے جو ایک مختصر ترین ادبی تاریخ سے توقع کی جا سکتی ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر سلیم اختر اور ان کی تصانیف کو خوب سے خوب تر دیکھنے کے شوق میں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کاش اس کا آئندہ ایڈیشن اس سے بھی بہتر اور واقعات و سنین کی ان فروگذاشتوں سے پاک ہو جو اس میں کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔[۱]

"ڈاکٹر صاحب کا سب سے بڑا معرکہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" ہے جس کا وزن ہر نئے ایڈیشن کے ساتھ بڑھ جاتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ چند مزید ایڈیشنوں کے بعد یہ تاریخ ادب اردو ...... مختصر ترین نہیں رہے گی اور پھر اس کا نام بدل کر "ادب کی طویل مختصر ترین تاریخ" رکھنا پڑے گا اگر طویل مختصر افسانہ ہو سکتا ہے تو طویل مختصر ترین تاریخ کیوں نہیں ہو سکتی۔"[۲]

"پروفیسر سلیم اختر کی "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کو مصنف کا ایک نہایت اہم اور نمایاں کارنامہ سمجھا جا سکتا ہے اور حقیقتاً یہ ہے بھی۔ ویسے تو بقول پروفیسر صاحب کے یہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ہے۔ لیکن جب اس کی جامعیت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس کی مختصر ترین کی کیفیت سے قطعاً کوئی نقص معلوم نہیں ہوتا۔

اپنی اس جامع تصنیف میں مصنف نے اردو کے آغاز سے لیکر موجودہ دور تک کا بھرپور ادبی جائزہ لیا ہے اور حتی الامکان کوشش یہ کی ہے کہ اس سلسلے میں کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے وہ اپنی ذمہ داری سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں اور ان کی سالہا سال کی ذہنی کاوش سے ہمیں اپنی زبان اور اپنے ادب کی ایک ایسی تاریخ مل گئی ہے جو وسعت معلومات انتقادی بصیرت، ژرف نگاہی اور دیدہ وری کے اعتبار سے طلباء اور عام قارئین کے لئے یکساں طور پر بڑی مفید ثابت ہوگی ......

" اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ " کی ایک اور خصوصیت بھی بڑی واضح ہے اور یہ خصوصیت

---

[۱] تبصرہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر فرمان فتحپوری طلوع افکار کراچی ۱۹۸۲ء

[۲] " " " " " " " " از سلمان بٹ روزنامہ مشرق میگزین لاہور ۱۰ مارچ ۱۹۸۲ء

اورنگ زیب قاسمی

یہ ہے کہ گو اس کا ہر باب ادب کی کسی نہ کسی ایک شاخ سے بحث کرتا ہے اور اس لحاظ سے اس کی اپنی حیثیت جداگانہ نوعیت کی ہونی چاہئے مگر ایسا نہیں ہے مصنف نے ہر باب کو اس انداز سے مجموعی "تاریخ" کا حصہ بنا رہا ہے کہ یہ ایک کل کا جزو لاینفک معلوم ہوتا ہے۔ پوری کتاب میں ایک معنوی تسلسل اور روانی ہے قاری کو کہیں بھی کسی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مصنف نے روایات اور مسلمات کی مناسب حد تک پیروی کی ہے اور جہاں کہیں بھی انہیں پیش روؤں کی کوئی رائے محل نظر محسوس ہوئی ہے اس سے برملا اختلاف کرنے میں مطلقاً تامل سے کام نہیں لیا۔ مصنف نے جرأت افکار کا ثبوت جا بجا دیا ہے۔ اس کی ہر رائے دلائل پر مبنی ہے۔ کسی مسئلے کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے اس نے آنکھیں بند کر کے روایات پر بھروسہ نہیں کیا۔ اس پر خود غور و فکر کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا بیان شروع سے آخر تک مدلل منطقیانہ اور واضح ہے۔

"اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اور اسے پروفیسر سلیم اختر کا ایک قابل قدر اور شاندار کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔"[۱]

"یہ تاریخ کہنے کو مختصر ترین تاریخ ادب اردو ہے لیکن اس میں اہم لکھنے والوں کا جائزہ اس قدر تفصیل سے لیا گیا کہ ان کے ادب کی بنیادی خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔ یہ ایسی خصوصیت ہے جو سلیم اختر سے دگنی ضخامت میں تاریخ ادب لکھنے والے بیشتر لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکی۔ اس میں جا بجا خیال افروز باتیں موجود ہیں جو ہمیں مزید غور و فکر اور مطالعے کی طرف راغب کرتی ہیں۔ غرض مجموعی طور پر یہ تاریخ ادب اردو اس بات کی مستحق ہے کہ ادب کے سنجیدہ طلبہ اس کا مطالعہ کریں اور اس میں اٹھائے جانے والے مباحث پر اظہار رائے کریں۔"[۲]

سید قاسم محمود نے فضل بک سیٹ کے ترجمان ماہنامہ "کتاب" کے لئے مجھے اور اقساط میں اردو ادب کے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی دعوت دی تھی ــــــ اور اب یہ دریا "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کے کوزے میں بند ہو کر سامنے آیا ہے تو سید صاحب کی نظر انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے اس کام کے لئے ایک ایسے

---

[۱] اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ — ایک مطالعہ از مرزا ادیب مشمولہ ادب لطیف لاہور

[۲] تبصرہ: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از خواجہ محمد زکریا صحیفہ لاہور

نوجوان اور صاحب نظر ادیب کو جتنا جو قلیل ترین وقت میں اور مختصر ترین الفاظ میں ایسا بھرپور کام کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ چنانچہ کتاب کے مطالعہ سے پہلا تاثر ہی یہ مرتب ہوتا ہے کہ اس میں اختصار کا دامن بہت وسیع ہے اور چند الفاظ میں بہت کچھ کہہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اختصار کو ہمہ وقت ملحوظ رکھنے میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں انقباض کی کیفیت پیدا نہ ہو جائے اور بات کا ادھورا پن تشنگی کے احساس پر منتج نہ ہونے لگے۔ مگر سلیم اختر صاحب نے اختصار کو ملحوظ رکھنے کے باوصف نہ تو نزاعی مسائل کے بارے میں پیش کیے گئے مختلف نظریات میں سے کسی ایک کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا ہے اور نہ اردو ادب کی کسی روش کو نظر انداز کرنے کی غلطی کی ہے۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ نویسوں کے عام رویے کے برعکس اردو ادب کی تاریخ کو نوک قلم پر آئے ہوئے لمحے تک سمیٹ کر معاصر ادبا کے چھتے کو چھیڑنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ لہٰذا اگر اس کے نتیجے میں انہیں ایک مسلسل بھنبھناہٹ کا "سہانا نغمہ" سنائی دینے لگے تو یہ قطعاً غیر اغلب نہ ہوگا۔

بحیثیت مجموعی "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" ایک نہایت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ بالخصوص طلباء کے لئے اس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے ادب کے تمام ادوار کا بڑی خوبی سے احاطہ کیا ہے اور اس ضمن میں جدید ترین تحقیقات تک رسائی حاصل کی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ میں مولف کو ایسی عمدہ کاوش پر قابل مبارکباد سمجھتا ہوں" ۱؎

"یہ کتاب بڑا ہی دلکش منیچر MINIATURE ہے اردو ادب کے تمام اہم ناولوں اور شاہکار تصانیف کو ڈھائی سو صفحوں میں لانے سے ایک کتب خانے میں رکھنے والی فہرست کے سوا اور کیا چیز بن سکتی تھی مگر سلیم اختر صاحب میں تخلیقی قوتیں موجود ہیں اس لئے ان کی یہ کتاب فنی چیز ہوگئی ہے۔ اشاروں سے مصنفین کی ادبی فطرت تک پہنچ جانا ان کا مخصوص کام نظر آتا ہے۔ یہاں مختصر کا لفظ انتخاب کی طرف نہیں بلکہ تاثرات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ ایک آدھ بات میں تمام باتیں کس طرح شامل کرنے کا فن برتا جا سکتا ہے۔ اکثر سرخیاں بھی علمی سے زیادہ ادبی ہیں۔ جیسے اردو ہے جس کا نام، ایسی پستی ایسی بلندی،

۱؎ تبصرہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر وزیر آغا نقوش لاہور ۱۹۶۲ء

ناز و انداز کا اصلاح خانہ، ٹھہرے پانی میں پتھر، ادبی کھار، تازہ واردان نقد، وغیرہ بیانات میں افسانوں کا سا تسلسل ہے۔ جن مصنفین کا ذکر آتا ہے ان کو ایک دو اشاروں سے زندہ کر دیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف پر ایک آدھ جملہ ایسا کہہ دیا جاتا ہے جو پوری پوری کتابوں کا نچوڑ ہو جاتا ہے۔ مثلاً نذیر احمد کی بابت کہتے ہیں۔

"آج نذیر احمد اور ان کے ناولوں کی اہمیت محض تاریخی ہے۔ اس عہد میں اصلاحی معاشرتی اصلاح کی جو تحریک جاری تھی انہوں نے بھی اس سے اثر قبول کیا اور پھر اپنے محدود فنی شعور کے مطابق قوم کو سدھارنے کی کوشش بھی کی لیکن ان سے پہلے کیونکہ اردو میں ناول تھا ہی نہیں اس پر مستزاد مقصد پسندی میں ان کا جائزہ مدعیہ نتیجہ فنی حس سے عاری خام اور بے اثر قصوں کی صورت میں نکلا جن میں بے موقع وعظ مزید اکتاہٹ پیدا کرتے ہیں" ۲؎

زیر تبصرہ کتاب تنقید نہیں تاریخ ہے۔ جسے اس دعوے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ یہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ہے۔ آیئے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس قسم کے عنوانات پر کتابیں لکھنے کا کوئی جواز بھی ہے یا نہیں اور کیا یہ تاریخ کو اختصار کے ساتھ کتابی شکل میں پیش کرنے کی پہلی کوشش ہے؟

اختصار اختصار میں فرق ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طویل تحریروں سے مختصر تحریروں پا اور پھر مختصر ترین تحریروں پر آ جانے میں کچھ نقصانات ہیں۔ لیکن کچھ فائدے بھی ہیں کیونکہ زندگی کم ہے اور کام زیادہ۔ آج ادب کے ایک طالب علم کے لئے مناسب اختصار کے ساتھ کتابوں کی تحریر ضروری ہے اس کتاب کی اشاعت کا ایک بہت بڑا جواز یہ بھی ہے کہ پہلی بار اردو ادب کی کسی تاریخ میں ہمعصروں کا فراخ دلی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے مصنف کے اس دعوے کا کہ کتاب آغاز سے اب تک کے اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ پیش کرتی ہے۔۔۔ فاضل مصنف نے اردو ادب کے کسی دور یا کسی اہم نام کو نظر انداز نہیں کیا۔ پہلے بارہ ابواب میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس میں کوئی جھگڑے کی بات نہیں اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ہر اہم بات مختصراً کہہ دی گئی ہے" ۳؎

اس مختصر سی کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اس نے کسی

۲؎ تبصرہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر فاروقی سیپ کراچی ۱۹۶۱ء
۳؎ " " " " " " از عرش صدیقی بشمولہ فنون لاہور ۱۹۶۳ء

اورنگ زیب قاسمی

گوشے کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ ظاہر ہے لکھنے والے کی نگاہ خود سورج نہیں ہوتی وہ تو سورج تخلیق کرتی ہے یعنی جہالت اور بے خبری کے اندھیروں کو دور کرتی ہے۔ اندھیرے دور ہوتے ہیں تو تخلیق کا جہان معنی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ کتاب بھی ایک جہان معنی ہے۔ ایک کوزہ ہے جس میں مطالب کا ایک دریا ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ ایسا دریا جس کی تہہ میں اگر بصیرت کے بے شمار موتی ہیں تو سطح پر ذہانت کے شاداب کنول اپنی تازگی کی بہار دکھا رہے ہیں۔ آپ کو جگہ جگہ ڈاکٹر صاحب کی دانش افزا عبارت کے چمن کھلے ہوئے نظر آئیں گے۔ ان چمن ہائے رنگا رنگ سے جہاں کتاب کی رنگینی و زیبائی تم رچند افزوں ہوگی وہاں قاری کے لئے بہت بڑی دولت کی فراہمی کا انتظام بھی ہو گیا ہے۔ یعنی ڈاکٹر صاحب کی فکر انگیز عبارت نے ہر جگہ توازن کے ستون کھڑے کر دیئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں توازن انسانی ذہن کے لئے ایک ٹانک کا کام کرتا ہے جس کی بدولت نہ صرف ذہن کے سوچنے کی استعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ ذہن کے لئے تخلیق کی بہت سی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتاب کیسا دریا ہے کیسا کوزہ ہے اور اس کی تہہ میں کتنے گوہر ہیں اور اس کی سطح پر کیسے کیسے شاداب کنول کھلے ہوئے ہیں۔" [1]

میرے نزدیک اس مختصر ترین تاریخ ادب اردو کی دو خوبیاں ایسی ہیں جو اسے ایک ممتاز حیثیت دیتی ہیں۔ اول یہ کہ اردو کے پورے ادب کے متعلق ناگزیر طور پر ضروری معلومات قاری کو مل جاتی ہیں۔۔۔ اور بعد از مطالعہ وہ اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اردو ادب کی تاریخ کو جانتا ہے۔

دوسری خوبی مصنف کی ذہنی غیر جانبداری ہے۔ ہر کسی کو معلوم ہے کہ اردو کے آغاز اور گہوارۂ اول سے متعلق متضاد نظریے موجود ہیں اور ان کے بارے میں ایک گونہ نزاع بھی برپا ہے۔ لیکن سلیم اختر نے تاریخی سیاق و سباق کے حوالے سے اردو کا پہلا گہوارہ سندھ کو قرار دیا ہے۔ پھر غزنی اور پشاور کے درمیان کے علاقے کو اس کے بعد پنجاب کو۔۔۔۔۔ اور سلسلہ وار تاریخ کے ساتھ ساتھ باقی علاقوں کو۔۔۔۔ یہ بالکل مدلل اسلوب بحث ہے۔" [2]

---

[1] تبصرہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از مشکور حسین یاد بشمولہ معاصر شمارہ نمبر ۳ لاہور ۱۹۸۳ء

[2] از ڈاکٹر سید عبداللہ۔ نقوش لاہور

"نگاہ اور نقطہ" سلیم صاحب کے تنقیدی مقالات کا پہلا مجموعہ ... ستان اور ہندوستان کے جرائد میں اس کتاب پر بہت اچھے تبصرے کئے گئے۔ ان تبصرہ نگاروں میں سے چند کی رائیں یہاں قلمبند کی جاتی ہیں۔

"نگاہ اور نقطہ" سلیم اختر کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں بارہ مقالات ہیں اور یہ سب ادب کے نہایت اہم موضوعات کو محیط ہیں" زیوس سے امیر حمزہ تک " میں مقالہ نگار نے بڑی خوبی سے اساطیر و روایات کی اہمیت واضح کی ہے اور بتایا ہے کہ ان چیزوں نے شعوری اور لاشعوری طور پر انسانی ذہن کو کس طرح متاثر کیا ہے۔ " منٹو خطوط کے آئینے میں " یہ مقالہ اس اعتبار سے بڑا اہم ہے کہ اس میں منٹو کے خطوط کی روشنی میں اس ممتاز افسانہ نگار کی شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے " مرزا رسوا کا نظریۂ ناول نگاری " اپنی طرز کا پہلا مضمون ہے جو رسوا کے مشہور ناول " امراؤ جان ادا " کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے مصنف کے نظریۂ ناول نگاری کے متعلق ہے۔ " غالب کی نرگسیت " میں غالب کے ایک نئے پہلو کو موضوع فکر بنایا گیا ہے۔ " باغ و بہار کے درویش عاشق " میں باغ و بہار کے کرداروں کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے پرکھا گیا ہے۔

باقی مضامین میں بھی مصنف کی وسعت مطالعہ، ذہنی توازن، دلیل آفرینی اور شگفتگی بیان کی خوبیاں ملتی ہیں۔ دیباچہ اردو کے جلیل القدر محقق ڈاکٹر وحید قریشی کا ہے۔ اور تکملہ پروفیسر عرش صدیقی نے تحریر کیا ہے۔ تکملہ مختصر ہے مگر جامع ہے" [1]

اردو ادب میں پچھلے چند برسوں میں نفسیاتی تنقید کا رجحان بڑھ رہا ہے جو ایک خوش آئند علامت ہے " نگاہ اور نقطہ " سلیم اختر کے ایسے ہی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس کے بیشتر مضامین میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے فن کاروں کے شخصی تجزیئے کئے گئے ہیں۔ سلیم اختر نے ان تجزیوں کے بعد اکثر بڑے دلچسپ نتائج اخذ کئے ہیں۔ مثلاً "منٹو کا مشہور افسانہ " نعرہ " ایک ایسے شخص کے بارے میں ہے جو اپنی پژمردگی کے بحران کو ایک نعرہ سے اڑا دیتا ہے۔ کہیں منٹو بھی ایسا ہی پگلا تو نہیں (نعرہ ہمایوں میں پگلا کے عنوان سے شائع ہوا تھا) جو اعصابی پژمردگی کا بحران دور کرنے کے لئے افسانوں کی صورت

---

[1] تبصرہ نگاہ اور نقطے مرزا ادیب۔ سہ ماہی اردو کراچی

اورنگ زیب قاسمی

میں نشتر لگاتا ہو..." (منٹو خطوط کے آئینے میں)

"غالب کے بارے میں ایسا سوانحی مواد موجود نہیں جس سے ہم اس کی شخصیت کے عناصر ترکیبی اور اس کے لاشعوری محرکات سے واقف ہونے کے لئے اس کی تحلیل نفسی کر سکیں اس لئے انفرادیت کے اس شدید رجحان کے بارے میں قیاساً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس احساس برتری کی پیداوار ہوگا جس کی اساس احساس کمتری بنا کرتا ہے۔" (غالب خطوط کے آئینے میں)

"مجھے ان کی (مولوی عبدالحق) شخصیت نگاری کا انداز میکانکی سا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے جن کرداری خصوصیات پر شخصیت کے مطالعے کی اساس استوار کی انہیں بہ آسانی چند عنوانات کے تحت جمع کیا جاسکتا ہے۔" (چند مبصر)

"ان کی شاعری کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو اکبر ۱۸۵۷ء کے بعد کی شکست خوردہ مسلم ذہنیت کی علامت سمجھے جاسکتے ہیں۔ جسے ماضی سے لگاؤ تھا اور جو ہر قیمت پر اپنی تمدنی اقدار کی خواہاں تھی" — (اکبر ایک تجزیاتی مطالعہ)

ظاہر ہے کہ سلیم اختر کے اخذ کردہ نتائج سے کلیتاً اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ بادی النظر میں ان کے فیصلے مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں محض چونکانے کی خاطر نہیں کہی گئی ہیں۔ اپنی باتوں کو وزن دار بنانے کے لئے سلیم اختر نے ان مضامین میں خاصا مواد پیش کیا ہے اور زیر بحث شخصیت کے خطوط اور اس کے متعلق اپنے پیشروؤں کے مضامین کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اپنے مطلب کے حوالے اور دلیلیں بہ افراط پیش کی ہیں۔ وہ تحلیل نفسی کے دوران محض شخصیت ہی کو مد نظر نہیں رکھتے۔ بلکہ متعلقہ دور، معاشرے اور دیگر عوامل کے اس شخصیت پر اثرات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی تنقید کی اساس نفسیات پر ہے لہٰذا زیادہ تر مقامات پر فن انہیں فنکار کی خامیاں پہچاننے میں مدد دیتا ہے۔ شخصیت کے ذریعہ فن کی خوبیوں کی پہچان کی توقع اس قسم کے مضامین سے نہ رکھنی چاہئے۔

سلیم اختر چونکہ افسانہ نگار بھی ہیں لہٰذا انہیں زبان و بیان پر دسترس حاصل ہے اور عام ناقدین کی طرح ان کی تنقید کثیف، بوجھل اور غیر دلچسپ ہونے سے بچی ہوئی ہے۔" — (مظفر حنفی "تحریک" دہلی)

سلیم اختر کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اساطیری ادب، انتھراپولوجی اور نفسیات سے خصوصی دلچسپی ہے۔ "زیوس سے امیر حمزہ تک" ایک دلچسپ اور منفرد مضمون ہے۔ ہماری داستانی علامتوں کو اساطیری پس منظر میں سمجھنے کی غالباً یہ پہلی اور کامیاب کوشش ہے۔ منٹو کی افسانہ نگاری پر افسانے کے نقادوں نے اپنے اپنے انداز میں مختلف پیرائے سے لکھا ہے۔ سلیم اختر نے منٹو کے خطوط کا

اورنگ زیب قاسمی

سے تلاش کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے غالب اور منٹو کا موازنہ بھی کیا ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ "ان دو عظیم فنکاروں میں بعد زمانی کے باوجود بعض خصوصیات مشترک ہیں اور غالب کی مانند منٹو کے خطوط بھی بعض ایسی نفسیاتی جھلکیاں رکھتے ہیں جن سے ہم شخصیت کی نفسی اساس کو کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔"

ممکن ہے کہ بعض حضرات کو سلیم اختر کے اس موازنے سے اختلاف ہو، لیکن یہ موازنہ بعض علامتوں پر مبنی ہے اور سلیم اختر کی تازہ خیالی اور تازہ کاری کا آئینہ دار ہے۔ اسی قسم کی بعض جرأتیں تنقید کو روایتی فضا سے نکال کر تازگی عطا کرتی ہیں۔ اسی مجموعے میں غالب کو بھی ان کے خطوط کے آئینے میں دیکھا گیا ہے۔ اس طرح خود سلیم اختر کا ایک تقابلی مطالعہ ہو جاتا ہے کہ جب وہ ان دو عظیم فن کاروں پر الگ الگ قلم اٹھاتے ہیں اور خطوط کے آئینے میں ان کی شخصیت کے خدوخال دیکھتے ہیں تو ان کا زاویۂ نگاہ اور پیرایۂ بیان کیا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ غالب پر دو اور مضامین بھی "نگاہ اور نقطے" میں شامل ہیں "غالب کی نرگسیت" اور "مرد عاشق کی مثال — غالب"۔ ان مضامین میں غالب کا نفسیاتی تجزیہ نئے رخ سے کیا گیا ہے۔ انشائیہ نگاری، اکبر — ایک تجزیاتی مطالعہ، ریختی، اور رسوا کا نظریۂ ناول نگاری اس مجموعے کے چند اور کامیاب مضامین ہیں۔ باغ و بہار کے درویش عاشق، کا مطالعہ میر تقی میر کی غزل کے پس منظر میں کیا گیا ہے۔ ان تمام مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلیم اختر نفسیاتی دبستان تنقید سے وابستہ ہو کر اپنی انفرادیت منوانے کے ساتھ ساتھ مضامین میں ایسی اُپج اور ذہانت سے کام لیتے ہیں جو انہیں منفرد بنانے کے لئے کافی ہے۔ ان کے مضامین میں قلم برداشتہ تنقید کا انداز نہیں ہے کہ قلم اٹھایا اور جو چاہا لکھ دیا۔ سلیم اختر کے مضامین میں ان کا وسیع مطالعہ، ذہانت اور محنت کا اعتماد پوری طرح کار فرما نظر آتا ہے۔ شاید اسی اعتماد نے ان میں بے باکی اور جرأت پیدا کی ہے اور وہ تجزیہ یا تقابل کرنے میں جھجکنے کے بجائے آغاز کر دیتے ہیں۔ لیکن اس آغاز کار میں وہ اشتعال انگیزی کے بجائے متانت اور سلیقے سے کام لیتے ہیں۔ سلیم اختر نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار بھی ہیں ان کی تحریر میں جو روانی اور برجستگی ملتی ہے اس میں شاید ان کی افسانہ نگاری کا دخل ہے۔"[1]

"نگاہ اور نقطے" ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں بارہ مضامین شامل ہیں۔

---

[1] تبصرہ: نگاہ اور نقطے از سحر انصاری بشمول سلیم اختر کی دو کتابیں — انکا، کراچی

"مجھے خاص طور پر ان کے تینوں مضامین "زیوس سے امیر حمزہ تک"، "اور باغ و بہار کے درویش عاشق" کے عنوان سے شامل مضامین نے خاص طور سے متاثر کیا ہے۔ ایک ایسی تنقیدی روایات کے پس منظر میں جہاں کسی فن کار یا فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت اصل فن کار کی ذات سے زیادہ کائنات کو کھنگالنے میں محنت صرف کی جاتی تھی، سلیم اختر کے مضامین ایک فال نیک کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی دلربائی ہر پڑھنے والے کو متاثر کرے گی۔ بنیادی طور پر سلیم اختر خود ایک اچھے تخلیقی فن کار ہیں۔ اس لئے فن کے اصل محرکات کی دریافت اور ان کے جواز کا جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے اسے خواہ ہر شخص تسلیم نہ کرے لیکن اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہ ہو گا کہ یہ راستے معتبر مذاق و مزاج، سنجیدہ غور و فکر اور قابل قدر فنی بصیرت کے بہت سے نشانات اپنے اندر رکھتے ہیں۔" [1]

نگاہ اور نقطے بارہ مقالات پر مشتمل ہے۔ ایک دو چھوڑ کر سارے مقالات عملی تنقید کے دائرے میں آتے ہیں اور آپ جانتے ہیں عملی تنقید معتبر بننے کے لئے نقاد سے خوش فکری خوش ذوقی سے کہیں زیادہ تاریخ ادب، عمرانیات اور نفسیات کے گہرے مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہر چند کہ سلیم اختر نے ان علوم کے ماہرین کے حوالوں سے اپنے مقالات کو گراں بار اور اپنے قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی پھر بھی ان کی تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعہ اس باب میں نہایت وسیع ہے اور اس وسعت مطالعہ نے ان کی طرز فکر اور طرز بیان کو انفرادی لب و لہجہ سے آشنا کیا ہے۔ یہ لب و لہجہ، غرور علم، بے جا تعریض و تنقیص، خود نمائی و خود ستائی اور احساس کمتری یا برتری کی اس جھلاہٹ سے پاک ہے جو آج کی تنقیدی تحریروں کی خصوصیت بن گئی ہے۔ سلیم اختر کا تنقیدی لب و لہجہ دراصل خود اعتمادی، خود پوشی، ادبی دیانت، کشادہ نظری، بے باکی، خوش فکری، خوش ذوقی، طبیعت کی نرمی اور تخلیقی شگفتگی سے عبارت ہے۔ اس لئے ان کا لب و لہجہ پھول کی پتی کی طرح نرم و نازک، شبنم کی طرح خنک و شفاف اور ندی کی طرح سبک خرام و نغمہ بار ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لب و لہجہ میں مردانا پر اثر انداز ہونے اور ہیرے کا جگر کاٹ دینے کی صلاحیت ہے۔" [2]

[1] تبصرہ نگاہ اور نقطے از شمیم، مشمولہ آج کل نئی دہلی فروری ۱۹۷۱ء
[2] از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مشمولہ نگار پاکستان جولائی ۱۹۷۱ء

اورنگ زیب قاسمی

"نگاہ اور نقطے" سلیم اختر صاحب کی کتاب ہے جس کی وضاحت وہ خود اس طرح کرتے ہیں۔ "نگاہ — کائنات کی وسعتوں کا آلہ۔ نقطے — تفہیم کی اکائی۔ بصیرت کا راز کائنات کے اسرار کی علامت۔ تنقید۔ نگاہ اور نقطے میں توازن کے ہر دم متغیر انداز کا پیمانہ۔ نقاد کی نگاہ ایک ہے اور نقطے بے شمار۔ ان روشن چمکیلے تاریک بے رنگ یا ہمہ رنگ نقطوں کو تار نگاہ میں پرونا نقاد کا کام ہے۔ اس طرح وہ کثرت میں وحدت پیدا کرتا ہے۔" ان کے خیال میں "نقاد کا یہ بھی فریضہ کہ وہ نگاہ اور نقطوں میں توازن کے ہر دم متغیر انداز کے بارے میں حساسیت کا ثبوت ہی نہ دے بلکہ اپنے قارئین کو اس حساسیت کے موجب رد عمل سے روشناس کرانے کی سعی بھی کرتا ہے۔" ان کا کہنا ہے کہ "ادبی معیاروں میں تبدیلیاں اقدار نقد میں ترمیم و تنسیخ، روایت اور بغاوت کے انقلابات اور تجربات کی جانچ کے پیمانے درحقیقت نگاہ اور نقطوں میں توازن کے ہر دم متغیر انداز ہی ہیں۔ انہیں کو زاویۂ نگاہ، نقطۂ نظر اور نقاد کی بصیرت وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔" اپنے تنقیدی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے سلیم اختر کہتے ہیں کہ "یہ کتاب ایک درجن مضامین پر مشتمل ہے اور ان میں سے ایک آدھ استثنائی مثال سے قطع نظر بقیہ مضامین میرے تنقیدی شعور کے مظہر اور یہ نگاہ کی تشکیل نفسیاتی مطالعہ کی مرہون منت ہے۔" [1]

سلیم اختر کی تنقید اساطیری اور تاریخی ہے۔ اور انہوں نے خاص طور پر ینگ کے نفسیاتی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے لئے تنقید میں نئی راہ نکالی ہے۔

"نگاہ اور نقطے" کے پہلے مضمون "زیوس سے امیر حمزہ تک" میں سلیم اختر نے ہر عہد کے ادب پر میتھ اور آرکی ٹائپ کا کس قدر گہرا اثر پڑا ہے۔ اسے بخوبی اجاگر کیا ہے خصوصاً ہندوستان، آئس لینڈ، ایران اور روم میں اساطیر میں مشابہت کی تلاش نیز سنسکرت پالی اور افریقی زبانوں کی حیوانی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ نہایت دلچسپ ہے۔ سلیم اختر کے ذہن میں نقاد اور ایک ماہر علم النفس کے رویہ میں جو فرق ہونا چاہئے وہ واضح ہے۔ نقاد کو دیگر علوم و فنون کی طرح علم النفس سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے۔ لیکن ادب کو محض علم النفس نہ بنا دینا چاہئے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے شاعری میں فلسفے سے استفادہ کیا جا سکتا

[1] سلیم اختر کی نگاہ اور نقطے از نوشابہ نرگس۔ نیرنگ خیال راولپنڈی جولائی ۱۹۷۶ء

ہے۔ لیکن شاعری کو محض علم فلسفہ نہ بنانا چاہئے۔ ماہر علم النفس کا فرض محض شاعری کی نفسیات کا مطالعہ کرنا ہے اور اس طرح اس کا رویہ یک طرفہ ہے جب کہ نقاد کا کام شاعر اور قاری کے درمیان ایک مضبوط اور مستحکم رشتہ قائم کرنا ہے اور اس طرح اس کی ذمہ داری دو طرفہ ہے۔ سلیم اختر کی تنقید اس لئے محض نفسیاتی ہو کے نہیں رہ جاتی کہ اردو شاعری کے مزاج کے تاریخی پس منظر کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں اور وہ بعض اوقات نفسیات اور تاریخ میں توازن برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور بعض دیگر اوقات علم النفس کی بھول بھلیوں سے دامن چھڑا کر ذاتی تجربات کی کھلی فضا میں سانس لینے لگتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ غالب کے کلام میں نرگسیت کے عنصر پر بحث کرتے ہوئے وہ غالب کے رنگا رنگ کلام پر نرگسیت کا لیبل چسپاں کرنے کے مخالف نظر آتے ہیں۔ "منٹو خطوط کے آئینے میں" میں سلیم اختر نے غالب اور منٹو کے خطوط کا تقابلی تجزیہ کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان دو فنکاروں میں بعد زمانی کے باوجود بھی بعض خصوصیات مشترک ہیں۔ "شاعری میں زنانہ پن کی مثال — ریختی" میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ دکنی غزل کا نہ تو لکھنوی ریختی سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی وہ ان سماجی اور نفسیاتی محرکات کی جنم دہندہ ہے جو اس لکھنؤ سے مختص ہو چکے ہیں۔ بلکہ دکنی غزل نے ہندی شاعری کی روایات سے اثر قبول کر کے اپنے مزاج کی مقامی رنگ سے تشکیل کی ہے۔ سلیم اختر کے دیگر مضامین میں "مرد عاشق کی مثال — غالب" "انشائیہ نگاری"۔ "مرزا رسوا کا نظریۂ ناول نگاری"، "ابن الوقت"، اور "اکبر۔ ایک تجزیاتی مطالعہ" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ "نگاہ اور نقطے" کے موضوعات اس قدر مختلف النوع ہیں کہ ان تمام مضامین کے مطالعہ کے بعد مجموعی طور پر ہمارے ذہن میں وہ گہرے نقوش پیدا نہیں ہوتے۔ جو مثال کے طور پر وزیر آغا کی تنقیدی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" پڑھ کر ہوتے ہیں۔

بہرکیف! میں ڈاکٹر وحید قریشی کے اس قول سے متفق ہوں کہ سلیم اختر نے نفسیاتی تنقید میں توازن اور بے تعصبی اختیار کر کے ہماری تنقید کو ایک راستہ دکھایا ہے۔"[1]

"علم تنقید کی اس وقت بہت سی شاخیں ہیں۔ یا یوں کہیے کہ علوم اور ان کے نظریات

---

[1] تبصرہ: نگاہ اور نقطے از کرامت علی کرامت۔ شاخسار کٹک شمارہ ۲۰-۲۹ ۱۹۷۵ء

اورنگ زیب قاسمی

کی عینک لگا کر ادب کو دیکھنے اور پرکھنے کے سلسلے میں ہر علم کا ماہر ایک الگ راہ رکھتا ہے۔ عمرانیات کے ماہروں نے وہ تنقید پیش کی ہے جو اشتراکی تنقید کہلاتی ہے۔ اور جس کا اردو میں اس وقت نمایاں کارنامہ وزیر آغا صاحب کی "اردو شاعری کا مزاج" ہے۔ سلیم اختر صاحب ایک دوسرے علم کی راہ لیتے ہیں۔ یہ علم نفسیات ہے اور اس کے اصولوں سے ادب کو دیکھنے کے بھی کئی طریقے رائج ہیں مگر اختر صاحب ان میں سے ایک ہی کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی وہ راہ جو تحلیل نفسی PSYCHO-ANALYSIS کی راہ کہلاتی ہے اور فرائڈ، یونگ، اڈلر کے ناموں سے وابستہ ہے۔ دیباچہ میں ڈاکٹر قریشی بھی انہیں لوگوں کے نام لیتے ہیں۔ اور مضامین پڑھنے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان ہی کے نظریوں سے اردو کے شعرا کی ہستی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مثلاً غالب خطوط کے آئینے میں۔۔ ہی میں ایسے جملے ملتے ہیں۔

"جب ہم ان تحریروں کی تہہ میں جاتے ہیں تو وہاں ہم کسی چڑچڑے مریض اور اور سنکی بوڑھے کے بجائے ایک فلسفی سے دوچار ہوتے ہیں جو ہلکے پھلکے مزاح سے زندگی کے بھید کھول رہا ہے۔ جو زندگی سے شکست خوردہ ہونے کے باوجود بھی اس لئے ہار نہیں مانتا۔ بلکہ یہم رجائیت مایوس رجائیت جو بعض اوقات مریضانہ MORBID معلوم ہونے لگتی ہے۔ قنوطیت اور یاسیت کو جھٹکتا رہتا ہے۔"

یا مرد عاشق کی مثال غالب، میں بھی ایسے جملے ملتے ہیں۔

"اگر خود پسند شاعر کے محبوب سے تعلقات کے انداز کا نفسیاتی مطالعہ کیا جائے تو دو رجحانات خصوصی طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک اذیت پرستی دوسرا رشک، اور غالب کی نرگسیت، تو پورا کا پورا نفسیاتی تحلیل کے ایک مخصوص اصطلاح کی غالب کی مثال لے کر تفصیل ہے۔ ہر مضمون میں ایسا مواد بھی لایا گیا ہے جو نفسیاتی تنقید سے محض تعلق ہی رکھتا ہے۔ اور کچھ مضمون ایسے بھی ہیں جن میں نفسیاتی تحلیل سے زیادہ اصناف کی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ مگر ہر جگہ محسوس ہوتا ہے کہ نقاد نے تحلیل نفسی کی راہ بڑی استقلال سے چلنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ جیسے کہ سید احتشام حسین صاحب مارکسی تنقید کی راہ پر چلتے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لغزش اور غلط فہمی دونوں سے بری ہیں اور اس لئے ستائش کے مستحق ہیں۔"[1]

---

[1] تبصرہ: نگاہ اور نقطے از محمد احسن فاروقی بشمول سیپ کراچی

افسانہ حقیقت سے علامت تک

اگرچہ یہ کتاب متفرق مقالات کا مجموعہ ہے مگر ان تمام مقالات میں باہمی ربط بھی ملتا ہے۔ یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی۔ ہندوستان میں بھی یہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کے بعض مضامین مثلاً اردو کا پہلا جنسی افسانہ۔ باغ و بہار کا درویش عاشق، متھن سلیم صاحب کو خود بھی بے حد پسند ہیں۔ راقم الحروف کے ایک خط کے جواب میں فرماتے ہیں :

"اب تک سجاد حیدر یلدرم کو محض ایک رومانی افسانہ نگار سمجھا جا رہا ہے۔ لیکن میں نے پہلی مرتبہ ان کے مشہور افسانہ " خارستان و گلستان " کا فرائیڈین انداز نظر سے مطالعہ کر کے اس میں جنس نگاری کی زیریں سطح کو دریافت کیا ہے۔"

باغ و بہار کے درویش عاشقوں کے عشق اور میر تقی میر کی غزلوں کے عاشق میں جو مماثلتیں ہیں انہیں سلیم صاحب نے کلام میر کی روشنی میں اجاگر کیا ہے اس مضمون میں بڑی محنت کی گئی ہے۔ جیسا کہ سلیم صاحب نے خود فرمایا ہے کہ اس ایک مضمون کی تیاری کے لئے میں نے میر کے چھ کے چھ دیوان کھنگال ڈالے اور یوں ان میں سے اپنے مطلب کے اشعار تلاش کئے۔ " باغ و بہار " کے مطالعے کے ضمن میں اس مضمون کا بھی بڑا چرچا رہا ہے۔

" متھن " کی پسندیدگی سے متعلق راقم الحروف نے ان سے سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ " میں راجندر سنگھ بیدی کا مداح ہوں اور اس کے افسانوں میں " متھن " مجھے سب سے زیادہ پسند ہے اسی پسندیدگی کا تنقیدی اظہار " متھن " کے تجزیاتی مطالعے کی صورت میں ہوا۔ " متھن " میں جس طرح عورت کی خود شناسی کے عمل کو واضح کیا ہے۔ میں نے بڑی محنت سے اسے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح بیدی نے جس خلاقانہ مہارت سے افسانے کی فضا کی تشکیل کی ہے اس کا بھی میں نے تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔"

اس کتاب کے متعلق چند مبصروں کی آرا درج ذیل ہیں :

" افسانہ حقیقت سے علامت تک " ڈاکٹر سلیم اختر کی افسانوی تنقید کے سلسلے کی وہ کتاب ہے جو بقول سید وقار عظیم " اردو فکشن کی تنقید میں تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ بڑا خوشگوار جھونکا " اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے نزدیک " افسانوی ادب پر تنقید میں معرکتہ الآرا کتاب ہے۔" ڈاکٹر سلیم اختر سے پہلے کے نقادوں نے جن میں سید وقار عظیم بھی شامل ہیں افسانوں کے مطالعے کے برعکس افسانہ نگاروں کو سامنے رکھ کر نتائج اخذ کئے ہیں۔ مگر ڈاکٹر سلیم اختر وہ واحد نقاد ہیں جنہوں نے افسانے کو پیش نظر رکھا ہے اور اپنے وسیع مطالعے اور بالغ نظری سے افسانے کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد یہ کتاب سوچ کی نئی جہتیں لے کر فضائے ادب پر روشن ستارے کی طرح نمودار ہوئی ہے۔ جس طرح " اردو افسانے کے اسلوب " ہیئتی تبدیلیوں اور مواد و موضوع کے نفسیاتی حوالوں سے تجزیئے کئے گئے ہیں اور افسانے میں جو نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں ان کی بھی بڑی دیانت داری اور بے تعصبی سے نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین اردو کا پہلا جنسی افسانہ، افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ، مختصر افسانہ اعتراضات اور جوابات، افسانہ حقیقت سے علامت تک، ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ، نفسیاتی افسانہ، روح عصر اور افسانہ، اردو افسانے میں عورت، احمد ندیم قاسمی کے افسانے، کیا آج سعادت حسن منٹو کی ضرورت ہے، متھن کا تجزیاتی مطالعہ، بھی افسانے کے موضوعات سے متعلق ہیں۔ اور افسانے کے مباحث اور فنی حوالے سے اٹھائے گئے سوالات کے جواب فراہم کرتے ہیں اور افسانوی صورت حال کی وضاحت بھی۔ اس کے ساتھ صنف افسانہ کا مطالعہ بھی ہے اور انفرادی سطح پر بعض افسانہ نگاروں کے فن کا تجزیہ بھی۔

ان سب مضامین میں سلیم اختر کا یہ نظریہ کار فرما نظر آتا ہے کہ نفسیاتی مطالعہ ادب پارے کی تکمیل کے بعد سے نہیں بلکہ اس کی تخلیق سے پہلے شروع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بعض انکشافات بھی کئے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے یلدرم کو پہلا جنسی افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ مختصر افسانہ میں بعض اختلافی اور نزاعی موضوعات چھیڑ کر افسانے کے فنی معیاریات اور اساسی رجحانات کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کر دیا ہے۔

"اس طرح افسانے اور اس کے فن کی مختلف جہات کے علاوہ افسانہ نگاروں کے نفسی محرکات کا بھی سراغ لگایا ہے۔ چنانچہ " افسانہ حقیقت سے علامت تک " کی خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب میں افسانہ کے بنیادی موضوعات کو پیش نظر رکھ کر بڑی بے باکی اعتماد اور جرأت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ بقول محمد علی صدیقی " یہ ایک نقاد کی تحریر ہے جس کے تنقیدی افکار سے اختلاف رائے تو کیا جا سکتا ہے لیکن تنقیدی ادبیات سے انکار ممکن نہیں " اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہے کہ یہ صحت مند اختلاف کی دعوت دیتی ہے۔" [1]

[1] رجحانات ' ڈاکٹر طاہر تونسوی

اورنگ زیب قاسمی

"میں سلیم اختر کی تنقید کو نفسیاتی تنقید کہنے کے بجائے ذہنی کشادگی کی تنقید کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ باغ و بہار پر تحقیق و تنقید ہو یا افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ، افسانے میں حقیقت سے علامت تک کا ذکر ہو یا ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانے کی بحث ہو وہ پہلے سے کوئی نظریہ قائم کر کے یا صرف ایک علم کو اپنا راہنما بنا کر اظہار رائے نہیں کرتے موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ ان کا مطالعہ بھی متنوع نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہ ہر مسئلے کو اس کے پیش منظر و پس منظر سے الگ کر کے نہیں دیکھتے بلکہ اسے اس کے صحیح تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اس کا وہ ماحول بھی نظر انداز نہیں کرتے جو اس مسئلے کو مخصوص سماجی عوامل و محرکات کے وسیلے سے منظر عام پر لاتا ہے۔ ان کے ہاں اپنے ادب کا مطالعہ یک رخا نہیں وہ اردو ادب کے سلسلے کی کلاسیکی روایات سے بخوبی واقف ہیں اور اس ادب سے بھی ناواقف نہیں جو اس وقت تجریدیت کا روپ دھار رہا ہے۔ اپنے پہلے مضمون باغ و بہار کے سلسلے میں انہوں نے اپنا مطالعہ میر امن کے رنگین اور خوبصورت اسلوب بیان تک محدود نہیں رکھا، اسے محض اپنے مطالعے کا ایک جز قرار دیا ہے۔ وضاحت سے گفتگو اس معاملے میں کی ہے کہ باغ و بہار کا اصل ماخذ کیا ہے۔ وہ کون سے حالات ہیں جن کی وجہ سے میر امن کو باغ و بہار کی تصنیف یا تالیف کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ اور سب سے ضروری امر یہ کہ میر امن کے یہاں مقامیت کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے — سلیم اختر نے باغ و بہار کے ایک اور پہلو کا بھی مطالعہ کیا ہے اور وہ ہے باغ و بہار کے درویش عاشق — سلیم اختر نے اس کتاب کے کرداروں کا مقررہ روایت سے ہٹ کر تجزیہ کیا ہے اور ہر کردار کا ہمدردانہ نہیں ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم اردو کی رومانوی تحریک کے سب سے بڑے مصنف مانے جاتے ہیں۔ ان کے مجموعے "خیالستان" کے اولین افسانے "خارستان و گلستان" کی اہمیت محض اس بنا پر بیان کی گئی ہے کہ اس کی تشبیہات و استعارات میں بڑی ندرت کاری ہے۔ سلیم اختر نے اس کے اس پہلو کو واضح کیا ہے جس پر شاید اب تک کسی نقاد کی نظر بھی نہیں پڑی تھی اور یہ پہلو ہے جنسی پہلو۔

افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ پڑھ کر ممتاز شیریں کے اس موضوع سے متعلق ایک بھرپور مقالے کا خیال آتا ہے۔ مگر سلیم اختر نے اپنے مطالعے کے لئے وسیع تر

اورنگ زیب قاسمی

کا انتخاب کیا ہے اور انہوں نے اپنے اس مطالعے میں نفسیاتی آگہی سے بطور خاص فائدہ اٹھایا ہے۔ جس سے ممتاز شیریں کا مقالہ محروم ہے۔ "ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ" ایک ایسا موضوع ہے جس پر اس سے پہلے بھی مضامین لکھے گئے ہیں۔ تکنیک کی حد تک ان تینوں میں کیا فرق ہے یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں — اصل مسئلہ یہ ہے کہ موضوع اور تکنیک — ان دونوں کو سامنے رکھا جائے اور پھر فرق نمایاں کیا جائے سلیم اختر نے موخر الذکر انداز اختیار کیا ہے۔

"اردو افسانے میں عورت" اردو کے افسانوی ادب بھی تحقیق و تنقید میں ایک مستقل اضافہ ہے — سلیم اختر نے اردو افسانوی ذخیرے کا دقت نظر سے جائزہ لیکر استنباطِ نتائج کیا ہے۔ انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ بعض مقبول افسانہ نگاروں میں عورت کا کوئی قابل ذکر رخ سامنے نہیں آتا — انہوں نے ان نسوانی کرداروں کا بھی تفصیلاً ذکر کیا ہے جو بڑے واضح شفاف اور منفرد پہلو لیکر افسانوں میں در آئے ہیں۔

"احمد ندیم قاسمی کے افسانے" میں احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور بڑی عمدگی سے ژرف — بینی کے ساتھ۔

ان کے علاوہ بھی جتنے مضامین شامل ہیں وہ قابل مطالعہ ہیں — قابل غور ہیں — اردو افسانے کا تاریخی سفر، اس کے مختلف مراحل اور اس سفر کی روداد کے علاوہ ان حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے جو اس سفر میں پیش آئیں — سلیم اختر کے مضامین کے اس مجموعے کا مطالعہ ضروری ہے۔ "[1]

سلیم اختر کا تازہ مجموعہ — افسانہ حقیقت سے علامت تک " اس لحاظ سے ایک خوشگوار اضافہ ہے کہ طویل عرصے کے بعد یہ پہلی تنقیدی کتاب ہے جو مکمل اور مربوط طریقے سے افسانے کے ارتقاء سے بحث کرتی ہے کتاب کا پہلا مضمون باغ و بہار کا مطالعہ ہے ہمارا افسانہ اپنے تکنیکی مزاج کے حوالے سے مغربی اثرات کا نتیجہ ہے۔ لیکن اگر اردو داستان میں اس کی جڑیں تلاش کرنا ہوں تو باغ و بہار اس سلسلے میں بہترین ماخذ ہے۔ دوسرا مضمون یلدرم کے خارستان گلستان سے متعلق ہے۔ تجربات افسانہ کی تکنیک سے

---

[1] تبصرہ۔ افسانہ حقیقت سے علامت تک، از مرزا ادیب فنون لاہور ۱۹۷۷ء

ہوتی ہوئی علامت اور علامت کے حوالے سے روحِ عصر تک آپہنچی ہے۔ آخر میں تین انفرادی مطالعے دیے گیا۔

سلیم اختر ہمارے نوجوان نقادوں میں اس لحاظ سے اہم نام ہے کہ اس کے یہاں مطالعہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ معتدل رائے دینے کی صلاحیت بھی پوری طرح موجود ہے۔ وہ محض مطالعہ کے بل بوتے پر حکم نہیں لگاتا۔ میں نے پہلے بھی کئی بار کہا ہے کہ ہمارے نقادوں میں بہت سے لوگ محض مطالعہ کے زور، یا پھر ساختہ سازی کے بل بوتے پر حکم لگانے کے عادی ہیں۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ وہ دوسری زبانوں کی تنقید پڑھ کر ان زبانوں کے ادب کے سوالات کو اردو ادب پر لاگو کر کے جواب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سلیم اختر کے یہاں مجھے اس کے صاحب مطالعہ ہونے کا تو احساس ہوتا ہے لیکن وہ مجھے اپنے مطالعہ سے خوفزدہ نہیں کرتا وہ اپنے مطالعہ کو اپنی رائے پر بھی حاوی نہیں ہونے دیتا۔ اس کے اس مجموعہ میں اگرچہ اس نے اردو افسانے کی تاریخ، تکنیک اور اسلوب کی بات کرتے ہوئے افسانے کی گلوبل صورت حال اور تاریخ کو ذہن میں رکھا ہے۔ لیکن وہ اردو افسانے کے مزاج سے دور نہیں جاتا۔

اس کتاب کی ایک اور خوبی اس کی غیر جانبدار حیثیت ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ سلیم اختر خود بھی افسانہ نگار ہے اور افسانہ نگار کی حیثیت سے اس کا اپنا ایک تعصب ہے۔ لیکن افسانہ پر تنقید کرتے ہوئے اس نے اس تعصب کو قریب نہیں آنے دیا اور افسانے کے سفر کو کھلی آنکھ اور جاگتے ذہن کے ساتھ دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے اور یوں وہ مجھے پہلی اس کتاب میں ایک صاحب کردار نقاد کے روپ میں ملا ہے۔

سلیم اختر کی یہ کتاب ایک مربوط فطری ارتقاء کی تلاش ہے۔ اگرچہ اس میں تین چار مضمون انفرادی مطالعہ کے ذیل میں آتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اصل مقصد اسی سفر اور سفر کے دوران فکری تسلسل کی تلاش ہے جو افسانے نے حقیقت سے علامت تک کیا ہے۔ اس کی کوشش یہ رہی ہے کہ اس فکری تسلسل کو جو تکنیک اور اسلوب کی بدلتی صورتوں میں بھی جاری رہا، روحِ عصر کے حوالے سے جانچا جائے اس کے بعض نتائج سے تو اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن ماننا پڑے گا کہ اس نے بڑی محنت اور لگن سے اس سارے نشیب و فراز کا جائزہ لیا ہے جس کے درمیان میں سے

اورنگ زیب قاسمی

افسانہ گزرا ہے۔ اس نے افسانے کی اس صورت حال پر جب وہ حقیقت کا بہترین ترجمان تھا سیر حاصل بحث کی ہے، لیکن ذاتی طور پر مجھے محسوس ہوا کہ علامت تک پہنچتے پہنچتے وہ مختصر ہوتا چلا گیا ہے یعنی اس نے حقیقت کو تو مفرد واضح کیا ہے بلکہ مثالوں سے اس کا محاکمہ بھی کیا ہے۔

سلیم اختر کی یہ کتاب اردو افسانے کی تنقید میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اس کی ذہانت، وسیع مطالعہ، فیصلہ دینے کی صلاحیت، نفسیاتی سوجھ بوجھ اور دیانتدارانہ پرکھ کے ساتھ ساتھ ایک تخلیقی شخص اور زبان کو تازہ نکھار پڑھنے والے کو ایک مسرت بخش احساس سے ہمکنار کرتا ہے۔۔ [1]

سراج منیر نے ،، افسانہ حقیقت سے علامت تک ،، کے حوالے سے اردو افسانے کے سفر کا جائزہ لینے کے لئے سید وقار عظیم اور ڈاکٹر سلیم اختر صاحب سے ایک انٹرویو لیا تھا جس میں اس کتاب کے متعلق سید وقار عظیم سے رائے پوچھی گئی تو وقار عظیم صاحب نے فرمایا

" جہاں تک کہ افسانے کی تنقید کا تعلق ہے ایک طرح کا بحرانی دور ہے یہ البتہ ہوا کہ بعض اچھے افسانہ نگاروں کے مجموعے چھپے تو ان پر کچھ مقدمے لکھے گئے لیکن وہاں بھی یوں ہوا کہ جب افسانہ نگار کا مجموعہ شائع ہوا اس پر اظہار خیال ہوا۔ گردوپیش میں کیا ہو رہا ہے؟ یا اس افسانہ نگار کے علاوہ اور دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں ان کی طرف سے عام طور سے بے اعتنائی برتی گئی ان حالات میں اس مجموعے کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ نوجوان نقاد نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنے دور کے افسانے کا مطالعہ کرے اور افسانے کا مطالعہ اس پس منظر میں کرے جس میں افسانے لکھے گئے اور اس مطالعہ کے بعد جو مسائل سامنے آتے ہیں ان پر بے تکلفی سے گفتگو کرتا ہے جو لکھنے والے اس کے سامنے آتے ہیں جس کا بطور خاص اس نے مطالعہ کیا ہے ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے پوری دیانتداری سے حسن و قبح دونوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ایک بات یہ قابل تعریف ہے جیسا کہ آپ نے اپنے تنقیدی ارشادات میں کہا ہے کہ اس طرح کے مضامین کے مجموعے کے آنے کی ضرورت تھی کہ لوگوں کو یہ محسوس ہوتا کہ افسانہ اب بھی ایسا ہے کہ ہمیں اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنی چاہیے اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ہم افسانہ نگاروں کو کچھ مشورے دے سکیں کہ وہ اپنے انداز تحریر کو کس طرح ایسا بنائیں کہ افسانہ پھر اس حد تک پہنچ سکے

[1] افسانہ حقیقت سے علامت تک از رشید امجد ماہنامہ الفاظ کراچی جنوری فروری [illegible]

اور ان مدارج کو طے کر سکے جو اس نے پچھلے زمانے میں طے کیے تھے۔ تو اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ مجموعہ بڑا قابل قدر اضافہ ہے افسانوی ادب کی تنقید میں۔“ [1]

اس کتاب کے سرورق پر محمد علی صدیقی کی یہ رائے ملتی ہے۔ ”سلیم اختر تخلیقی تنقید کے قائل ہیں اور اردو افسانہ پر تنقیدی مضامین کے اس مجموعہ میں بھی جگہ جگہ ایک ایسے ذہن کی کارفرمائی ملتی ہے جو بہت غور و خوض کے بعد ایک موقف اپناتا ہے اور پھر اسے اپنے تقابلی مطالعہ کی بنیاد پر ایسے تنقیدی پیمانوں کے حوالے کرتا ہے جو اس کے لئے محترم اور قابل اعتنا ہیں۔ تنقید کیا ہے؟ اپنی سوچ کو اعتبار بخشنے کا نام اور اگر یہ اعتبار ان قارئین پر بھی منکشف ہو جو نقاد سے متفق نہ ہوں تو پھر اس سے زیادہ کون سا وصف لائق ستائش ٹھہر سکتا ہے۔“

سلیم اختر صاحب افسانہ نگار بھی ہیں اس لئے ان کی افسانوں پر تنقید علم کے علاوہ تجربہ پر بھی مبنی ہے اور اس لئے جو بات وہ کہتے ہیں وہ ان لوگوں کی بات سے زیادہ اہم ہوتی ہے جو محض نقاد ہی ہیں۔ یعنی ان کی تنقید تخلیقی تنقید کے دائرے میں آتی ہے۔ وہ جو اصول سامنے لاتے ہیں انہیں برت کر بھی دیکھ چکے اور برتنے کی زحمتوں سے بھی پورے طور پر واقف ہیں۔ اس بات کا خیال رکھتے ہوئے انور سدید صاحب کا اس تصنیف پر مقدمہ اور اس پر حسب ذیل اظہار بڑا اہم ہو جاتا ہے۔

”افسانہ حقیقت سے علامت تک“ کی خوبی یہ ہے کہ سلیم اختر نے اس کتاب میں افسانے کے بنیادی موضوعات پر آزاد فکری سے قلم اٹھایا ہے اور ان کے باطن سے کردار اور خود مصنف کے نفسی تہیجات دریافت کرنے کی سعی کی ہے ان مضامین میں سلیم اختر نے پورے تیقن اور اعتماد سے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے اس میں گہرے مطالعے کی چاشنی موجود ہے اور قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

اس تصنیف کے بارہ مقالوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یوں تو یہ الگ مقالے ہیں مگر یہ فن افسانہ نگاری کی ”باغ و بہار“ سے لیکر منٹو تک کی پوری تاریخ بھی سامنے لے آتے ہیں۔ ان کا اظہار ان کی اہمیت سامنے لانے کے لئے کافی ہے۔

---

[1] افسانہ حقیقت سے علامت تک، تبصرہ از سراج منیر بشمولہ تخلیق لاہور شمارہ ۱۲۔ ۱۱ ۱۹۶۷ء

”کہانی کو موثر بنانا کہانی کار کا سب سے بڑا مسئلہ بھی ہے اور سب سے بڑا چیلنج بھی اس لئے اس مجموعے میں انفرادی افسانہ نگاروں کے مطالعات کے مقابلہ میں تکنیک اور اس سے وابستہ مسائل و مباحث پر زیادہ مقالات ملیں گے کہ افسانہ کی ترقی کا اس کے فن کی ترقی سے جداگانہ مطالعہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔“

آخر کے دو مضمون خاص طور پر بصیرت افروز ہیں اور افسانہ نگاری پر تنقید کی اردو میں اہم ترین مثال گنے جا سکتے ہیں۔ ”احمد ندیم قاسمی کے افسانے“ میں ایک افسانہ نگار کے تمام اچھے افسانوں کا جائزہ لے کر اس کے اہم ترین رجحان کو واضح کیا گیا ہے۔ ”منٹو کا تجزیاتی مطالعہ“ میں ایک افسانہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے مخصوص فن کو واضح کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اردو کے کسی نقاد نے پہلے نہیں کیا۔ غرض افسانوی ادب پر تنقید میں یہ کتاب معرکۃ الآرا ہے۔“ [2]

ادب اور لاشعور

یہ کتاب جیسا کہ پہلے ہی ذکر آ چکا ہے۔ سلیم صاحب کی پسندیدہ کتابوں میں سے ایک ہے اور جس میں ادب اور اس کے مسائل اور چند اصناف ادب کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے یہ عام ذہنی سطح سے ورے کی چیز ہے اس سے ہر کس و ناکس محظوظ نہیں ہو سکتا۔ اس کی حیثیت اور اہمیت مسلم ہے۔ ملاحظہ ہوں چند تبصرہ نگاروں کی رائیں:۔ جناب مرزا ادیب اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”ادب — تخلیق ہی کی ایک صورت ہے اور سلیم اختر نے زیر نظر کتاب میں مختلف مضامین کے ذریعہ ادب کے گوناگوں پہلوؤں پر بڑی فکر انگیز اور خیال افروز بحث کی ہے اور ان روابط کی بھی نشاندہی کی ہے جو ادب اور انفرادی لاشعور اور اجتماعی لاشعور کے درمیان قائم ہے۔ انہوں نے ادب کے متعدد مسائل کو موضوع فکر بنایا ہے اور بیشتر معاملات میں علم النفس کی کم و بیش ہر شاخ سے استمداد کیا ہے۔

میری نظر میں کتاب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس کا مصنف اگر ایک طرف علم النفس کی جدید ترین تحقیقات سے پوری طرح واقف ہے تو دوسری طرف خود بھی اونچے درجے کا تخلیق کار ہے۔ وہ نفسیات کی اہمیت سے بھی آگاہ ہے اور تخلیق کی معجزہ نمائی سے بھی بے خبر نہیں اور خاص امر یہ ہے کہ وہ دونوں کے درمیان ایک

---

[2] افسانہ حقیقت سے علامت تک تبصرہ نگار ڈاکٹر محمد احسن فاروقی سیپ کراچی۔

اورنگ زیب قاسمی

متوازن منطق اور فکر افروز تطابق پیدا کرنے کا بھی گر جانتا ہے۔ جن مسائل پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے وہ ایک اچھے جیسے نفسیات داں اور تخلیق کار کے حوالے کئے جا سکتے ہیں اور اس تیقن کے ساتھ حوالے کئے جا سکتے ہیں کہ وہ انہیں حل کرنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہے[1]

ڈاکٹر ابن فرید فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر سلیم اختر نے ادب و لاشعور میں زیادہ تر بنیادی مسائل سے بحث کی ہے۔ مثلاً ادب کیا نہیں، تخلیقی محرکات، تخلیقی عمل، ادب اور فحاشی، تخلیق کار کی ابنارملٹی، ادب اور ابلاغ، ادب اور اخلاقی اقدار، تنقید اور لاشعور، غزل: تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ، مرثیہ اور کتھارسس، انشائیہ اور انسانی سائیکی، مصوری اور اعصابی خلل وغیرہ مجموعی طور پر اس کتاب میں اٹھارہ موضوعات پر چھوٹے بڑے مقالات ہیں اور ہر مقالہ میں اپنے موضوع سے پوری طرح انصاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر اختلاف کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے مثلاً ادب کو مرض سمجھنا لیکن نفسی پیچیدگیوں کی آماجگاہ تصور کرنا، اخلاقی اقدار کو انفرادی نفسی تشکیل سے غیر متعلق تصور کرنا یعنی اضافی قرار دینا وغیرہ۔ مگر یہ اختلافات وہ ہیں جو اس صورت میں پیدا ہوتے ہیں کہ ہم یہ فراموش کر دیں کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے شعوری طور پر تحلیل نفسی اور تجزیاتی نفسیات میں مطالعاتی اختصاص کو اپنایا ہے۔

سلیم اختر چونکہ بنیادی طور پر اردو کے منتہی ہیں اس لئے وہ تحلیل نفسی اور تجزیاتی نفسیات کے ساتھ ساتھ ان امور سے بھی واقف ہیں جو اہل ادب کے لئے مخصوص ہیں یعنی ادب سے کس حد تک اور کس نوعیت سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ادب کو زیادہ اسطوری اور لاشعوری تہہ داری عطا کرنے کے لئے وہ نفسیات میں بھی ینگ کی تجزیاتی نفسیات کو عموماً ترجیح دیتے ہیں ادب کا اس نوعیت کا مطالعہ نہ صرف اپنے اندر غیر معمولی کشش رکھتا ہے بلکہ مختلف علوم کے درمیان نقطۂ اتحاد بھی فراہم کرتا ہے۔ اور غور و فکر کے نئے زاویے روشن کرتا ہے۔"[2]

ڈاکٹر محمد معروف نے اپنے ایک مضمون "بعنوان" "ادب اور لاشعور" میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے۔

---

[1] از مرزا ادیب ماہنامہ کتاب لاہور ۱۹۶۶ء

[2] ادب و لاشعور تبصرہ نگار ابن فرید دو ماہی الفاظ علی گڑھ مارچ، اپریل ۱۹۷۹ء

اورنگ زیب قاسمی

"اپنے ابتدائی مضمون بعنوان "ادب کیا نہیں؟" میں سلیم اختر نے ادبی اور غیر ادبی تحریروں میں تمیز کرنے کے لئے کسوٹی کی نشاندہی کی ہے اور اس ضمن میں مختلف نظریات کا جائزہ لیا ہے۔

مزید براں ڈاکٹر سلیم اختر نے اس ضروری بات کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے کہ ہمیں نفسیات اور تحلیل نفسی میں تمیز برقرار رکھنی چاہیئے، جسے عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ میں "ادب اور نفسیات کے مطالعات میں بالعموم غلط فہمی ملتی ہے —— دراصل تحلیل نفسی اور نفسیات میں امتیاز روا نہ رکھنے کی بنا پر بعض اوقات ایک ہی سانس میں ایک کی بات دوسرے سے منسوب کر دی جاتی ہے۔ یہ انداز نظر نفسیات کے خام، ناقص اور متعصبانہ مطالعہ کی وجہ سے پیدا ہوا اور اس کی بنیاد اس لاعلمی پر استوار ہے کہ تحلیل نفسی اور نفسیات کی جداگانہ اہمیت اور حیثیت نہیں ہے۔ گویا ڈاکٹر صاحب نے تحلیل نفسی کے استعمال میں بہت زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور یہ بھی کہ اسے کل نفسیات کی حیثیت قرار دینا کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے۔

سلیم اختر نے اپنی کتاب "ادب اور لاشعور" میں ژنگ کے نظریات کو خاص طور پر اہمیت دی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "گو ژنگ نے اہل تخلیق کے محرکات کی نشاندہی کی خصوصی کوشش نہ کی۔ لیکن اجتماعی لاشعور کے نظریے سے ادبیات کے مطالعہ کو ایک نئی جہت عطا کرتے ہوئے تنقید کو ایک نئے موثر روشناس کرایا" انہوں نے اجتماعی لاشعور کو فرائڈ کے "ذیلی لاشعور سے ایک قدم آگے بتایا ہے۔"[1]

ڈاکٹر طاہر تونسوی لکھتے ہیں:

"ادب اور لاشعور" ڈاکٹر سلیم اختر کی وہ کتاب ہے جسے ۱۹۶۶ء میں داؤد ادبی انعام مل چکا ہے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ نفسیات کے حوالے سے ادب، تنقید، زبان و بیان اور مختلف اصناف کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ "ادب، تخلیقی محرکات اور تخلیقی عمل" میں ادب اس کے مقاصد، ادب اور اخلاق، ادب اور حصول مسرت اور خاص طور پر تخلیقی محرکات کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ادیب اور قاری کے رشتے کو بھی اجاگر کیا ہے اور ادب کی اثر پذیری کے لئے

---

[1] ادب اور لاشعور از ڈاکٹر محمد معروف بشمولہ نئی قدریں سلور جوبلی نمبر

نفسیاتی عوامل کو ضروری قرار دیا ہے۔ پہلے حصے کے بعض مضامین میں مثلاً ادب اور تخلیق لاشعور، میں بڑی وضاحت کے ساتھ افلاطون سے ینگ یونگ تک کے لاشعور کے بارے میں نظریات و افکار کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس طرح لاشعور کی اہمیت اور مرکزیت کو نمایاں کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

ادب اور نرگسیت ڈاکٹر سلیم اختر کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس سے قبل وہ غالب کے ہاں نرگسیت کی واضح نشاندہی کر چکے ہیں۔

دوسرے حصے میں مسائل کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے تخلیق کار کی انا، ادب اور ابلاغ، ادب اور زبان، ادب اور اخلاقی اقدار اور ادب اور فنونِ لطیفہ جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

تیسرے حصے اصناف میں تنقید اور لاشعور، غزل، تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ مرثیہ اور کتھارسس اور انشائیہ اور انسانی سائیکی جیسے موضوعات کا مطالعہ شامل ہے۔ تنقید اور لاشعور میں انہوں نے اردو ادب میں نفسیاتی تنقید کا سراغ لگایا ہے اور مرزا رسوا کو اردو کا پہلا نفسیاتی نقاد قرار دے کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو تنقید میں نفسیاتی تنقید کے آثار قدیم تر ہیں۔

"غزل — تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ" میں انہوں نے غزل کے حوالے سے تخلیق کاروں اور تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اور تلازمۂ خیالات کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے قافیہ اور ردیف کو بھی نفسیاتی اہمیت کا حامل گردانتے ہوئے مقطع کو شاعر کے ذاتی حوالے سے نفسی تسکین اور لاشعوری محرکات کا مظہر قرار دیا ہے۔ اور اسے انسانی نفسیات اور خود تخلیق کار کے نفسی عوامل کے اخراج کا وسیلہ بتایا ہے۔

انشائیے کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کے اپنے الگ اور منفرد نظریات ہیں اور ان کی یہ رائے ہر پہلو سے صحیح ہے کہ انشائیہ نگار انشائیہ لکھ کر اپنی سائیکی کے اس پہلو کو سامنے لاتا ہے جسے نسوانی روح سے تعبیر کیا جا چکا ہے۔

اس اعتبار سے "ادب اور لاشعور" نفسیاتی تنقید کی ایک مکمل اور اہم ترین کتاب ہے جس میں بڑی سنجیدگی سے ادب، اس کے مسائل اور ادبی اصناف کا مطالعہ

اورنگ زیب قاسمی

کیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو سمجھنے کے لئے بہت سی دوسری کتابوں کا مطالعہ ناگزیر بن جاتا ہے۔[1]

ڈاکٹر احسن فاروقی رقم طراز ہیں :

"یہ امر مسلّم ہے کہ تنقید ہمیشہ سے کسی فلسفہ پر مبنی رہی۔ ارسطو اور کلاسیکی نقاد منطق پر ٹیک لیتے رہے۔ انیسویں صدی میں بھی جرمن فلسفیوں اور کولرج نے مابعد الطبیعیات کو تنقید پر عائد کیا اور انیسویں صدی کے ختم تک ہمیشہ تنقید فلسفہ کا پہلو مارتی رہی۔ اس دور میں سائنس کی طرف بھی جھکی مگر بیسویں صدی میں وہ علم نفسیات کے جو سب سے اہم فلسفہ اور سائنس ٹھہرا ماتحت ہو گئی۔ چنانچہ جدید تنقید کی سب سے اہم صفت یہ ہے کہ وہ نفسیاتی ہے۔ اس سلسلے میں سلیم اختر صاحب اردو تنقید کو پورے طور پر بیسویں صدی میں داخل کرتے نظر آ رہے ہیں اور یہ ان کا وہ کارنامہ ہے جس پر ان کو ہر طرح سے داد دینا چاہئے مگر یہ بھی سوال اٹھتا ہے کہ ادبی تنقید کو کیا کسی علم کے بالکل ماتحت ہونا چاہئے؟ ادب حصول انفرادیت ہے اور تنقید اگر ادب کے دائرے میں رہنا چاہتی ہے تو اسے باوجود علوم پر ٹیک لینے اور آج کل کے نفسیات کے علوم پر بھروسہ کرنے کے علاوہ ان سے آزاد بھی ہونا چاہئے۔ زیرِ نظر کتاب کے تمام مضامین پڑھ جانے کے بعد یہیں خیال ہوتا ہے کہ کیا تنقید بھی نفسیات کا ایک شعبہ ہو گئی۔ آج کل کے نفسیاتی تنقید کے نقاد نے یہی کچھ کیا ہے۔ کیا سلیم اختر ان کی پوری پیروی کر رہے ہیں؟ بہر حال نفسیاتی تنقید کے عمل میں وہ اتنے کامیاب ہیں جتنا اب تک کا کوئی اردو نقاد نہ ہو سکا۔"

بہر حال نفسیاتی تنقید پر زیرِ نظر کتاب سے زیادہ پُر معنی اور وزنی مواد اردو میں کہیں اور نہ ملے گا۔ سلیم اختر نفسیاتی تنقید کا پورا پورا حق ہی نہیں ادا کر رہے ہیں بلکہ اس مدرسۂ خیال کا جو سب سے اہم جدید مدرسہ ہے اردو ادب میں جھنڈا گاڑ رہے ہیں۔

انشائیہ کے سلسلے میں کہتے ہیں :

"انشائیہ نگار انشائیہ لکھ کر اپنی سائیکی کے اس پہلو کو سامنے لاتا ہے جسے نسوانی روح سے تعبیر کیا جا چکا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مقصد کسی نقطے کی وضاحت یا نظریہ

---

[1] "ادب اور لاشعور" پر مضمون "رجحانات" از ڈاکٹر طاہر تونسوی

کی مراحت نہیں۔ نہ وہ کسی امر کی شعوری طور سے تردید کرتا ہے اور نہ ہی تائید۔ وہ تو لطیف انداز اپنا کر اپنے قاری کی اس نسوانی روح سے خطاب کرتا ہے جسے شعوری طور پر دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اس لئے انشائیہ نگار معلم کی مانند تعلیم نہیں دیتا اور نہ سائنس داں کی مانند نامعلوم سے معلوم کی طرف لے جاتا ہے وہ تو صرف نئے زاویوں سے کام لیکر غمزہ غماز سے چونکانے کی کوشش کرتا ہے۔" ؂۱

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اختلاف ادب کی نفسیاتی تحلیل کس چابکدستی سے کر سکتے ہیں۔ ان کے علم اور ذہن کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ جدید ترین تنقید کا وہ ہمارے یہاں پورا پورا حق کرتے ہیں۔

تنقیدی دبستان

[illegible] میں جب ڈاکٹر سلیم صاحب ایمرسن کالج ملتان میں بطور اردو لیکچرار ملازم تھے۔ ایم۔اے اردو کی کلاسوں کا اجرا ہوا حالانکہ سلیم صاحب اس وقت بہت جونیر تھے۔ لیکن سب سے مشکل سبجیکٹ "تنقید" پڑھانے کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی۔ انہوں نے اس پرچے کی تیاری میں زبردست محنت کی اور انگریزی کے ان سارے نقادوں کا براہ راست مطالعہ کیا جن کی خوشہ چینی اردو کے نقاد کرتے رہتے ہیں۔ تنقید کے ساتھ ساتھ مختلف تنقیدی دبستانوں مثلاً مارکسی تنقید، نفسیاتی تنقید، سماجی تنقید، جمالیاتی تنقید وغیرہ کے بارے میں بھی انہیں پڑھانا تھا۔ تنقیدی دبستانوں پر جب سلیم صاحب نے کتابوں کی تلاش کی تو اردو تو الگ انگریزی زبان میں بھی انہیں ایسی کوئی کتاب دستیاب نہ ہو سکی کہ جس کا مطالعہ ان کے لئے سودمند ثابت ہوتا۔ آخر مختلف کتابوں سے مواد اکٹھا کرکے انہوں نے نوٹس تیار کر لئے۔ ان نوٹوں کی اتنی اہمیت بڑھی کہ دوسرے اداروں کے طلبہ بھی ان کے طالب علموں سے نوٹس لینے آجاتے۔ بعد میں سلیم اختر صاحب کو خیال آیا کہ کیوں نہ ان نوٹوں کو کتابی صورت میں شائع کروا دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے شائع کروانے سے پہلے سارے نوٹس کو مقالات کی شکل میں دوبارہ لکھا تاکہ ان کا "نوٹس پن" دور ہو جائے اس طرح یہ کتاب شائع ہو گئی۔ ہندوستان میں بھی یہ کتاب چھپ

؂۱ ادب اور لاشعور ۔ تبصرہ نگار ڈاکٹر محمد احسن فاروقی سیپ کراچی

اورنگ زیب قاسمی

چکی ہے۔ آج کل بہاولپور اور ملتان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔

اس کتاب کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات جو سلیم صاحب نے راقم الحروف کو بتائی وہ یہ ہے۔

"میں ان پروفیسروں میں سے نہیں جو کلاس نوٹس کو تنقید کے نام پر شائع کراتے ہیں چنانچہ کوئی ایسا مضمون نہیں جو کلاس نوٹس پر مبنی ہو البتہ یہ کئی مرتبہ ہوا کہ میرے بعض ذہین طلبا نے میرے لکھوائے ہوئے نوٹس کو اپنے نام سے شائع کروایا۔"

کلاس نوٹس کے لئے ان تیاریوں سے سلیم صاحب کی ذات بحیثیت نقاد کو بہت فائدہ پہونچا ان کے تنقیدی مطالعہ کی بنیاد صحیح معنوں میں اسی زمانے میں استوار ہوئی۔

مندرجہ ذیل تبصروں سے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ محمد علی صدیقی فرماتے ہیں:

"زیر تبصرہ کتاب ایک منفرد تصنیف ہے۔ کم از کم اردو زبان کی حد تک یہ بات مسلم ہے۔ کچھ مدت پہلے اسکاٹ کی FIVE APPROACHES شائع ہوئی تھی اور اس کتاب کو بھی منفرد ہی کہا گیا تھا۔ لیکن سلیم اختر نے تنقید کے دس دبستانوں پر لکھا ہے ایک طرح سے یہ کتاب اسکاٹ کی تصنیف سے پانچ سیڑھیاں آگے ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کتاب میں شامل مضامین تنقید اور دبستان تنقید کی اقسام اور امریکہ میں تنقیدی دبستان سے صاحب تصنیف کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک تنقیدی دبستان دراصل نقاد کا وہ نظام صغریٰ و کبریٰ ہے جس سے نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ سلیم اختر کا بھی اپنا دبستان ہے اور یہ محل ایسا دبستان اور دیگر دبستانوں پر شرح و بسط کے ساتھ تنقید کا نہیں ہے کہ جگہ کی کمی اس کی اجازت نہیں دیتی پھر بھی میں ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سلیم اختر بہت سے نقادوں سے ان معنوں میں مختلف ہیں کہ وہ ہر نقطہ نظر کو اپنی خواہشات سے زیادہ اس نقطہ نظر کی معروضیت میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں غالباً ان کے لئے بھی ۲۰۰ صفحات کی اس کتاب میں بھرپور بحث تمحیص کی گنجائش مہیا نہیں ہوئی۔ لیکن اس اختصار پسندی کے باوجود انہوں نے تنقید جیسے اہم شعبہ پر کافی توجہ دی ہے۔" ؂۱

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیالات ملاحظہ ہوں:

"پروفیسر سلیم اختر اردو زبان و ادب کے استاد اور جدید فکر و نظر رکھنے والے

؂۱ تنقیدی دبستان تبصرہ نگار محمد علی صدیقی روزنامہ حریت یکم مارچ [illegible] کراچی

ایک ممتاز ادیب ہیں مصنف کی حیثیت سے بھی ان کا نام تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ان کے نام اور کام کو علمی و ادبی حلقوں میں معتبر بنا چکی ہیں۔ ادبی تنقید کے بارے میں خصوصاً ان کا مطالعہ وسیع، ان کی نظر بالغ اور ان کا شعور فکر انگیز و تجزیہ خیز ہے۔ اردو کے مختلف ادبی دبستانوں میں سے ان کا نام کئی دبستانوں کے حوالے سے لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک نفسیاتی دبستان کا تعلق ہے وہ اس دبستان کے نہایت ممتاز و معتبر نقاد ہیں۔ ایسی صورت میں تنقیدی دبستانوں پر قلم اٹھانے کا انہیں حق تھا اس حق کے مدعی اور بھی ہیں۔ لیکن اس حق کو سلیم اختر نے اپنی زیر نظر کتاب "تنقیدی دبستان" میں جس خوبی سے ادا کیا ہے وہ ابھی اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کتاب کے بارے میں پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے بہت صحیح کہا ہے کہ "پروفیسر سلیم اختر کی تازہ تالیف "تنقید جدید" کے تنوع اور وسعت کی جھلک بھی دکھاتی ہے اور ہر تنقیدی مسلک کے حصول کار کا بصیرت افروز تجزیہ بھی کرتی چلی جاتی ہے۔"

سلیم اختر کی تنقیدی تحریروں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کم سے کم لفظوں میں بڑی سے بڑی بات آسانی سے کہہ دیتے ہیں۔ ایجاز کا یہ کمال "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" اور ان کی زیر نظر کتاب میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ انہوں نے جدید تنقید کے مختلف دبستانوں پر جن میں تشریحی، تاریخی، عمرانی، رومانی، جمالیاتی، تاثراتی، سائنٹفک، مارکسی، نفسیاتی، اور تقابلی تنقید شامل ہیں۔ اتنی جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ اردو میں سردست یہ کتاب آپ اپنا جواب ہے۔ یقین ہے کہ طلبہ سے لیکر ادب کے عام قاری تک بھی اسے پسند کریں گے۔"[1]

"تنقیدی دبستان" کے ہر پہلو پر نگاہ رکھتے ہوئے اس پر جناب مرزا ادیب نے جو تبصرہ لکھا ہے اس کے کچھ حصے یہاں سپرد قلم کئے جاتے ہیں:

"اپنی معرکہ آرا تصنیف "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کے بعد پروفیسر سلیم اختر نے ایک نیا قابل قدر کارنامہ سرانجام دیا ہے اور یہ کارنامہ ہے "تنقیدی دبستان" جس میں ان تمام مکاتیب فکر کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے جن کا تعلق

---

[1] تنقیدی دبستان تبصرہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، نگار، کراچی جنوری، فروری [illegible]

اورنگ زیب قاسمی

تنقید سے ہے۔ پونے دو سو صفحات کی اس کتاب میں گیارہ کے قریب تنقیدی دبستانوں پر سیر حاصل بحث ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر تنقیدی دبستانوں کو اس کے تمام ترکیبی اجزا کے ساتھ مرکز فکر بنایا جائے تو اس کے لئے کم و بیش اسی ضخامت کی کتاب چاہئے۔ مگر سلیم اختر نے کوشش یہ کی ہے کہ ہر مکتب تنقید کے بنیادی اصولوں کی تشریح کر دی ہے تاکہ وہ طالب علم جن کے لئے یہ کتاب بطور خاص تصنیف کی گئی ہے رائج الوقت انتقادی نظریات سے واقف ہو جائیں اور مصنف اس کوشش میں بہت کامیاب نظر آتا ہے۔"

پروفیسر سلیم اختر کی تحریروں میں دو خوبیاں لازماً نمایاں رہتی ہیں ایک خوبی تو یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر بھی اظہار خیال کریں اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر رہتی ہے۔ وہ موضوع زیر بحث کا پوری طرح احاطہ کرنے کے بعد ہی اس پر گفتگو کرتے ہیں۔ اور دوسری خوبی ہے الفاظ کی کفایت شعاری۔ ان کی تحریر مختصر ہو یا خاصی طویل ہو وہ اپنی تنقید کو خواہ مخواہ پھیلاتے نہیں۔ ان کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ موضوع کے ہر گوشے پر کچھ نہ کچھ کہتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں ان کا یہ تجزیہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔ تو یہ دونوں خوبیاں جن کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے اس کتاب کے ہر مقالے میں موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر دبستان تنقید کی فہم کے سلسلے میں انہوں نے جو ذمے داری قبول کی تھی اس سے بخوبی عہدہ برآ ہو گئے ہیں۔

"سلیم اختر نے ہر ایک فکری دبستان کے باب میں جتنا مواد بھی ملا ہے اسے سلیقے سے سمیٹ لیا ہے۔ مگر اس بات کو خلاف حقیقت نہیں کہہ سکتے کہ بعض نظریات کی انہوں نے اجمالاً وضاحت کی ہے۔ اور بعض کی تفصیلاً۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ بعض نظریات کے لئے وضاحتی مواد وافر انداز میں مل جاتا ہے اور بعض نظریات کے سلسلے میں یہ بات نہیں ہے؟ پھر یہ بھی قابل توجہ مسئلہ ہے کہ کچھ نظریات تو ایسے ہیں جو بہت معروف ہیں اور کچھ نظریات زیادہ معروف نہیں اسی تناسب سے ان پر لکھا جا سکتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ مصنف کے کچھ اپنے امیال و عواطف بھی ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وابستہ ہوتا ہے۔ سلیم اختر کا اپنا میدان نفسیاتی تنقید ہے۔ اس لئے نفسیاتی تنقید پر انہوں نے دل کھول کر لکھا ہے۔ اس اعتبار سے یہ باب کتاب کا سب سے مکمل باب ہے۔"

تنقید نظریاتی ہو یا عملی اس میں ایک یا ایک سے زیادہ ایسے مقامات ضرور آتے ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ ایسے مواقع پر نقاد کی انتقادی بصیرت پر حرف اس وقت آسکتا ہے۔ جب وہ کمزور یا جذباتی دلائل سے کام لے۔ بصورت دیگر اس کا نقد و تبصرہ ذہنی بددیانتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ سلیم اختر کی بعض رایوں سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے دلائل پورے نہیں ہیں یا انہوں نے محض جذباتیت پر تکیہ کیا ہے۔ وہ مدلل بات کرتے ہیں۔ اب یہ مسئلہ کہ مصنف نے اپنی طرف سے دلائل آفرینی میں کوئی کمی نہیں کی جدا گانہ حیثیت رکھتا ہے کہ ہم ان کے دلائل کو مانیں یا نہ مانیں ہے۔ ۱

اقبال کا نفسیاتی مطالعہ

ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ کتاب جب منظر عام پر آئی تو جہاں بہت سارے لوگوں نے ان کی محنت کوشش اور ہمت کو سراہا وہیں مذہبی قسم کے لوگوں، جماعت اسلامی کے دانشوروں اور علامہ اقبال کے معتقدوں نے اس مقالے کے خلاف شدید ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ سلیم صاحب نے جب یہ مقالہ لکھنے کا ارادہ کیا تو ان کے ذہن میں یہ بات پہلے سے تھی کہ وہ ایک ایسی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ پیش کرنے والے ہیں جس کی عظمت اور تقدس کا سارا زمانہ معترف ہے چنانچہ اس نازک مرحلے پر انہوں نے ٹھوس دلائل کے ساتھ مضبوطی سے قدم بڑھایا۔ سلیم اختر نے خود ہی لکھا ہے۔

یہ مقالہ لکھنے سے پیشتر اس امر کا احساس تھا کہ علامہ اقبال کو کس تقدس کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے میں نے بہت احتیاط سے کام کیا اور جو بات بھی کی اس کی بنیاد شواہد پر استوار کی انداز تحریر سے سنسنی خیزی نہیں پیدا کی گئی بلکہ سراسر علمی نقطۂ نظر سے بات کی گئی۔ اب ہمارے یہاں مصیبت یہ ہے کہ لوگ نفسیات کو ہی تسلیم نہیں کرتے تو پھر انہیں نفسیاتی نتائج کو کیسے درست ماننا ہوتا ہے۔

اس لئے اس مقالے کے بارے میں ردعمل کا اظہار کیا گیا بھارت میں بھی اس مقالے کی بازگشت سنی گئی:

ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا بھی ارادہ تھا کہ وہ اس موضوع پر مقالہ لکھیں لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کا یہ مقالہ پڑھ لینے کے بعد انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا جب محمد حسن لاہور گئے تھے تو وہاں انہوں نے (جیسا کہ سلیم صاحب نے راقم الحروف کے سوالنامے کے جواب میں لکھا ہے) سلیم صاحب کو بتایا کہ میں خود بھی اس موضوع پر کام کرنا چاہتا تھا لیکن اس مضمون کے مطالعے کے بعد میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا کہ اس سے بہتر مضمون نہیں لکھا جا سکتا:

---

۱ مرزا ادیب ماہنامہ کتاب لاہور نومبر ۱۹۷۲ء

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر محمد حسن کی رائے کو سلیم صاحب اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتے ہیں۔

یہاں پر اس کتاب سے متعلق چند تبصروں کے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے اس تحقیقی صحیفہ میں علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کا نفسیاتی تجزیہ ایسے دلآویز اسلوب میں کیا ہے کہ یہ اپنے موضوع اور اس کے برتاؤ کے لحاظ سے سال اقبال میں شائع ہونے والی ڈھیر ساری مطبوعات میں ایک منفرد اور وقیع پیشکش کے مرتبہ پر فائز دکھائی دیتی ہے۔

علامہ اقبال کو ہمارے ادب اور معاشرے میں بجا طور پر ایک ایسا عظیم مقام میسر آیا ہے۔ جس نے قدرتی طور پر ان کی شخصیت اور ان کے فن کے گرد تقدس و احترام کا ایسا سنہرا ہالہ بن دیا ہے جس کی موجودگی پر کسی اقبال شناس کو اعتراض تو نہیں ہو سکتا مگر یہ حقیقت اپنے طور پر ہر اقبال دوست کو متردد کر سکتی ہے کہ یہ ہالہ علامہ اقبال کو اس انسان کی حیثیت میں پرکھنے اور جانچنے کے عمل میں رخنہ اندازی کر سکتا ہے جو مثبت اور منفی سبھی بشری تقاضوں کا حامل بھی ہے اور ان تقاضوں کی شناخت ہی دراصل اس کی انسانی عظمت کے صحیح خدوخال کے تعین میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے نفسیاتی اور فنی تجزیے کے سلسلے میں اس ہالہ کو کسی قسم کی رخنہ اندازی کا موقع نہیں دیا۔ ان کا انداز تحلیل و تجزیہ ایسا سائنسی ہے کہ اس نے انہیں ہر قدم پر بت پرستی سے بھی بچایا ہے اور بت شکنی سے بھی محفوظ رکھا ہے — یہ کام تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا۔ اور حق بات یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی انتقادی یافت میں تلوار کی دھار پر چلنے کے ہنر کا مظاہرہ بڑی جابکدستی سے کیا ہے۔ اس دوران میں بعض بڑے نازک مقام بھی آئے ہیں اور وہ ایسے مقامات سے اس سکوت کو ڈھال بنا کر گزر گئے ہیں جو ابلاغ و ترسیل کے حوالے سے دفتروں پر حاوی محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر وہ علامہ اقبال اور عطیہ کے مراسم کی نوعیت اور ان کے رابطوں کے نین نقش کا تعین کرتے ہوئے اور حتی الامکان معروضی طریقہ اختیار کرتے ہوئے علامہ اقبال کے اس خط کا ایک اقتباس ناظرین کے زیر مطالعہ لاتے ہیں جو انہوں نے عطیہ کو لکھا اور جس میں انہوں نے عطیہ کی دعوت جنجیرہ قبول کرنے کے لئے دوران سفر جن صعوبتوں میں سے گزرنا پڑے گا ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"......اور یہ حقیقت خوش ہے جو مجھے رستم کی شہرت دے دیں گے اگر میں ان کو

دور کروں گا۔ رستم کا انجام بہت برا تھا اور مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ میرا انجام کیا ہوگا"
اس اقتباس کی پیشکش کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر نے خود کو کسی تنقید و تبصرہ کا مکلف نہیں بنایا بلکہ ناظرین سے ایک سوال پوچھ کر جواب یوں SUGGEST کر دیا ہے۔

یہ انجام کیا ہو سکتا تھا؟ سوال اہم بھی ہے اور خطرناک بھی!
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!"

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے معروضی، منطق اور بے لاگ طرز نگارش کی بدولت جہاں نفسیات کے حوالے سے بعض ناقدین کے غلط تصورات اور ان کی غلط اطلاق کی نشاندہی کی اور ان کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا وہاں انہوں نے اقبال کے بعض شعوری یا غیر شعوری معاندین کی ان نوازشات کو بھی بے نقاب کیا ہے جو انہوں نے جذباتی شدت کے زیر اثر روا رکھیں اور یوں علامہ اقبال کے فن اور شخصیت کے سلسلے میں پیدا ہونے والی امکانی غلط فہمیوں کے ازالے کی منصفانہ کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ہم انہیں ڈاکٹر سلام سندیلوی اور سید شبیہ الحسن کے تصور نرگسیت کی درستی کرتے اور اس کے اقبال پر اطلاق کی معقول تردید کرتے دیکھتے ہیں وہاں سید حامد جلالی کی امکانی جارحیت کا عقلی توڑ بھی فراہم کرتے ہوئے مشاہدہ کرتے ہیں۔[1]

زیر نظر کتاب "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" سلیم اختر کے انداز تنقید کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

علامہ اقبال ہمارے شعر و ادب، فکر و خیال اور تہذیب و ثقافت کی ایک علامت ہیں۔ وہ علامت اس لئے نہیں ہیں کہ انہوں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارے میں جو کچھ علم حاصل کیا تھا اسے اپنی تصانیف میں انڈیل دیا ہے۔ بلکہ اس رتبہ کو پہنچنے کے لئے انہوں نے اپنی ذات میں ایک طویل سفر کیا ہے۔ اس طویل سفر میں وہ بہت سے مانوس اور نامانوس مقامات سے گزرے ہیں —— کبھی یکسر اجنبیت سے مکالمہ کیا اور کبھی سراسر اپنائیت سے سرگوشیاں۔ یہی مکالمے اور سرگوشیاں ان کی شخصیت کے تار و پود ہیں۔ سلیم اختر نے اقبال کے نفسیاتی مطالعہ میں ان کی شخصیت کے ان تار و پود کو دریافت کر کے اقبال کی گہرائی کو اجاگر کیا ہے۔

---

[1] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ تبصرہ نگار ازعارف متین نقوش لاہور ۱۹۷۸ء

اورنگ زیب قاسمی

کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ شخصیت سے متعلق ہے اور دوسرا فکر و فن سے۔ لیکن ان دونوں حصوں کے مضامین پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں حصوں میں ایک باطنی وحدت موجود ہے یعنی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے خواہ بظاہر اس میں کتنا ہی تضاد نظر آتا ہو لیکن لفظ لفظ کا جواز ان کی ذات میں موجود ہے"[1]

ڈاکٹر محمد معروف "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" پر ایک مضمون میں بیان کرتے ہیں کہ:

"اس کتاب میں انہوں نے (سلیم اختر نے) علامہ کے شعور اور تحت الشعور میں کارفرما محرکات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کی تخلیق پر روشنی ڈال سکیں اور بتا سکیں کہ وہ ایسے کون سے حالات تھے جنہوں نے اقبال کو ایک عظیم فنکار بنا ڈالا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ایسے حالات کا مطالعہ کیا ہے جو بظاہر غیر ضروری اور فروعی معلوم دیتے ہیں مثلاً اقبال کی پہلی شادی ان کا یورپ جانے سے پہلے شادی کے متعلق نظریہ اور واپسی پر خیالات۔ اس مطالعہ کے لئے سلیم صاحب نے اقبال کی عطیہ بیگم سے خط و کتابت پر دار و مدار کیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" محض ایک نفسیاتی مطالعہ ہی نہیں بلکہ ادبی تنقید کے اعتبار سے بھی ایک مکمل اور جامع تجزیہ ہے۔ اس میں جہاں انہوں نے ان نفسیاتی عوامل کی نشاندہی کی ہے جن کی بدولت اقبال ایک بلند مرتبت تخلیق کار بنے بلکہ ان کی تخلیقات کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ وہاں انہوں نے اقبال کا مطالعہ بحیثیت ایک غزل گو شاعر بھی کیا ہے۔ اقبال کی نظم کی نمایاں خصوصیات پر بحث کی ہے۔ ان کا نظریۂ فن اور تنقیدی شعور بھی زیر بحث آیا ہے اور ان کی نثر کا مزاج بھی پرکھا ہے۔ اقبال کے اقتصادی نظریات، ان کا نظریۂ پاکستان کی تشکیل میں اہم کردار، اور ملی نشاۃ الثانیہ کے نقیب کے طور پر بھی مطالعہ کیا ہے کہ کتاب اس لحاظ سے جامع اور مکمل ہے کہ اقبال لٹریچر کے نفسیاتی اور ادبی ہر دو پہلوؤں پر مختلف انواع سے بحث کی گئی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب ادبی تنقید میں اپنا نام پیدا کر چکے ہیں۔ لیکن میں ان کی اہمیت ان کی نفسیاتی تنقید و تجزیہ میں مضمر سمجھتا ہوں اور اس میدان میں وہ ابھی تک اردو ادب میں یکتا مقام رکھتے ہیں"۔[2]

---

[1] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، تبصرہ از احمد ہمدانی سیپ کراچی ۱۹۷۹ء

[2] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ کا تجزیہ از ڈاکٹر محمد معروف ماہنامہ ماہ نو لاہور اپریل ۱۹۷۹ء

اقبال اور ہمارے فکری رویے

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ اس میں سلیم اختر صاحب نے کوشش کی ہے کہ پہلے حصے میں علامہ اقبال کی فکر اور تصورات کے بارے میں انفرادی رنگ میں بات کی جائے۔ سلیم صاحب نے جب بھی علامہ اقبال کے بارے میں کچھ بھی لکھا ہے تو اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا ہے کہ جن موضوعات پر لکھا جا چکا ہے یا اب بھی لکھا جا رہا ہے جیسے مردِ مومن، تصورِ عشق، تصورِ خودی وغیرہ ان سے ہٹ کر اقبال شناسی کی ادگنا جہتیں گوشے تلاش کئے جائیں۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی جو مقالات ہیں وہ اسی نقطۂ نظر کے مطابق ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں جو مقالات ہیں ان سے سلیم صاحب کی ایک خاص لگن جھلکتی ہے۔ اس کا اظہار سلیم صاحب کے ان چند جملوں سے بھی ہوتا ہے۔

"شاید یہ خود ستائی محسوس ہو لیکن میں نے بطورِ خاص علامہ اقبال کے افکار اور تصورات کو بین الاقوامی سطح پر سمجھنے کی کوششوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس ضمن میں جتنا کام میں نے کیا ہے اور کسی اقبال شناس نے نہیں کیا۔ دوسرے حصے کے مقالات اور آخر میں دی گئی کتابیات میری اسی کاوش کی مظہر ہیں۔"

اس کتاب پر چند تبصرے نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ سجاد باقر رضوی فرماتے ہیں۔

"اقبال اور ہمارے فکری رویے"، ڈاکٹر سلیم اختر کے سلسلۂ اقبالیات کی ایک کڑی ہے اس کتاب میں کل گیارہ مضامین ہیں جنہیں دو حصوں میں علیحدہ علیحدہ ضمنی عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں چھ اور دوسرے میں پانچ مضامین ہیں۔ اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ ان میں ڈھونڈے سے بھی خودی، عشق، مردِ مومن، قومیت، جمہوریت، عورت وغیرہ کے حوالے سے اقبال کا مطالعہ نہیں ملتا۔ آخری مقالے کے ساتھ ایک کتابیات شامل کی گئی ہے جس میں چار دانگ عالم میں کلامِ اقبال کے تراجم اور ان کی شخصیت اور فکر و فن پر لکھی گئی کتب و مقالات و تقاریر کی ایک جامع فہرست درج ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے بیشتر مضامین میں کلامِ اقبال کی مختلف جہتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان سے بھی بڑھ کر ان کے مضامین کی اہمیت اس بات میں ہے کہ انہوں نے ساری دنیا میں پیغامِ اقبال اور کلامِ اقبال کی وسعت اور گہرائی کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جس محنت و کاوش سے کام لیکر انگلستان، فرانس، جرمنی،

اورنگ زیب قاسمی

اٹلی، چیکوسلاواکیہ، روس، کینیڈا وغیرہ کے اہلِ قلم اور ناقدین کے مضامین کی تلاش کر کے ان کے اقتباسات سے کلامِ اقبال کی تاثیر اور گرفت کو نمایاں کیا ہے۔ اس کے لئے یقیناً وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اسی معنیٰ میں ہم نے پہلے یہ کہا ہے کہ سلیم اختر کے یہ مضامین گلشنِ اقبالیات میں تازہ ہوا کے جھونکے کی حیثیت رکھتا ہے۔" [1]

"اقبال کو کوئی کلٹ، بنانے اور کسی چوکھٹے میں رکھ کر مطالعہ کرنے کے بجائے انہیں کھلی اور آزاد فضا میں محسوس کرنا ملک و ملت کی خدمت بھی ہے اور فن و ادب کی بھی ـــ ڈاکٹر سلیم اختر اس لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں کہ وہ اقبال کو کھلی اور آزاد فضا میں دیکھنا، محسوس کرنا اور پرکھنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس سلسلے میں ان کی پرخلوص مساعی مضامین و مقالات کی شکل میں برابر رسائل و جرائد میں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

اردو کے معروف شاعر جگن ناتھ آزاد، نے کتاب مذکور کے دیباچے میں بڑی اچھی بات کہی کہ "اقبال کو نئے زاویے سے دیکھنے اور نئے اسپرٹ کے ساتھ کام کرنے والوں میں ڈاکٹر سلیم اختر کو نمایاں مقام حاصل ہے اور اس کام میں ان کا رہنما شعوری تجربہ ہے۔ کسی کی صدائے بازگشت نہیں ـــ"۔

ہمارے یہاں اقبال کے ساتھ ان کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کا رویہ بھی عجیب ہے۔ اب یہ حکم جاری ہوا ہے کہ اقبال کو "شاعرِ مشرق" بھی نہ کہا جائے: حالانکہ مشرق شناسی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وسیع تناظر میں اقبال شناسی کی جائے کیوں کہ ادب میں اقبال شناسی کے بغیر مشرق شناسی ادھوری رہ جائے گی ـــ کتاب مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔" [2]

ڈاکٹر سلیم اختر نے "اقبال اور ہمارے فکری رویے" کی شکل میں اقبالیات میں ایک ایسی تصنیف کا اضافہ کیا ہے۔ جو اقبال کی زندگی فکر اور اقبال شناسی کے سلسلے میں لائق توجہ ٹھہرے گی۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ مفکرِ عالم کے عنوان کے تحت ہے جس میں چھ مقالے شامل ہیں۔ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں، اقبال کا لسانی شعور، جزو کل اور اقبال، اقبال اور ہمارے فکری رویے، اقبال کے اساتذہ، اور علامہ اقبال اور نیرنگِ خیال۔ دوسرے حصے صدر دستِ عالم میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ سب سے پہلا مضمون ہربرٹ ریڈ پر ہے جو انگلستان میں اقبال

---

[1] ڈاکٹر سلیم اختر ـــ بحیثیت اقبال شناس از سجاد باقر رضوی مشمولہ افکار کراچی

[2] اقبال اور ہمارے فکری رویے از ادیب سہیل افکار کراچی مارچ ۱۹۹۶ء

شناسی کے اولین قافلہ سالاروں میں سے ہیں دیگر مضامین کے عنوانات میں خاصا تنوع ہے ۔ اقبال ممدوح عالم، ایران میں اقبال شناسی کی روایت ۔ ایک فرانسیسی اقبال شناس اور اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت ،،

ڈاکٹر سلیم اختر پاکستان میں اقبال شناسی کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ انہیں اقبال شناسی کی موجودہ روش سے خاصی مایوسی ہوئی ہے ۔ اس لئے کہ اقبال پرستی نے اقبال کو ایک CULT بنا دیا ہے جس میں اصل اقبال گم ہو کر رہ گیا ہے ۔ اقبال بحیثیت انسان اور بلکہ بحیثیت ایک مرد، کیا تھا ؟ ان کی شاعرانہ فکر کے نفسیاتی سوتے کہاں سے پھوٹتے ہیں اور ان سب نے اقبال کی تخلیقی شخصیت پر کس نوع کی اثر اندازی کی ہے یہ ہیں اقبالیات کے اصل موضوعات لیکن ہوا اس کے برعکس ۔ چنانچہ خودی ، بے خودی ، تعلیم ، مرد مومن ، شاہین ، عقل و عشق جیسے متعین موضوعات پر فارمولا مضامین گھڑے جا رہے ہیں ۔ علامہ اقبال سے اپنی تمام تر خوش عقیدگی کے باوجود ہم ابھی تک صحیح اقبال کی تفہیم میں ناکام رہے ہیں ۔

سلیم اختر کی کتاب ،، اقبال اور ہمارے فکری رویے ،، کے مطالعہ سے ایک بات سامنے آئی کہ اس کتاب کے مصنف نے اپنے ذہن میں علامہ اقبال کے بارے میں جو آرا ، قائم کر رکھی ہیں ان سے سر مو انحراف گوارا نہیں کیا ہے ۔ اقبال کے فکری رویے کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں اقبال پر بعض تحریروں پر گرفت اور بعض غیر ملکی ماہرین اقبالیات کی کاوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ کتاب کے سرورق ، اقبال اور ہمارے فکری رویے کے عنوان کے تحت جس صاف گوئی کا مظاہرہ کیا ہے اس کا اطلاق خود اس کتاب پر بھی کیا جا سکتا ہے ۔ اب رہا سوال فراق گورکھپوری کے مضمون کے جواب میں سلیم اختر کے مضمون بعنوان " علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں ،، تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اگر فراق صاحب نے تصور پاکستان کے خالق علامہ اقبال پر تنقید کی ہے تو اس پر جذباتی ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ۔

زیر نظر مجموعہ اقبالیات کے شعبے میں ایک اہم اضافہ ہے اس میں مانوس فکر کی پرجوش اذعائیت کی گرمی ہے نخ بستہ ہواؤں میں جرات انکار نہ بھی ہو تو ادعائے اقرار بھی فروعی لگتا ہے چونکہ اس نوع کے اقرار سے باہمی اختلاف کے لئے گنجائشیں نکلتی ہیں ،، اقبال اور ہمارے فکری رویے ،، جس مفروضے یعنی حقیقی اقبال کی تلاش کے کام کو کے کر آگے بڑھی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کتاب سے اختلاف رائے کرنے کے لئے بھی کھلے دل سے اس حقیقت کا اعتراف کریں کہ یہ

کتاب جسارت اظہار کے حسن کو آگے بڑھاتی ہے [1]

شعور اور لاشعور کا شاعر ـــ غالب

اس کتاب میں دس مقالات شامل ہیں ۔ اس میں غالب پر کئی نئے زاویوں سے مضامین قلم بند کئے گئے ہیں ۔ سلیم صاحب سے پہلے غالب کے کلام کی روشنی میں غالب کا نفسیاتی مطالعہ چند ایک مضامین میں کیا تو گیا ہے ۔ لیکن اس موضوع پر ایک مکمل کتاب شاید پہلی مرتبہ لکھی گئی ہے ۔ اس لحاظ سے بھی اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔ سلیم صاحب کی اس تصنیف پر بہت سے تبصرے کئے گئے ہیں ۔ ان میں چند تبصروں سے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں :

،، شعور اور لاشعور کا شاعر ـــ غالب ،، غالبیات کے ذخیرے میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہے ۔ قبل ازیں مختلف ناقدین نے نفسیاتی انداز میں غالب کی شخصیت یا فن کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ کوششیں محدود ہیں اور عموماً ایک آدھ مضمون یا کسی مضمون کے جستہ جستہ حصوں سے آگے نہیں بڑھتیں سلیم اختر پہلے نقاد ہیں جنہوں نے غالب کو تفصیلاً نفسیاتی تنقید کی روشنی میں دیکھا ہے ۔ سلیم اختر نے اس سے قبل متعدد مصنفین کے کلام کا جائزہ نفسیاتی انداز تنقید کے مطابق لے چکے ہیں ۔ لیکن اس سلسلے میں غالب کا تفصیلی مطالعہ زیادہ دلچسپ اور پرکشش ہے ۔

غالب کے رشک کو اکثر اوقات نقادوں نے ان کا ایک خاص مضمون قرار دیا ہے ۔ نفسیاتی طور پر کسی مضمون کی تکرار بھی خالی از علت نہیں ۔ صاحب کتاب نے غالب کے رشک کا مطالعہ ان کی نرگسیت کی روشنی میں کیا ہے ان کی ظرافت کے بارے میں وہ بجا طور پر یہ نتیجہ نکالتے ہیں ۔ ان کی ظرافت ایک دفاعی عمل DEFENCE MIICHANISM تھا ۔ یہ بقول صاحب تصنیف ایسی نفسیاتی حالت ہے جس میں انسان دوسروں کا نشانۂ مزاح بننے سے پہلے ہی اپنے آپ پر ہنسنا شروع کر دیتا ہے ۔ غالب کی زندگی میں بے شمار محرومیاں تھیں ۔ اولاد کا نہ ہونا ، زمانے کی ناقدری ، روپے پیسے کی کمی مستقل مسائل تھے ۔ ان سب کو ٹالنے کا نفسیاتی حربہ ظرافت تھی ۔ بڑھاپے میں قویٰ مضمحل ہوئے تو اس دکھ کو بھی انہوں نے اس حربے سے گوارا بنایا ۔ غرض ڈاکٹر صاحب نے

[1] اقبال اور ہمارے فکری رویے ۔ تبصرہ از محمد علی صدیقی بشمولہ افکار کراچی

اورنگ زیب قاسمی

یورپ کے جدید ماہرین کے مطالعات سے استفادہ کر کے غالب کے نفسیاتی مطالعہ کے لیے عمدہ بنیاد فراہم کی ہے اور اس کتاب کے مطالعے سے ہم غالب کے شعور اور لاشعور کی بعض ایسی جہتوں سے آگاہ ہوتے ہیں، جن سے ہماری آشنائی اس سے پہلے نہیں تھی۔ اور کتاب کا مطالعہ غالب کے بہت سے اشعار اور مکاتیب کے بارے میں ہماری تفہیم کو زیادہ گہرا کر دیتا ہے۔" [۱]

"شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب ۱۹۸۶ء میں شائع ہونے والی نمایاں تنقیدی کتب میں ایک ہے اور اگر اسے غالب کے نفسی رجحانات کی تجزیہ کاری کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو غالبیات کے موضوع پر اس کاوش کو ایک منفرد تنقیدی معرکہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ "شعور اور لاشعور کا شاعر ۔ غالب" دراصل ڈاکٹر سلیم اختر کے ان دس مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے غالب کی شخصیت اور شاعری کے موضوع پر سپرد قلم کیے۔ خود سلیم اختر کا کہنا ہے کہ ان مقالات کے ذریعہ غالب محض بلکہ غالب مرد کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مقالات کو غالب کے لاشعور سے مصافحہ کا انداز قرار دینا چاہیے۔" [۲]

"یوں تو روزانہ سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں مگر برسوں بعد کوئی ایسی کتاب دیکھنے میں آتی ہے، جسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ کسی انسانی لمحہ میں محض اس لیے تخلیق کی گئی ہے کہ اس کی ایک ایک سطر کو نہاں خانۂ قلب و جاں میں لکھ لیا جائے۔ اور وقتاً فوقتاً زندگی سے فرصت کی مخمور ساعتیں چھین کر بار بار مطالعہ کیا جائے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی زیر نظر کتاب بھی انہیں ابدی شاہکاروں میں سے ہے۔" [۳]

"زیر نظر کتاب میں سلیم اختر کے غالب کی ذات، شاعری اور نفسیات سے متعلق دس مضامین شامل ہیں جو بقول ان کے گزشتہ بیس برس کی مدت میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے عنوان سے کسی حد تک احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے غالب کا محض نفسیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے، مگر ایسا نہیں ہے جیسا کہ میں اوپر عرض کیا ہے سلیم اختر نفسیاتی تنقید کے ہو کر نہیں رہ گئے انھوں نے مختلف نظریاتی مکاتیب سے حسب ضرورت استفادہ کیا ہے۔" [۴]

---

[۱] تبصرہ "شعور اور لاشعور کا شاعر ۔ غالب" از خواجہ محمد زکریا ماہ نو لاہور فروری ۱۹۸۶ء

[۲] " " " " " " از ڈاکٹر ظفر علی راجا بشمولہ روزنامہ مشرق میگزین فروری ۱۹۸۶ء

[۳] " " " " " " از منصور آفاقی بشمولہ ماہ نو لاہور مارچ ۱۹۸۶ء

[۴] " " " " " " از میرزا ادیب نقوش لاہور سالنامہ جون ۱۹۸۶ء

اورنگ زیب قاسمی

روزنامہ "جنگ" لاہور ۲ فروری ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں "شعور اور لاشعور کا شاعر غالب" کے حوالے سے مشاہیر ادب کی جو گفتگو شائع ہوئی ہے اس میں اس کتاب سے متعلق چند مفید رائیں پڑھنے کو ملتی ہیں ملاحظہ ہو:

"ہمارے مشہور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے اگر غالب کو شعور اور لاشعور کا شاعر قرار دیا ہے تو یہ ایک ناقابل تردید سچائی ہے۔ سلیم اختر کی نئی تصنیف "شعور اور لاشعور کا شاعر ۔ غالب" اس لحاظ سے ہماری تنقید میں اولیت رکھتی ہے کہ اس سے پہلے غالب کے کلام کا نفسیاتی مطالعہ اکا دکا مضامین میں تو کیا گیا ہے مگر باقاعدہ ایک کتاب کی صورت میں غالب کی سی بڑی شخصیت کا نفسی تجزیہ شاید پہلی بار ہوا ہے۔"

(احمد ندیم قاسمی)

"شعور اور لاشعور کا شاعر ۔ غالب" میں عظیم اردو شاعر غالب پر ایک نئے زاویئے سے نگاہ ڈالی گئی ہے۔ یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ غالب جن کی شاعری نفسیاتی اسرار سے پُر ہے ان کے اس پہلو پر آج تک کسی نے توجہ نہیں کی۔ اس سے پہلے جتنے بھی ناقدین یا ماہرین غالبیات نے غالب کے اس پہلو پر قسمت آزمائی کی ہے ان کا کام ایک آدھ مضمون سے آگے نہیں بڑھا۔ جب کہ غالب کے خطوط اور شاعری کے اس غالب ترین محرک کا تفصیلی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس جانب توجہ کر کے تفہیم غالب میں ایک نئی روایت کا اضافہ کیا ہے جو غالبیات میں ہمیشہ انتہائی انفرادیت اور اہمیت کا حامل ہے۔"

(طارق عزیز)

"ڈاکٹر سلیم اختر کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ اس شرح و بسط کے ساتھ غالب کے لاشعوری رجحانات پر بحث کی ہے۔"

(ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)

"ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "شعور اور لاشعور کا شاعر ۔ غالب" محض ایک شخصیت پر ہی کتاب نہیں بلکہ یہ ایک پوری تہذیب کے شعور و لاشعور اور ان کے تخلیقی ربط سے متعلق ہے۔"

(سراج منیر)

"مکمل غالب کا تجزیاتی جائزہ تو اب اتنا مشکل نہیں رہا کہ سینکڑوں عظیم کتابیں اس ضمن میں پہلے ہی اہل قلم کی رہنمائی کرتی ہوئی مل جاتی ہیں! البتہ غالب کو عمر کے کسی الگ خانے میں رکھ کر اس کا جائزہ یہ حقیقتاً مشکل بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے

انیس برس تک غالب کو الگ سے ایک مقالے کا موضوع بنایا ہے اور غالب کو اسد سے الگ کر کے ایک ایسے شعری سفر کی نشاندہی کی ہے جس سے غالب کی ارتقائی منازل اور اس کے بدلتے ہوئے فنی راستوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی ہے۔"

(قتیل شفائی)

تخلیق اور لاشعوری محرکات

سلیم صاحب کی یہ کتاب ایک لحاظ سے ان کی ایک اور کتاب "ادب اور لاشعور" کی توسیع ثابت ہوتی ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں تحلیل نفسی اور ادب کے باہمی رشتے کو اجاگر کرنے والے مقالے شامل ہیں۔ دوسرے میں علامت اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور تیسرے حصے میں کچھ شاعروں کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں جو مقالات ہیں وہ دراصل سلیم صاحب کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی تھیسس کا وہ حصہ ہیں جو تھیسس کی کتابی شکل میں اشاعت سے قبل طوالت کم کرنے کے لئے حذف کر دیئے گئے تھے۔

ادب اور کلچر

"ادب اور کلچر" میں متفرق موضوعات پر مقالات ہیں: اس میں بیشتر مقالات میں نفسیاتی انداز نہیں ہے اس سلسلے میں سلیم اختر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ:

"میں نے نفسیات کو کبھی بھی اندھے کی لاٹھی نہیں بنایا میں صرف نفسیات سے وہیں کام لیتا ہوں جہاں اس کے جواز کا امکان ہو۔"

اس کتاب میں فیض احمد فیض پر سلیم اختر کا ایک مشہور مضمون بھی شامل ہے۔ یہ مضمون "غالب" کراچی کے فیض نمبر میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں یہی مضمون بمبئی سے شائع ہونے والے پرچے "فن اور شخصیت" کے فیض نمبر میں بھی شائع کیا گیا۔

نفسیات اور ادب کا باہمی رشتہ

نفسیات اور ادب کے باہمی رشتے سے متعلق راقم الحروف کے ایک سوال کے جواب میں سلیم اختر صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

"اگر میں اس کا تفصیلی جواب لکھوں تو یہ ایک باضابطہ مقالے کا موضوع بن جاتا ہے تاہم میں نے اپنے مختلف مقالات میں وقتاً فوقتاً ادب اور نفسیات کا رشتہ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح میری بعض کتابوں کے دیباچے سے بھی میرے خیالات کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ فرائڈ نے تحلیل نفسی کا تصور ذہنی مریضوں کے علاج کے لئے پیش کیا تھا لیکن یہ تصور اتنا ہمہ گیر ثابت ہوا کہ پون صدی سے زیادہ کا عرصہ بیت جانے کے باوجود آج بھی اس کی اہمیت برقرار ہے۔ اس کے بارے میں بہت بحث بھی ہوئی ہے اور اس کے مخالفین کی کمی بھی نہیں ان مخالفین کی اکثریت ان جذباتی لوگوں پر استوار ہے۔ جن کے نزدیک لفظ نفسیات بذات خود ہی گناہ کا باعث ہے یا ان حضرات نے کچھ پڑھ لکھ کر اعتراضات کئے تو ان کے خیالات کی کل بساط USES AND THE ABUSES OF PSYCHOLOGY نامی کتاب تک محدود ہوتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ نفسیات کو برتنے سے پہلے اتنا مطالعہ ہونا ضروری ہے کہ اس کی حدود کا صحیح ادراک ہو سکے یہ اس لئے تاکہ نفسیاتی نقاد کو یہ علم ہو کہ کن امور میں نفسیات سے کام لیا جا سکتا ہے اور کہاں یہ ممکن نہیں۔ میں اپنے نفسیاتی مطالعے کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے نفسیاتی مطالعے کی حدود کو ملحوظ رکھ کر بات کی ہے میں نے کبھی بھی نفسیات کے علم کو سنسنی خیزی یا چونکانے کے لئے استعمال نہیں کیا! اسی لئے "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" یا "غالب کی نرگسیت" جیسے مضامین پر اگر اعتراضات ہوئے تو معترضین نے یہ نہیں کہا کہ میں نے سنسنی خیزی کی ہے۔ نفسیاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ نقاد کے لئے دیگر علوم اور فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں سے تھوڑی بہت واقفیت لازم ہے۔ اگر ایسا نہیں تو نقاد اپنے ہی علم کے پیدا کردہ تعصب کے کنویں کا پالتو مینڈک بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے نفسیات کو BALANCE کرنے کے لئے تصوف اور مارکسیت کا مطالعہ کیا تصوف نے مجھے زندگی کی مابعد الطبعی حقیقتوں کو تسلیم کرنا سکھایا اگرچہ میں نے اپنی تنقید میں بطور خاص تصوف سے کام نہیں لیا لیکن میرا ایک بہت مشہور مضمون "انا الحق" اسی دلچسپی کا مظہر ہے۔ جس طرح میں نے "انا الحق" کے نعرے کے پیچھے کارفرما جذبے کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے۔ شاید ہی کسی نے ایسا کیا ہو اور اسی لئے پاکستان کے علمی حلقوں میں اس مقالے کی گونج سنائی دے گئی۔ جہاں تک مارکسیت کا تعلق ہے تو اسے بھی میں نے احتشام حسین کی مانند اپنی تنقید کی بنیاد تو نہیں بنایا لیکن اتنا یقین ہے کہ "ادب اور زندگی"، "ادب اور معاشرہ"، اور طبقاتی کشمکش میں

اورنگ زیب قاسمی

ادب کے کردار جیسے مسائل کو میں نے اسی سے سمجھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نفسیات جاننے والے کے لئے MYTHOLOGY اور ANTHROPOLOGY– کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مجھے اول الذکر سے خاصی دلچسپی رہی ہے اور موخر الذکر کے بارے میں بھی کچھ بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کر رکھی ہے یا اس لئے ضروری تھا کہ یونگ کی نفسیات کو ان علوم کے مطالعے کے بغیر سمجھنا آسان نہیں۔ ان دنوں مجھے مافوق الفطرت OCCULT اور ESP– سے بھی کچھ شغف ہو رہا ہے۔ لیکن اس مطالعے نے میری تنقید کے بجائے میرے بعض افسانوں میں اظہار پایا ہے۔ یوں دیکھیں تو میں نے نفسیات کو ایک وسیع علم کے طور پر لیا ہے اور اس کی مختلف جزئیات کی روشنی کو اپنی تنقیدی سوجھ بوجھ میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔"

نفسیات کی طرف مائل ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے سلیم صاحب فرماتے ہیں

"میں نے اپنے بارے میں جو ایک دو مضامین لکھے ہیں ان میں کہیں ضمناً یہ بھی ذکر آیا ہے کہ مجھے نفسیات سے کیوں دلچسپی ہے اور شاید ایک دو انٹرویو میں بھی مجھ سے پوچھا گیا تھا۔ وہاں جو میں کہہ آیا ہوں اسی کو مزید پھیلا کے عرض کرتا ہوں۔ میں کالج میں فلسفے کا طالب علم تھا۔ اور یہ گھر والوں کی مرضی کے خلاف تھا۔ آج کی طرح ہمارے دور میں بھی اصل تعلیم سائنس ہی کو کہا جاتا تھا۔ چنانچہ میرے گھر والوں کی بھی یہی خواہش تھی لیکن مجھے علم تھا کہ میں سائنس نہیں پڑھ سکوں گا۔ کیونکہ مجھے ساری عمر حساب نہیں آسکا۔ اس لئے میں سائنس میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ مطالعے کا بچپن سے شوق تھا اور میٹرک تک مطالعے کا شوق اتنا پکا ہو چکا تھا کہ میں کرشن چندر، بیدی، منٹو اور ندیم کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بچوں کے رسالوں میں کہانیاں اور نظمیں بھی چھپ رہی تھیں۔ اس لئے میرا آئیڈیل پیشہ ڈاکٹر یا انجینئر کا نہیں بلکہ ایک ایسے پروفیسر کا تھا جو ہر وقت علم و ادب اور تعلیم و تدریس کے لئے وقف ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ پروفیسر بننے کے بعد یہ راز کھلا کہ اس پیشے کا علم و ادب اور تعلیم و تدریس سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال میں نے گھر والوں سے آرٹس پڑھنے کی اجازت لے لی۔ لطیفہ یہ ہے کہ میں نے ایف۔ اے میں اردو نہیں پڑھی۔ ایف۔ اے میں اکنامکس، انگریزی اور فارسی اور فلسفہ میرے بنیادی مضامین تھے۔ جبکہ اردو پچاس نمبر کے آپشنل مضمون کے طور پر پڑھتے۔ فلسفے کا مضمون دو پرچوں پر مشتمل تھا۔ منطق اور نفسیات۔ مجھے منطق سے بھی خصوصی شغف تھا— اور DILEMMA جیسے الجھے ہوئے مسائل پڑھنے میں بڑا لطف آتا بی۔ اے۔ میں میں نے فارسی

اورنگ زیب قاسمی

اور اکنامکس چھوڑ دی اور اب میں انگریزی فلسفہ اور اردو پڑھتا تھا۔ بی۔ اے میں فلسفے میں نفسیات اور اخلاقیات کے دو پرچے ہوتے تھے۔ الغرض کالج کے زمانے سے ہی میرے مطالعے کی نہج مقرر ہو گئی۔ ویسے ایک بات یہ کہ بی۔ اے تک مجھے فلسفے سے زیادہ شغف رہا جس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اگرچہ جمالیات ہمارے نصاب میں نہیں تھی لیکن میں نے اپنے شوق سے جمالیات پر بھی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ میں جب فورتھ ائیر میں تھا تو کالج میگزین "کوہسار" میں میرا ایک انگریزی مضمون A THING OF BEAUTY شائع کیا گیا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بی۔ اے تک میں اس ضمن میں کیا کچھ پڑھ چکا تھا۔ بی۔ اے تک مجھے اپنے آپ میں کچھ نفسیاتی الجھنوں کا احساس ہوا۔ اسی زمانے میں ذہنی انتشار بھی بڑھتا گیا اور مزاج میں ایک عجیب قسم کی لاپروائی پیدا ہوتی گئی۔ خود کو ABNORMAL بننے سے بچانے کے لئے میں نے تحلیل نفسی کا مطالعہ شروع کیا۔ یوں سمجھئے کہ نفسیات میرے لئے خود شناسی کا ذریعہ بنی اور پھر دوسروں کی پہچان کا وسیلہ۔ چنانچہ مدتوں تک نفسیات کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھا۔ الغرض میں نفسیات میں یوں ڈوبا کہ جب میں نے باقاعدہ لکھنا شروع کیا تو گویا یہ طے ہو چکا تھا کہ میں نفسیات کے حوالے سے لکھوں گا۔ عورت، جنس اور جذبات ہو یا تین بڑے نفسیات داں، ادب اور لاشعور، یا شعور یا لاشعور کا شاعر۔ غالب میرے لئے یہ سب میرے ایک ہی ذہنی عمل کے ثمرات ہیں۔"

دنیا کے کون کون سے اہم ادیب و شعراء اور نقاد کا مطالعہ آپ نے کیا؟ اس سوال کے جواب میں سلیم اختر صاحب لکھتے ہیں :

"جس طرح نادر پا بستہ نئے نہیں ہے۔ اسی طرح میرے مطالعے کا انداز بھی نہیں ہے۔ گزشتہ سطور میں کچھ علوم سے خصوصی دلچسپی کی وضاحت کر چکا ہوں۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ویسے ہی جی میں آیا کہ اس موضوع پر پڑھنا چاہئے۔ جیسے ایک مرتبہ خیال آیا کہ EASTHGODISS کے CULT کے بارے میں کچھ جاننا چاہئے۔ چنانچہ اس موضوع پر کتابیں پڑھ ڈالیں پھر خیال آیا کہ ZEN کے بارے میں مطالعہ کرنا چاہئے۔ سو اس پر کتابیں تلاش کر لیں اور میں بطور خاص ان مصنفین کی نشاندہی سے قاصر ہوں جنہوں نے مجھے بطور خاص متاثر کیا تاہم اناطول فرانس کے ناول "تائیس" کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا تھا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ انگریزی تراجم کے ذریعے دنیا کی بڑی زبانوں میں تخلیق کئے گئے شاہکاروں سے واقفیت حاصل کر سکوں۔ چنانچہ

روس، فرانس، جرمنی اور اٹلی وغیرہ کے شہ پاروں کے تراجم پڑھ رکھے ہیں۔ میں ان لکھنے والوں کو اچھا نہیں سمجھتا جو بلا ضرورت ادھر اُدھر کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ آدمی جو کچھ پڑھے اسے اپنے خون کا حصہ بنائے۔"

ہندوستان میں لکھی جانے والی تنقید

سلیم اختر صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ انہوں نے ہندوستانی ادیبوں کو اتنا نہیں پڑھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں پاکستان میں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ یا تو کسی دوست نے تحفتاً بھجوا دیں یا کسی ادبی جریدے میں پڑھنے کو مل گیا بس یہی صورتیں ہیں ہندوستانی ادب کی دستیابی کی۔ اس لئے وہ کسی ہندوستانی ادیب یا نقاد کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ کوئی بات کرنے سے ہچکچاتے ہیں پھر بھی اتنا تو وہ پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے کہا بھی کہ نئے ذہن کے نقادوں میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر محمد حسن، شمیم حنفی، وارث علوی کی تحریروں نے متاثر کیا۔ نفسیاتی نقادوں میں ابن فرید اور دیویندر اسر کو بھی میں نے پڑھا ہے۔ اقبال شناسوں میں میں جگن ناتھ آزاد کا معترف ہوں جبکہ محققین میں قاضی عبدالودود، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر گیان چند جین، رشید حسن خاں، کالی داس گپتا رضا اور ڈاکٹر وہاب اشرفی کا یہ جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک تحقیق کا تعلق ہے تو بھارت میں کئے گئے کام کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ لیکن جہاں تک تنقید میں جدید علوم سے استفادے یا نئے رجحانات اور میلانات کا تعلق ہے تو پاکستان کے ناقدین بہتر ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ہندوستان میں لکھے جانے والے تنقیدی مقالات تشریحی اور توضیحی نوعیت کے ہوتے ہیں جب کہ ہماری تنقید میں بہتر طور پر تجزیاتی انداز روا رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح موضوعات اور مسائل کی تحلیل و تشریح بھی ہمارے ہاں بہتر طور پر ہوتی ہے۔"

پاکستان کے قابل لحاظ نقاد

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے پاکستان میں جن نقادوں نے سلیم صاحب کو متاثر کیا ہے ان میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، محمد حسن عسکری، سلیم احمد قابل ذکر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر وحید قریشی اور جمیل جالبی کی تحریروں میں تنقید اور تحقیق کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو کی صورت میں ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے عالم نوجوانی میں شبلی کی حیات معاشقہ لکھ کر سنسنی پھیلائی تھی۔ اگرچہ وہ بعد میں اس انداز کا مزید کام نہ کر سکے میں سمجھتا ہوں کہ اگر انہوں نے بعد میں اس طرح کا انداز اپنائے رکھا ہوتا تو وہ ایک بہت بڑے نفسیاتی نقاد ہو سکتے تھے۔ محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے تنقیدی تصورات سے بالعموم اختلاف رہا ہے لیکن جہاں تک ان کے مطالعے، ذہانت اور چلبلے اسلوب کا تعلق ہے تو یہ دونوں مزیدار نقاد ہیں۔ حسن عسکری نے بھی اپنی تنقید میں کسی حد تک نفسیات سے کام لیا ہے۔ لیکن عمر کے آخری دور میں ان میں جو ملائیت پیدا ہو گئی اور رنو مسلم گینوں کے خیالات کا جس طرح سے ادب اور زندگی پر اطلاق کیا مجھے وہ قائل نہ کر سکے۔"

میری تنقید نگاری

اپنی تنقید نگاری کے سلسلے میں میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"میں پہلے بھی اپنی تنقید نگاری اور اس پر نفسیات کے اثرات کے بارے میں عرض کر چکا ہوں۔ یہاں میں اپنے طریقۂ کار کی وضاحت کرتا ہوں۔

کسی مصنف، کتاب یا تخلیق کا مطالعہ کرنے سے پیشتر اس کے بارے میں نہ تو کوئی رائے قائم کرتا ہوں اور نہ ہی کوئی تھیسس تیار کر کے اس پر تخلیق کو فٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں جب تنقید کی غرض سے کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں دوران مطالعہ جو باتیں نقاط یا خصوصیات متاثر کرتی ہیں میں انہیں الگ سے کاغذ پر نوٹ کرتا جاتا ہوں یوں ان پوائنٹس کی امداد سے میں کتاب کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں یوں دیکھیں تو میرا طریقۂ کار INDUCTIVE قرار پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے انہیں مقالات میں نفسیاتی انداز روا رکھا جہاں اس کی ضرورت تھی۔

بحیثیت نقاد میں اس بات کا قائل ہوں کہ اپنی بات کو دو ٹوک انداز سے قطعی قسم کے اسلوب میں بیان کرنا چاہئے۔ مجھے الجھے ہوئے بیانات، غیر ضروری حوالوں اور تکرار سے سخت چڑ ہے اور ایسے نقاد کو میں نہیں پڑھ سکتا۔ اگر آپ اس نقطۂ نظر سے میرے اسلوب کا مطالعہ کریں تو اس میں آپ کو نہ تو تکرار ملے گی نہ غیر ضروری تفصیلات اور نہ ہی طرح طرح کے بے معنی حوالے اور آرا۔ اسلوب کی طرح میں رائے کے اظہار کو بھی دو ٹوک بنانے کا قائل ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ گول مول الفاظ میں NON-

COMMITTAL قسم کی رائے کا اظہار اس بات کا غماز ہے کہ نقاد میں اعتماد نہیں اور وہ دو ٹوک رائے کے خطرات مول لینے کو تیار نہیں ہے۔ تنقید اور بالخصوص معاصرین پر تنقید کمزور اعصاب والے نقادوں کا کام نہیں ہے۔ نقاد کو چاہیئے کہ کھل کر بات کرے اور اختلاف رائے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ مجھے پاکستان میں جو ایک متنازعہ فیہ ادیب سمجھا جاتا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ میں اچھی بری، صحیح یا غلط جو بھی رائے ہو اس کا اظہار کر گزرتا ہوں۔

لیکن اس کے باوجود میں خود کو انتہا پسند نہیں سمجھتا۔ میرے فیصلے بالعموم توازن کے حامل ہوتے ہیں اور میں کسی صنف کے مطالعے میں ہمدردانہ رویہ اپنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

مجھے تنقید کے اصولی پہلوؤں سے نسبتاً زیادہ دلچسپی ہے اور میں نے افراد کے مقابلے میں مسائل اور مباحث کو زیادہ ترجیح دی ہے لیکن ایک بات ہے کہ جب تخلیق کا مطالعہ کیا تو اپنے اصولوں کو ملحوظ رکھ کر کیا۔ اس لئے میں ایسا نقاد نہیں کہ جس کے تصورِ نقد اور اس کی عملی صورت میں بعد ملتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح تخلیق میں ادیب کی شخصیت کی جھلک بھی ملتی ہے اسی طرح نقاد بھی خواہ غیر جانبدار یا OBJECTIVE بننے کی کوشش کیوں نہ کرے اس کی شخصیت کسی نہ کسی طرح اس کی تنقید میں اظہار پا جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر نقاد کی تنقید ملتی جلتی ہوتی۔ سب کے فیصلوں میں یکسانیت ہوتی اور یہ نہ ہوتا کہ کوئی میری طرح نفسیات کا شیدا ہے تو کوئی نفسیات سے الرجک۔ یا اگر میری تنقیدی تحریروں میں میری شخصیت کے کسی پہلو نے اظہار پایا ہے یا میری تنقیدوں سے میرا کیسا IMAGE بنتا ہے تو شاید میں اس کا جواب نہ دے پاؤں۔

اورنگ زیب قاسمی
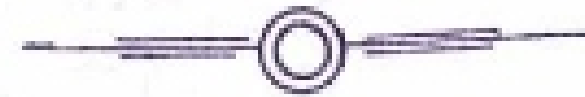
دوسرا باب

ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید

ادیب یا شاعر کی کوئی تخلیق، جسے ہم خواہ کتنی ہی کامیاب شکل دینے کی کوشش کریں دراصل اس کی شخصیت کا محض ایک عکس ہے۔ مکمل نقش نہیں، تکمیل کی جانب تو شخصیت قدم بڑھاتی رہتی ہے۔ تخلیقات اس بڑھتے قدم کی مختلف تصویریں ہوتی ہیں۔ اس لئے بنیادی اور اہم شئے شخصیت ہے۔ نہ کہ تخلیقات۔ شخصیت، ایک کتاب ہے۔ اور تخلیقات اس کے مختلف اقتباسات۔

تخلیقات تو سنگ میل ہیں کہ شخصیت نے بتدریج کتنا سفر طے کیا ہے کیونکہ اس کے بغیر شخصیت کا اظہار ادب میں ممکن نہیں۔ تخلیقات شخصیت کی ترسیل کا ایک ذریعہ ہیں۔ کوئی بھی تخلیق شخصیت کے کسی ایک زاویہ کا عکس ہو سکتی ہے۔ کسی ایک تخلیق کو، خواہ وہ کتنی ہی کامیاب ہمیں کیوں نہ دکھائی دے، شخصیت کا مکمل نقش کہہ دینا درست نہیں۔ شخصیت اپنی تعمیر کے ہر مرحلے میں کوئی نہ کوئی نیا پہلو عیاں کرتی رہتی ہے۔ اس کے ہر موڑ پر کوئی تخلیق سامنے آتی ہے۔ جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ فن کار اپنی شخصیت کے واضح اظہار کے مرحلوں میں کس کشمکش سے دوچار ہے۔ یہ کروٹیں کبھی متضاد پہلوؤں کے ابھرنے کے نقوش فراہم کرتی ہیں۔ کبھی ترقی پذیر گوشوں کی اور کبھی نقطۂ نظر کی تغیر میں مختلف میلانات کا اظہار بن جاتی ہیں اب یہ فن کار کی بتدریج رسائی اور بالیدگی پر منحصر ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے مکمل اظہار پر کس طرح قابو پاتا ہے۔ عام طور پر اس کشاکش کی طوالت کا ساتھ مادی عمر نہیں دیتی اور ہم فن کار کی شخصیت کے نقوش واضح کرنے میں اس وقت کامیابی کے قریب پہنچتے ہیں جب یا تو فن کار آنکھیں بند کر لیتا ہے یا مزید جد و جہد کے لئے خود کو تیار نہیں کر پاتا۔

شخصیت جتنی فعال، دور رس اور قیود سے آزاد ہوتی ہے اس کی گرفت فکری جہات کے گرد اتنی ہی مضبوط ہوتی ہے اور اس وقت تک اس پر گرد نہیں پڑتی جب تک کوئی دوسری شخصیت اس سے زیادہ اس سے وسیع احاطہ پر اپنی گرفت کا اظہار نہیں کرتی۔ بعض شخصیتیں بجلیوں کی طرح چمک چمک کر ماند پڑ جاتی ہیں کہ

ان کی رسائیاں دھیرے دھیرے خود ان کو توانائیوں سے محروم کر دیتی ہیں۔ بعض آنکھوں کو چند لمحو خیرہ کرکے فیوز کر جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کے کمزور تار تیز برقی توانائی سنبھال نہیں پاتے مگر تدریجاً ترقی پذیر شخصیتیں دھیرے دھیرے ان بلندیوں تک رسائی حاصل کر لیتی ہیں۔ جہاں سے کائنات قسطوں میں نظر آنے کے بجائے ایک کھلی کتاب کی مانند سامنے ہوتی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر بڑی شخصیتیں جب اپنے سفر کا جائزہ لیتی ہیں تو اپنی سابقہ کامیابیوں پر غرور یا ناقدانہ نظر بھی ڈالتی ہیں اور اپنے سفر اور مراحل سفر کو ایک نظر میں سمیٹنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ یہ سمجھ سکیں کہ منزل تک پہنچنے کی کوششوں میں ان کی کامیابی اور عدم کامیابی کی نوعیت کیا رہی۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہاں حوصلوں کو مزید جلا ملتی ہے اور تمنا کے دوسرے قدم کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔

کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو وقت کے اس غبار سے دوچار ہو کر جب توانائی کھو دیتی ہیں بجھ جاتی ہیں یا ماند پڑ جاتی ہیں تو ظاہر ہے ان کے اسباب و علل بھی ہوتے ہیں اور جن سے ان کی رفتار اور بے شعوری جستیں بھی متاثر ہوئی ہونگی۔ کیا اس صدمہ کے ازالہ کے لئے کسی اتفاق یا ہزاروں سال نرگس کے رونے کا انتظار ہی واحد حل ہے؟ دراصل ہم فن اور اس کے لوازمات پر اپنی بیشتر توجہ دیتے رہے ہیں۔ شخصیت کی تعمیر میں جو عناصر معاون ہوتے ہیں ان کی افزائش پر سنجیدگی سے توجہ نہ دے سکے۔ ادبی بصیرت کو، الہام، خدا کی دین اور ذہنی معجزہ کہہ کر اس کی آبیاری سے اپنی عدم واقفیت یا بے توجہی کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اسی انسانی نفسیات کے عقدوں کو اپنی ادبی حسیت اور ناخن فکر سے کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ خاص طور سے اس کا جائزہ لینے پر آمادہ ہوئے کہ ان کی تخلیقی کاوشوں کی پیش رفت کے اثرات کیا مرتب ہوئے ان کا انداز نظر اس بارۂ خاص میں عالمانہ اور ناقدانہ رہا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین کا خیال ہے۔

"مظاہر حیات کو دیکھنے، سمجھنے اور اس سے منکشف ہونے کا کوئی متعین طریقہ نہیں ہو سکتا تنقید کا کوئی ایسا اصول نہیں بنایا جا سکتا جو ادبی پرکھ کو فطری سائنس کے مرتبہ پر پہونچا دے۔ کیونکہ علم، شعور، ذوق اور فنی بصیرت کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اور انفرادی ردعمل بالکل یکساں نہیں ہو سکتا۔ یہ بات دونوں کناروں پر ہو سکتی ہے۔ یعنی تصنیف کی پیچیدگیاں گہرائیاں یا نارسائیاں بھی دشواری پیدا کر سکتی ہیں اور قاری یا ناقد کے ردعمل اور سوجھ بوجھ کی صلاحیتیں بھی۔ جو شخص ان تمام پر نگاہ رکھ کر شعر و ادب کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی حیثیت سے نفسیاتی طریق کار سے کام لیتا ہے یعنی لکھنے والے کے موضوع اور تخلیقی عمل کے رشتہ کی کھوج، موضوع کے انتخاب کے نفسیاتی وجوہ کی تلاش، قاری کے تاثرات کی چھان بین اور ناقد کے انداز نظر کی نفسیاتی توجیہ، ساری باتیں نفسیاتی تنقید کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ تحلیل نفسی

اورنگ زیب قاسمی

کے مختلف مکاتیب نے اس دائرے کو اور وسیع کیا ہے۔ یہاں تک کہ تخلیق کے لاشعوری عمل سے شروع کر کے نقاد کے لاشعوری ردعمل تک جتنے پیچ پڑتے ہیں ان سب کی تشریح اور تجزیہ کبھی فرائڈ کے تصورات کی روشنی میں کرنا اور کبھی ایڈلر، یونگ اور زیادہ نئے فلسفیوں کے خیالوں کے آئینہ میں ان کے خط و خال کو پہچاننے کی کوشش کرنا جدید نفسیاتی تنقید کا اصل اصول ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ جس طرح ماہرین نفسیات نے تخلیق اور تخیل ادب کو نظریہ سازی کے لئے مواد کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اسی طرح ادیبوں اور شاعروں نے طبی اور نفسیاتی معلومات اور واقعات کو شعر و ادب کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اور بعض اوقات افسانہ یا ناول نے محض کسی جنسی مریض یا مخبوط الحواس بیمار کے ہذیانات کی شکل اختیار کر لی ہے جس میں ادبی حسن مفقود نظر آتا ہے۔ مغرب کے کچھ نئے نفسیاتی نقادوں کے یہاں اولیت علم النفس کی معلومات کو حاصل ہو گئی ہے۔ ادبی مسائل اور فنی تصورات پس پشت پڑ گئے ہیں۔ اس طرح کبھی کبھی نفسیاتی ادبی تنقید انبساط پیدا کرنے کی جگہ محض نفسیاتی معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ متوازن نفسیاتی ادبی تخلیقی فنی طریقہ کار کے سمجھنے میں بہت مفید ہوتی ہے اس لئے کوئی اچھا نقاد اسے یکسر نظرانداز کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب اس کا مقصد محض بعید از قیاس تلازمات اور علامات میں معنی پیدا کرنا رہ جاتا ہے۔ تو یہ تنقید ادبی پرکھ اور تعین اقدار کے لئے کسی بھی حالت میں کارآمد نہیں کہی جا سکتی۔

یوں تو ہر قسم کے تنقیدی اظہار خیال میں کوئی نہ کوئی نکتہ ایسا نکالا جا سکتا ہے جس کی بنیاد میں نفسیات کی کارفرمائیاں ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نفسیاتی تنقید کا باقاعدہ ارتقاء عہد جدید ہی میں ہوا ہے۔[1]

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "نفسیاتی تنقید" جو سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اور مختلف عنوانات کے تحت مختلف زاویوں سے ادب کو نفسیاتی پس منظر میں ڈھالنے دیکھنے اور جانچنے اور سمجھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ابواب اس طرح ہیں۔

نفسیاتی تنقید کے ابتدائی نقوش۔ اس باب میں موصوف کا خیال ہے کہ:۔

" اردو میں تنقید نفسیاتی ہو یا غیر نفسیاتی، جب بھی اس کی تعریف یا ارتقائی مدارج

---

[1] اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر از ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی۔ پیش لفظ پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم) ص [illegible]
مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سنہ [illegible]

سے ممیز ہوگی۔ آغاز ہمیشہ تذکروں سے ہوگا۔ تذکرہ تنقید کی وہ عجیب و غریب صورت ہے جو صرف فارسی اور اس کے زیر اثر اردو ہی سے مخصوص رہی ہے جدید انتقادی بحثوں کے تناظر میں تذکروں کی تنقید کو تنقید تسلیم کرتے ہوئے بھی اس حقیقت سے صرف نظر ممکن نہیں کہ تذکروں کی صورت میں اردو تنقید نے جنم ہی نہ لیا ہو۔ بلکہ گھٹنوں چلنا بھی سیکھا۔ بلاشبہ تذکروں کو اردو تنقید کے عہد طفلی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔" ؎

اس باب میں جہاں انہوں نے نفسیاتی تنقید کی بنیادیں تلاش کی ہیں وہیں انہوں نے نفسیاتی علوم سے متعلق ترجمہ شدہ کتابوں سے بھی رجوع کیا ہے۔ بلکہ ان کا ذکر کرکے ہی اردو دنیا کی طرف آتے ہیں۔ اردو میں تذکرہ کا تذکرہ کے بعد انگریزی تنقید و ادب کے جو اثرات اردو تنقید پر پڑے اس پر بھی سلیم اختر نے نہایت موثر ڈھنگ سے گفتگو کی ہے اور اس کا خیال رکھا ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ اردو میں جن نقادوں کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب کے باب اول میں کیا ہے۔ ان میں مرزا رسوا، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور وحیدالدین سلیم کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن (دہلی) کی مرتب کردہ کتاب "مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات" (مطبوعہ علی گڑھ) کے حوالہ سے خاص طور پر اس کا ذکر کیا ہے۔ اور عبدالرحمٰن بجنوری کی "محاسن کلام غالب" اور "باقیات بجنوری" نامی کتابیں ان کے پیش نظر رہی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی اس کتاب میں تعمق نظر کا ثبوت دیا ہے۔ نفسیات کی ادبی معنوں میں اصطلاح کے چلن کو بھی ڈاکٹر سلیم اختر کی تحقیق کے مطابق مرزا رسوا ہی نے رائج کیا۔ مرزا رسوا کی کتاب جو ۱۹۲۳ء تک ایک ترجمہ شدہ درسی کتاب (مبادی علم النفس) رہی ہے۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ علم النفس کو ناقص سمجھتے ہوئے "نفسیات" کی اصطلاح وضع کی گئی۔

دوسرا باب بھی اس کتاب کا کافی معلوماتی اور دلچسپ ہے انہوں نے اس باب میں لاشعور سے بحث کی ہے۔ خاص طور سے فرائڈ سے قبل لاشعور کا تصور کیا تھا اور پھر یہ لفظ بطور اصطلاح کیسے استعمال ہوا اور پھر ادب میں اس اصطلاح اور مفہوم کا کیا مقصد اور مطلب ہے۔ انہوں نے مختلف ادیبوں کی ابتدائی نگارشات میں لاشعور کے عناصر تلاش کئے ہیں خصوصیت کے ساتھ مصنف لانسلاٹ لا وہائٹ (LANCELOT LAW WHYTE) کی کتاب "THE UNCONSCIOUS BEFORE FREUD" کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے بعد فرائڈ کے نظریۂ لاشعور ادب میں اس نظریہ کا اطلاق وغیرہ پر کافی پرمغز بحث کی ہے۔ بعد ازاں موصوف اردو ادیبوں پر لکھتے ہیں۔

میراجی کو بالعموم نفسیاتی تنقید کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ واضح کیا

؎ نفسیاتی تنقید از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۹۴

جا چکا ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا کے تنقیدی مراسلات، اور وحیدالدین سلیم کی بعض تحریروں کی صورت میں اردو میں نفسیاتی تنقید کی قدیم ترین مثالیں نظر آتی ہیں۔" ؎

یوں سلیم اختر کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ میراجی کو تنقید کے نفسیاتی دبستان کا معلم اولیں ماننے کو تیار نہیں۔ البتہ اس دبستان میں ان کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں اس لئے میراجی پر دوسرے نقادوں کی بہ نسبت اپنی اس کتاب میں کچھ زیادہ صفحات میں جگہ دی ہے اور انہیں جدید شعری تنقید کا مورث قرار دیتے ہیں۔ میراجی کے بعد جن اہم نقادوں کا ذکر موصوف کی ضخیم کتاب میں نظر آتا ہے۔ اس میں قیام پاکستان سے پہلے کے ادیبوں میں اختر اورینوی، رفیق الزماں خاں، منظر عزیز، حرب اللہ، وجیہہ الدین، بشیشور دعثمانی، قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں ڈاکٹر وحید قریشی، ریاض احمد، محمد حسن عسکری، سلیم احمد۔ ہندوستان کے نئے تنقید نگاروں میں نفسیاتی تنقید کے ذیل میں جو نام آسکتے ہیں وہ یہ ہیں۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی اور دیوندر اسر، شکیل الرحمٰن، شمیم الحسن وغیرہ۔

اس کتاب کا تیسرا باب "تنقید اور اجتماعی لاشعور" سے بحث کرتا ہے۔ اور ژونگ کے تصور ادب ژونگ کی ادبی تنقید، اور ژونگ کے اثرات اردو ادیبوں پر کیسے ہوئے۔ ان میں خاص طور سے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، سجاد باقر رضوی، کا ذکر کرتے ہیں جو ژونگ سے متاثر ہو کر تنقید لکھتے رہے۔ ایک جگہ اس باب میں تحریر کیا ہے۔

"جہاں تک ادبی تنقید کا تعلق ہے تو ژونگ نے اپنے وضع کردہ نفسیاتی نظریات کی روشنی میں ان کی تحلیل و تفہیم کے لئے ایک مخصوص تصور کی تشکیل کر کے اجتماعی لاشعور کو ان کا ماخذ قرار دیا ہے۔ فرائڈ اور دیگر معاصر ماہرین نفسیات کی مانند ژونگ بھی ادب اور نفسیات میں گہرے رابطے کو تسلیم کرتے ہوئے یہ سمجھتا تھا کہ تخلیق، تخلیق کار، تخلیقی عمل کی تفہیم اور تحلیل نفسی کے لئے نفسیات کو کامیابی سے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔" ؎

اس کتاب کا چوتھا باب "انفرادی نفسیات کی انتقادی اہمیت" سے بحث کرتا ہے۔ جس میں فرد کی وحدت پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ایک مختصر سا اقتباس :۔

"نفسیات کے ادبی تنقید پر اثرات کے لحاظ سے فرائڈ اور ژونگ کے نظریات عہد آفریں ہی نہ ثابت ہوئے بلکہ نفسیاتی تنقید میں دو جداگانہ دبستانوں کی تشکیل کے موجب

؎ نفسیاتی تنقید از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۴۴

؎ " " " " " ص ۱۸۶-۱۹۶

اورنگ زیب قاسمی

بھی ہے۔ یہی نہیں بلکہ نزاعی حیثیت کے باوجود ان نظریات کی اہمیت اور مقبولیت میں کمی نہیں ہوئی۔ ان نظریات نے ادبی تنقید کے ساتھ ساتھ خود ادب' ادب سے وابستہ تخلیقی عمل اور ادیب کی شخصیت کے نفسیاتی مطالعے ایسے اہم اور بنیادی مسائل کے لئے رہنما اصول بھی مہیا کئے۔

"اس معیار پر جب ایڈلر کی انفرادی نفسیات کو پرکھیں تو خاصی ناامیدی ہوتی ہے۔ حالانکہ احساس کمتری کا نظریہ، جدید نظریات کے اہم ترین نظریات میں شمار ہوتا ہے۔ ایڈلر کی نفسیات میں سماجی تقاضوں کو بھی بطور خاص ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ایڈلر نے بطور خاص نفسیات اور سماج کے باہمی رابطے کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے نظریات نے ادبی تنقید کو بطور خاص متاثر نہ کیا۔ اس کی ایک وجہ تو خود ایڈلر کے اپنے انداز نظر میں مل جاتی ہے۔ اس کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ فرائڈ اور ژونگ کی مانند نہ تو اسے ادب سے گہری دلچسپی تھی اور نہ ہی اس نے اپنی نفسیات میں ادب و نقد کے مسائل سے خصوصی شغف ظاہر کیا۔ ایڈلر نے انفرادی نفسیات کی اساس "فرد کی وحدت" پر استوار کی اور "ہر طرح کے اعصابی خلل کو احساس برتری کے ذریعہ اپنے احساس کمتری سے چھٹکارے کا انداز سمجھا جاسکتا ہے۔" [1]

اس سلسلے میں ایڈلر "عضوی خامیوں کا بطور تخلیقی محرک جائزہ" بھی لیتا ہے۔ یہاں پر سلیم اختر نے میرزا ادیب اور عبدالعزیز خالد کی مثالیں پیش کی ہیں کہ میرزا ادیب لنگڑا کر چلتے ہیں بچپن میں ایک حادثہ اس کا سبب ہے پاؤں کی اس خرابی سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ صحرا نورد جیسے کردار تراشتا ہے اور اسے شہر کی وسعتوں سے صحرا کی خاک چھنواتا ہے اور اس سے میرزا ادیب کی تسکین ہوتی ہے۔ اسے شہرت ملتی ہے اسی سے دوسری خوشی اور تسکین حاصل ہوتی ہے۔ کوئی عضوی کمی کو اپنی کہانیوں یا تخلیقات میں مکمل اور زائد شخص یا کردار پیش کرکے عضوی کمزوری کا بدلا تلاش کرلیتا ہے۔

اس طرح عبدالعزیز خالد ہکلا کر بولتا ہے جس سے وہ احساس کمتری میں مبتلا رہتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی شاعری میں عربی، فارسی، انگریزی کے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتا ہے۔ شاید جواز یہ ہو کہ میں بول نہیں سکتا اور تم مجھ جیسی شاعری کر نہیں سکتے۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے ایڈلر کے فلسفے سے متاثر صرف ایک نقاد کا نام لیا ہے اور وہ ہیں حیات اللہ انصاری! اور وہ اس طرح کہ حیات اللہ انصاری نے ن۔ م۔ راشد کی کتاب "ماورا" (شعری مجموعہ) پر تبصراتی انداز میں ایک مختصر سی کتاب

---

[1] نفسیاتی تنقید از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۱۳ باب چہارم

اورنگ زیب قاسمی

عکس اور بقول سلیم اختر:

"اردو کی نفسیاتی تنقید میں یہ غالباً پہلی کتاب ہے جس میں احساس کمتری کے تصور سے خصوصی استفادہ کرتے ہوئے کسی ایک شاعر کی شخصیت کی نفسی اساس دریافت کر کے اس کی روشنی میں ادبی نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔" [1]

باب پنجم اس معنی میں اہم ہے کہ اس میں مختلف اصناف سخن کا یا تو تقابلی مطالعہ نفسیات سے کیا گیا ہے یا ان مروجہ اور غیر مروجہ اصناف میں اس کے عناصر تلاش کئے گئے ہیں ان میں ادیب کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ بطور خاص قابل توجہ ہے اس بے حد اہم اور نزاعی مسئلے پر گزشتہ اوراق میں بھی روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ نفسیاتی تنقید کے مباحث میں بعض اردو ادیبوں نے بھی حصہ لیا جس میں محمد حسین آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد، میراجی وغیرہ کی مثالیں دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ فن کار اور فن کا بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جس پر نفسیاتی فلسفیوں نے بھی زور دیا ہے۔ نفسیات کا تعلق اردو کے مختلف اصناف سخن سے کتنا ہے یہ باب بھی مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس باب کے آخر میں ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے کہ

"اس باب میں اسلوب اور علم بیان کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی بعض اصناف کا نفسیات کی روشنی میں جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اب منطقی طور پر تخلیقی شخصیات ہی کا نفسیاتی مطالعہ باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ ایسا اہم اور متنازعہ فیہ بلکہ خطرناک موضوع ہے کہ مختلف شخصیات کے حوالے کئی تحقیقی مقالات قلمبند ہو سکتے ہیں۔ گو ہماری مشرقی روایات کے تحت بزرگوں کو تحلیل نفسی کے محدب شیشے میں رکھنا معیوب ہے اور اسی لئے قدیم شعراء کے بارے میں ایسا مواد موجود نہیں ہے جس کی امداد سے ان کا نفسی کوائف نامہ مرتب کیا جاسکے لیکن ایسی شخصیات کی کمی نہیں جن پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے لکھا جاسکتا ہے۔ بلکہ ان پر کام کرنے کی ضرورت بھی ہے۔" [2]

باب ششم، نفسیاتی تنقید کا طریق کار سے بحث کرتا ہے۔ طریقہ کار سے مراد یہ ہے کہ اس کے آغاز، انجام اور سب سے بڑھ کر اس کے حدود کیا ہیں اس کا آغاز کس طرح ہو۔ اس کے لئے ہم خام مواد کہاں سے مہیا کریں اس ضمن میں سلیم اختر نے مشورہ دیا ہے کہ نفسیاتی تنقید کے مطالعہ کے سلسلے میں سوانح عمری،

---

[1] نفسیاتی تنقید از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۲۳ باب چہارم

[2] 〃 〃 〃 〃 ص ۲۷۷/۲۷۶

خود نوشت سوانح عمری، خطوط اور ڈائریکٹ سے مدد لی گئی ہے اس باب میں سلیم اختر نے تنقید کے مختلف دبستانوں سے اس کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ مارکسی تنقید اور نفسیاتی تنقید کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مارکسی اور نفسیاتی تنقید دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ دونوں کو ایک بہت وسیع اور پیچیدہ نظام فکر کی ضمنی پیداوار قرار دیا جا سکتا ہے۔ کارل مارکس کی اشتراکیت اور فرائڈ، ایڈلر، یا ژونگ وغیرہ کے نفسیاتی تصورات اپنے اساسی مقاصد کے لحاظ سے ادبی یا انتقادی نہ تھے۔ مارکس نے اپنا نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کے لئے پیش کیا تھا۔ جب کہ فرائڈ، ایڈلر اور ژونگ نفسیاتی معالجین تھے۔ لیکن ہر دو نظریات کی ہمہ گیری اور آفاقیت کا یہ عالم ہے کہ آنے والوں نے ان کی روشنی میں نہ صرف زندگی کے دوسرے شعبوں اور علوم کے تصورات کے ساتھ ساتھ ادب و نقد اور فکر و فن میں بھی نئے چراغ فروزاں کئے۔"[1]

اس سلسلے میں ڈاکٹر اختر اورینوی کی رائے بھی قابل توجہ ہے:

"لیکن بعد کے غور و فکر، تحقیقات و مشاہدہ کے نتیجے میں یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ زندگی کو حرکت دینے والی کوئی بھی تنہا جہات نہیں۔ نہ معاشی، نہ جنسی اگر ہم انتہا پسند ہوں تو پھر یہ بات صاف ہے کہ مارکس، فرائڈ کے نظریہ کو رد کرتا ہے اور فرائڈ مارکس کے نقطۂ خیال کی تردید پر تلا ہوا ہے۔"[2]

گویا یہ باب بھی اپنی افادیت کے لحاظ سے بے بہا ہے اور بقول سارتر، مارکس اور فرائڈ کے درمیان پل تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

باب ہفتم میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو ادیبوں اور شاعروں کے تخلیقی فن پاروں سے کچھ عملی مثالیں پیش کی ہیں۔ خاص طور سے غالب کے کلام سے زیادہ مثالیں پیش کی گئی ہیں اور غالب شناسی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا گیا ہے۔ گرچہ خود سلیم اختر کا دو مضمون، اقبال کے کلام میں نفسیاتی عناصر، جوش کا نفسیاتی مطالعہ اس لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ اور شعراء کے کلام کے حوالے سے جو باتیں سلیم اختر نے کی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلیم اختر جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ سلیم اختر نفسیاتی تنقید کے مستقبل سے خاصہ پُرامید اور مطمئن ہیں۔

---

[1] نفسیاتی تنقید از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۳۰۸

[2] نفسیاتی تنقید پر ایک نظر مشمولہ قدر و نظر از اختر اورینوی پٹنہ ص ۱۲۱ ۱۹۵۴ء

اورنگ زیب قاسمی

ادب اور لاشعور

شعور اور لاشعور کی بحث نفسیات کے سلسلے سے کافی پرانی اور طویل ہے۔ لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے اس موضوع کو ایک نئے لب و لہجہ سے روشناس کرایا ہے۔ اس کتاب سے پہلے موصوف کی ایک کافی ضخیم کتاب "نفسیاتی تنقید" منظر عام پر آ چکی ہے اور نفسیات اور ادب سے متعلق بعض بڑے اہم مباحث کو سمیٹ چکی ہے۔ لیکن یہ کتاب بھی افادیت کے لحاظ سے گرانقدر ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:-

"پروفیسر سلیم اختر نفسیات کے طالب علم ہیں مگر انہوں نے ذہنی عوارض کے محرکات کو نفسیات کے آزاد تلازمۂ خیال یا خوابوں کے تجزیئے کی مدد سے منظر عام پر لانے کے خالص طبیبانہ رویے کی بجائے تخلیق میں مضمر بعض علامات اور لفظ و خیال کے بعض لطیف پیکروں کے مطالعہ سے خود تخلیق کار کی شخصیت کے مخفی تار و پود کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے اس اقدام میں سلیم اختر صاحب نے تخلیق کار کی شخصیت کے سماجی رخ سے کہیں زیادہ اس کے باطنی رخ سے سروکار رکھا ہے۔ یوں لگتا ہے ان کے پیش نظر یہ کام ہرگز نہیں تھا کہ وہ تخلیق کے حکیمانہ تجزیے سے معلوم کریں کہ تخلیق کار کس قسم کے عوارض میں مبتلا ہے۔ بلکہ انہوں نے تخلیق کے تجزیے سے تخلیق کار کے تخلیقی باطن کو منکشف کرنے کی سعی کی ہے۔ جو ادبی تنقید کے سلسلے میں ایک نہایت مستحسن اقدام ہے۔"[1]

فن کار کے باطن میں نفسیات کی عینک سے دیکھنے کی روایت مغربی تعلیم کے ذریعہ آئی اور اس کا اطلاق ادب پر بھی ہوا۔ اس سلسلے میں وزیر آغا مزید لکھتے ہیں:-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ نفسیات کو انیسویں صدی کے یورپ میں اہمیت دینا شروع ہو گئی تھی مگر بحیثیت مجموعی انیسویں صدی تیقن اور اعتماد کی صدی تھی اور اس صدی کے انسان کی شخصیت اس قدر مجری ہوئی تھی اور اس کے ہاں اشرف المخلوقات ہونے کا احساس اس قدر غالب تھا کہ ماہرین نفسیات کے لئے کچا مواد ملنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔ ایسے میں علم النفس کو کس طرح فروغ مل سکتا تھا؟"

---

[1] ادب اور لاشعور از سلیم اختر دیباچہ ڈاکٹر وزیر آغا ص ۷، مطبوعہ مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۶۶ء

مگر انیسویں صدی کے زوال کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے انکشافات ہوئے کہ مغرب کے انسان کی ساری
خود اعتمادی اور سالمیت کا احساس پارہ پارہ ہوگیا۔ جس طرح کوپرنیکس نے زمین کی مرکزی حیثیت
کے تصور کو غلط ثابت کر کے اپنے زمانے کے اذہان کو ایک ذہنی دھچکا پہونچایا تھا۔ بالکل اسی
طرح ڈراون اور اسپنسر نے انسان کو بہشت سے دیس نکالا پانے والی غیر ارضی مخلوق کے بجائے
اسے حیواتی زندگی کی ایک ترقی یافتہ صورت قرار دے کر انسان کا رشتہ جانور سے جوڑ دیا اور
یوں اس کے اشرف المخلوقات ہونے کے تصور کو پاش پاش کر دیا۔ یہ ایک کربناک صورت حال
تھی جو بیسویں صدی کے مغربی انسان نے گویا ورثہ میں حاصل کی۔ ایک طرف اس کی صدیوں پرانی
روایت تھی، اقدار اور ادب اور جذباتی رویے تھے۔ دوسری طرف علم کی حدود ایک دھماکے کے
ساتھ پھیل گئی اور انسانی جذبے کی رجعت اور فہم کی ترقی کے عین درمیان خلا پیدا ہوا اس معلق ہو
کر رہ گیا۔ ۱؎

نفسیاتی تنقید کا دبستان بہت قدیم نہیں لیکن قلیل عرصہ میں جس طرح تحلیل نفسی نے انسانی سوچ کا رُخ بدل
دیا۔ اور مذہب، معاشرہ اور اخلاق۔ جمالیات کے اصولوں میں نئے انقلاب کا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اسی
نفسیاتی تنقید بھی اصناف ادب اور تخلیقی سانچوں میں بعض اساسی تبدیلی کا موجب بن کر اظہار و ابلاغ کے متنوع
ت کے لئے سامان فراہم کرنے کا سبب بنی۔ نفسیاتی تنقید کی اساس پہلے فرائڈ کا نظریہ لاشعور رہا اور پھر اس
ژنگ اور ژونگ کی تعلیمات سے مزید گہرائی پیدا کی گئی۔ اور یوں نفسیاتی تحقیقات کا دائرہ کار پھیلتا رہا۔
اس طرح نفسیاتی تنقید کا ایک الگ دبستان قائم ہو گیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ جیسے ادب، مسائل، اصناف، ادب جن
افراد یا اداروں کا تعلق ہے سب سے پہلے اس سے بحث کی گئی ہے۔ جیسے ادب اور فحاشی، ادب اور خواتین، یوں
کا ادب اور نفسیات۔ دوسرے باب جو ادب میں پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیوں کی طرف نظر ڈالی گئی
ہے اور پیدا ہونے والے مسائل پر غور و خوض کیا گیا ہے۔ جیسے تخلیق کار کی انبار طلبی، ادب اور ابلاغ،
ادب اور زبان، مقصد، یا افادہ وغیرہ۔

تیسرے حصے میں نفسیاتی دبستان کے پس منظر میں ادب کی مختلف اصناف سے اس کا تعلق ظاہر کیا
گیا ہے۔ جیسے تنقید، غزل، مرثیہ، انشائیہ، مصوری اور اعصابی خلل وغیرہ۔

۱؎ ادب اور لاشعور از ڈاکٹر سلیم اختر مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۶ء دیباچہ ڈاکٹر وزیر آغا ص ۸

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کہتے ہیں:-

"دیگر تنقیدی دبستانوں کے مقابلے میں نفسیاتی نقطۂ نظر اس لئے زیادہ اہم
اور قابل اعتماد ہے کہ بعض مشہور دبستانوں جیسے مارکسی، عمرانی اور تاریخی وغیرہ میں ادب
اور زندگی کے جن پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے وہ یک رُخے ... ہی نہیں بلکہ انسانی شخصیت
کے تشکیلی محرکات اور باطنی میلانات سے عدم دلچسپی کی بنا پر اس گہرائی سے بھی محروم رہتے ہیں
جو انسانی شخصیت کا خاصہ ہے .... خارجی زندگی کے جن خارجی پہلوؤں پر تنقیدی ارتکاز
میں بطور خاص زور دیا جاتا ہے اگر ان کی عمومیت کی تحلیل کرتے جائیں تو بالآخر اساس بننے
والے اس بنیاد تک پہونچیں گے جو خارج اور باطن کے درمیان نقطۂ اتصال بھی بنتا
ہے اور وجہ امتیاز بھی۔" ۱؎

آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ "ادب کے مقصد کا قاری کے لئے ہمیشہ ہی باعث افادہ ہونا ضروری
نہیں۔ ہاں مقصد و افادہ میں ہم آہنگی ہو جائے تو کیا کہنے۔ اس صورت میں مصنف کا مقصد ہی اس کا افادہ
قرار پاتا ہے۔ جب کہ قاری کا افادہ مقصد میں مضمر ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر سلیم اختر خود اپنی نفسیاتی تنقید کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"جب میں نے نفسیات کی روشنی میں تنقید کا آغاز کیا تو ایک مقصد خاص رکھ کر یعنی ادب اور
اس سے وابستہ اہم مسائل اور تخلیقی اصناف کا نفسیات کی روشنی میں یوں تجزیاتی مطالعہ کیا جائے کہ اس
تنوع کی واحد مثال اساس اجاگر ہو جائے۔ بظاہر یہ ادب، مسائل اور اصناف کے عنوانات تلے جمع
کئے گئے متفرق مقالات ہیں کچھ طویل تو کچھ مختصر۔ لیکن انفرادی حیثیت میں مکمل ہونے کے باوجود پہلا مقالہ
کا دوسرے مقالے سے معنوی رابطہ برقرار رہتا ہے یوں یہ ایک موضوع کی کتاب بن جاتی ہے۔ موضوع ہے
.. ادب اور لاشعور، اور اس کے باہمی اثر پذیری سے جنم لینے والے تنوع کے سلسلے در سلسلے۔ گویا یہ مختلف
مقالات جو ایک جگہ افادہ کی غرض سے جمع کر دیے گئے ہیں۔"

جوش کا نفسیاتی مطالعہ ——— اور دوسرے مضامین

"جوش کا نفسیاتی مطالعہ" سے قاری کو اس کتاب سے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔

۱؎ ادب اور لاشعور از ڈاکٹر سلیم اختر پیش لفظ ص ۱۴ ناشر مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۶ء

اس لئے کہ اس کتاب میں "جوش کا نفسیاتی مطالعہ" صرف ایک مضمون ہے۔ پوری کتاب جوش سے متعلق ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اور دوسرے مضامین میں سے بعض دوسرے بھی نفسیاتی تجزیے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے "ادب اور لوک ادب: نفسیاتی تناظر" (۲۲) "اپنی لگن اور اپنی جلن اور اپنی چبھن کی مستی" ([illegible]) "کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ" (۴۵) "مجید امجد کی غزل کا روپ سروپ" (۵۸)۔ ان مقالات کو سلیم اختر نے نفسیاتی اور شخصی نقطۂ نظر سے پرکھا ہے لیکن چند مقالات ایسے بھی ہیں جن کو انہوں نے آزادانہ طور پر بغیر کسی ازم کے لکھا ہے۔ جیسے مولانا حالی (۹۹) ظفر علی خاں بطور مترجم (۱۴۷) نیاز فتحپوری ([illegible]) عقل، مذہب اور مسلمان، پاکستانی ادیب کی ذمہ داری ـــــ پھر بھی ڈاکٹر سلیم کے مقالات کو نفسیاتی تنقید کی عینک لگا کر نہ بھی پڑھا جائے تب بھی پڑھنے سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور چہرہ منور۔

"جوش ملیح آبادی کا نفسیاتی مطالعہ" میں جوش کی شاعری سے بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ ان کی مشہور زمانہ سوانح عمری "یادوں کی بارات" سے بحث کی گئی ہے وہ لکھتے ہیں :-

"یادوں کی بارات" کی صورت میں جوش نے اپنی جو سوانح عمری مرتب کی ہے اس میں نفسیاتی اہمیت کا اتنا مواد جمع ہے کہ اس سے جوش کی شخصیت کی نفسیاتی اساس کی دریافت بآسانی کی جا سکتی ہے۔ "یادوں کی بارات" میں جوش نے جس طرح خود کو بے نقاب کیا ہے، یوں EXPOSE ہونے کے لئے جس جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ فرائڈ کی AN AUTO BIOGRAPHICAL STUDY سے لگایا جا سکتا ہے۔ نظریہ تحلیل نفسی کا بانی اور لاشعور دریافت کرنے والا فرائڈ اپنی اس خود نوشت میں اپنی محبوبہ کا نام تک درج نہیں کرتا اور اس کے مقابلہ میں جوش نے کس والہانہ انداز سے اپنی معشوق لڑکیوں اور لڑکوں کا ذکر کیا ہے "۔ [1]

اس مضمون سے سب سے اہم بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے جوش کی نثر کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے جو قابل توجہ ہے۔ "یادوں کی بارات" کو ہم لوگوں نے بھی ہندوستان میں پڑھا اس میں جوش کی نثر کی الگ تخلیقی شان ہے۔ جو ان کے دوسرے ہم عصر شعراء اور ادباء کے یہاں نہیں ہے۔ اور اپنی اس کتاب میں جوش نے ہر ممکن طریقے سے اپنا قد اونچا کرنے کی کوشش کی ہے۔

"کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ" میں مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب "فلسفۂ الہیات" کا نفسیاتی مطالعہ

---

[1] جوش کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۵ مطبوعہ فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ لاہور

اورنگ زیب قاسمی

پیش کیا گیا ہے۔ کسی ادیب شاعر اور فن کار کی شخصیت کا مطالعہ نفسیات والوں کے لئے خاصا اہم ہے اور اسی کے ذریعہ ادب میں فن کار کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اس عنوان کے تحت سلیم اختر صاحب لکھتے ہیں۔

"انسانی شخصیت کا عالم بھی کچھ عمارت جیسا ہے جیسے اینٹ کر کے ایک مستحکم عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ لیکن وہ زلزلے کے ایک ہی جھٹکے سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔ کچھ یہی حال انسانی شخصیت کا بھی ہے۔ انسان جذبات، احساسات اور ہیجانات کے ساتھ اس کی تشکیل کرتا ہے اس میں آرزوؤں کے دیپ روشن کر کے تمناؤں کے خوش رنگ کھلونوں سے اس کی تزئین کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تکمیل ذات کا خواب لئے عمر بھر کی جد و جہد کے جوے میں خوشی خوشی جتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن ایسا سموم جھونکا آتا ہے کہ سب ختم "۔ [1]

اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ بھی یہی ہوا ان کی شخصیت بکھر گئی اس لئے کہ ان پر جنون اور دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور اپنے وقت کا بہت بڑا عالم، ناقد اور محقق، فکر نو کا داعی اور مقرر اردو کا سب سے بڑا صاحب اسلوب انشا پرداز بھی دیوانگی کے جھونکے سے نہ بچ سکا۔ لیکن انہوں نے لکھنا بند نہیں کیا جا ہے وہ جو بھی لکھ رہے ہوں لوگ ان کی تحریروں میں دلچسپی لے رہے تھے۔ اور جملوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر رہے تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کا زمانے کی تحریروں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس پر روشنی ڈالی۔

"اپنی لگن اور اپنی جلن اور اپنی چبھن کی مستی" میں جمیل الدین عالی کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

"جب میں نے جمیل الدین عالی کی غزلیں، دوہے، گیت، اور لا حاصل کا مطالعہ کر کے آنکھیں بند کیں تو میرے ذہن میں اشعار نے جو تصویر مرتب کی وہ کچھ یوں تھی۔ ایک شخص ہے جس کا رنگ کرشن کنہیا جیسا ہے۔ جس کے ماتھے پر سیندوری تلک چمک رہا ہے۔ اس نے بسنتی جوڑا پہن رکھا ہے اور ایک ہاتھ میں کھڑتالیں ہیں جنہیں وہ عجیب محویت کے عالم میں بجا رہا ہے۔ میں اور غور سے دیکھتا ہوں تو موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں سرخ ڈورے ہیں اور سُرمے کی گہری لکیر۔ ہونٹوں پر پان کا لاکھا ہے اچانک نگاہ نیچے ہوتی ہے تو دیکھتا ہوں کہ اس نے امپورٹڈ کپڑے کی بہت اچھی پتلون

---

[1] کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ مشمولہ جوش کا نفسیاتی مطالعہ از سلیم اختر ص ۷۴

ابھی کٹنگ والا ہیر لگا ہے۔ اور پاؤں میں ولایتی کپڑے کے شوز ہیں۔ دوسرے ہاتھ میں کنگھی ہے جس
سے وہ کسی ماڈرن ہیر سیلون میں تراشے گئے بال سیٹ کرتا نظر آتا ہے اور مچھر آنکھوں پر وہ طلسمی عینک
جو اسے دنیا کو کسی اور ہی رنگ میں دکھاتی ہے اور دنیا کو بھی اس کے شیشوں میں سے آنکھوں کی چلبولیاں
کے بدلتے زاویے نظر نہیں آتے۔ ان میں سے ایک سوانگ ہے اور ایک حقیقت مگر ہم
یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ حقیقت کہاں ختم ہوتی ہے اور سوانگ کہاں شروع ہوتا ہے۔"[۱]
عالی کی شاعری کے سلسلے میں سلیم اختر کا خیال ہے کہ۔

"اس کی تخلیقی شخصیت اپنے لئے وہ مضبوط زمین نہیں تلاش کر سکی۔"[۲]

اور دوہے نے ان کی غزلیہ شاعری کو کافی نقصان پہونچایا لیکن وہ پاکستان کے ہی دوسرے
شاعر انشا سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر پاکستان میں گنگا جمنا کا سنگم دیکھنا ہو تو انشا جی کے شبد اور
عالی جی کے اشلوک پڑھو۔"[۳]

ادب اور لوک ادب: نفسیاتی تناظر" ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک منفرد مقالہ ہے۔ جس میں انہوں نے
لوک ادب کے مستقبل کے سلسلے میں نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"درختوں، پرندوں، اور پھولوں سے یہ جذباتی رابطے، انہیں اپنا ہمدرد
دوست، اور غم گسار جاننا اور ان سے شگون لینا یہ سب ANIMISTIC اور بعض
صورتوں میں TOTEMISTIC بھی ہیں۔ اب ان کے ساتھ اپنی قدیم داستانوں کو ذہن
میں لائیے جہاں درخت ہیرو کو پناہ دیتے ہیں۔ پرندے گفتگو کرتے اور راہ کی مشکلات کی نشاندہی
کرتے، آندھیوں میں جن آتے۔ اور بگولوں میں شہزادیوں کو اڑا لے جاتے ہیں۔ بیتال اور
اگیا بیتال کی صورت میں آگ بھوت بن کر ناچتی ہے۔ یہ سب داستان طرازوں
کے ضرورت سے زیادہ زرخیز تخیل کی ضمنی پیداوار نہ تھا اسی ASIMISIM. کے
اثرات تھے جو اجتماعی لاشعور کی وساطت سے تخیل کا روپ پا کر تخلیقی سطح پر اظہار کر پائے؟"

۱؎ ایک لگن اپنی جلن اور اپنی چبھن کی مستی۔ مشمولہ مضمون جوش کا نفسیاتی مطالعہ ص ۶۶
۲؎ ، ، ، ، ، ص ۷۲
۳؎ ، ، ، ، ، ص ۷۳

تھے۔ یوں دیکھیں تو یہ سب جداگانہ، منفرد اور ایک دوسرے سے منقطع نہ دکھائی
دے گا بلکہ لوک گیت، قدیم داستانیں، اور جدید شاعری مل کر جس MOSAIC
کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی سے ہماری تخلیقی نفسیات کے خط و خال نمایاں ہوتے ہیں۔
لہٰذا لوک ادب کو محض پینڈو ادب نہیں سمجھنا چاہئے۔ نہ ہی ان گیتوں کا یہ مصرف
ہے کہ پیشہ ور عورتیں ٹیلی ویژن پر آ کر اسے عوامی کلچر کے نام سے پیش کریں۔ یہ اس لئے
بھی نہیں ہیں کہ غیر ملکی معزز مہمانوں کے سامنے انہیں جائے کے ساتھ بطور پیشری پیش کیا
جائے۔ آلودگی اور ملاوٹ کے اس دور میں لوک گیت ہی اب خالص رہ گئے ہیں ان
کی فرحت بخش سندرتا اور کوملتا ہماری قوم کے مضمحل اعصاب کے لئے باعث تقویت
بن سکتی ہے۔"[۱]

"مجید امجد کی غزل کا روپ سروپ (صفحہ نمبر ۵۹) کے متعلق سلیم اختر لکھتے ہیں۔

"تنہا انسان اور اگر وہ انسان تخلیقی فن کار بھی ہو تو ہجوم میں رہتے ہوئے
بھی جس نفسی کرب سے دوچار ہوتا ہے اس کی تخلیقی شخصیت پر اس کے رد عمل میں
خاص تنوع ملے گا۔ اگر یہ احساس تنہائی مریضانہ صورت اختیار کرے تو جس طرح کہ
ریشم کا کیڑا اپنی ساختہ قبر میں سو جاتا ہے کچھ اسی طرح مریضانہ تنہائی کا شکار اپنے
واہموں کے سرابوں کے دوزخ میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ لیکن تخلیقی فن کار کا معاملہ
برعکس ہوتا ہے کہ تخلیقی صلاحیتیں اس کی سائیکی کو بنجر منطقے میں تبدیل نہیں ہونے
دیتیں۔ بلکہ ارتفاع پذیر ہو کر یہ اس کے لئے ایسے مرتفع مقام کی صورت اختیار کر لیتی ہے
جہاں سے وہ سب کو یوں دیکھتا ہے کہ ان میں شامل ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ رہتا
ہے اور بلاشبہ مجید امجد بھی ایسا ہی تخلیقی فن کار تھا۔"[۲]

"کیا آج نیاز فتحپوری کی ضرورت ہے"؟ اس ضمن میں سلیم اختر کی رائے یہ ہے۔

"ہمارے ہاں، جس طرح مُلائیت نے مذہب کے خیر کی پہلوؤں کو
پس پشت ڈال کر اسے ایک جامد DOGMA کی صورت میں پیش کیا ہے اور اس

۱؎ ادب اور لوک ادب۔ مشمولہ جوش کا نفسیاتی مطالعہ از سلیم اختر ص ۸۸
۲؎ مجید امجد کی غزل روپ سروپ مشمولہ جوش کا نفسیاتی مطالعہ ص ۶۶

اورنگ زیب قاسمی

کے نتیجے میں مذہب کے نام پر جس طرح سے منفی رویوں کو فروغ دیا جاتا ہے۔ وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے بارے میں صراحت کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔ لوگوں کی اکثریت ان باتوں کو سمجھتی تو ہے لیکن خوف آمیز مصلحت کی بنا پر خاموشی میں عافیت تلاش کرتی ہے۔ نیاز فتحپوری کے علم، تنقید، شاعری، افسانے سب کو بھول جایئے مگر کیا ان کی جرأت کردار اور جرأت اظہار فراموش کرنے کی چیزیں ہیں؟ نہیں بلکہ آج کل تو ان کی ضرورت اور بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے! اس لئے اگر کوئی مجھ سے سوال کرے کہ آج نیاز فتحپوری کی ضرورت ہے؟ تو میں بلا جھجک غیر مشروط اثبات میں جواب دے سکتا ہوں۔" [1]

اس مجموعہ کا ایک عمدہ مقالہ "عقلی رویے اور مسلمان" ہے (ص ۱۸۷) جب مسلمانوں کے ساتھ عقلی رویے کی بات شروع ہوتی ہے تو سرسید کی یاد آتی ہے۔ حالی کی یاد آتی ہے۔ اور بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد آتی ہے لیکن ان کی یادیں بھی ہمیں سکون اور اطمینان نہیں بخش رہی ہیں بلکہ بے قراری میں اضافہ کر رہی ہیں۔ اس کا حال سلیم اختر کی زبانی سنئے۔

"سرسید ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک تحریک اور عہد کا نام ہے۔ سرسید کو نیچری، کرسٹان، بے دین، دہریہ اور کافر ہر طرح کے القابات سے نوازا گیا اس سے ان کی مخالفت میں شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی کے بعد سرسید نے جن حالات میں اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا، ان کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔ سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا سبب ان کے مذہبی معتقدات تھے مثلاً وہ سائنس اور مذہب میں مغایرت نہ دیکھتے تھے۔ آیات کی تفسیر میں سائنس کے جدید نظریات سے استفادہ کے قائل تھے۔ بالفاظ دیگر بدلے ہوئے حالات کے مطابق نئے علم الکلام کی بنیاد رکھ رہے تھے کہ مذہب کی تشکیل نو کے داعی تھے۔ ظاہر ہے کہ کہنہ رسومات اور توہمات کو دین سمجھنے والوں کے لئے ان کے تصورات غیر اسلامی معلوم ہوتے تھے۔ برصغیر میں سرسید کی تحریک کو بحیثیت مجموعی عقلیت کی تحریک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد معاشرتی

[1] کیا نیاز فتحپوری کی ضرورت ہے مشمولہ جوش کا نفسیاتی مطالعہ ص ۱۹۶

تہذیبی، تمدنی، ادبی، تعلیمی اور دینی اصلاح تھی۔ لیکن یہ اصلاح ماضی کے حوالوں سے نہیں بلکہ مستقبل کے تقاضوں کے مطابق تھی۔ اور اسی لئے انہوں نے اس کی اساس عقل پر استوار کرنے کی کوشش کی۔ سرسید یہ سمجھتے تھے کہ اب برصغیر میں مسلمانوں کی حیات و بقا کا انحصار شعور زیست، اور شعار زات میں تبدیلی پر ہے۔ اور انگریز کی برتری کیونکہ مسلم حقیقت تھی۔ اس لئے انہوں نے مغرب پرستی کا درس دیا جس سے اس عہد کے شکست خوردہ، احساس محرومی، اور احساس کمتری کے شکار مسلمان ان کے اور زیادہ مخالف ہو گئے وہ مغرب کی سائنس، ایجادات اور فیکٹریوں کی برتری کا دور تھا۔ اس لئے سرسید نے ان سے جنم لینے والے فلسفہ حیات میں عقل دیکھی اور اسی سے ان کی تحریک کا داخلی تضاد واضح ہوتا ہے۔ جس تک ان مخصوص حالات میں سرسید کی نگاہ نہ جا سکتی تھی۔ اکبر اور شبلی نے کسی حد تک انہیں محسوس کیا لیکن وہ سرسید کے مقابلہ میں زیادہ مثبت لائحہ عمل پیش کرنے پر قادر نہ تھے۔ اس لئے اس عہد کی تمام عقل پسندی کو حالی کے موٹو "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کی صورت میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

سرسید تحریک کے داخلی تضاد کو علامہ اقبال اپنے فلسفے اور تجزیاتی ذہن کی امداد سے سمجھنے میں کامیاب رہے انہوں نے مغربی زندگی کا مطالعہ بھی کیا تھا اس لئے وہ خود اس زندگی کے متناقض پہلوؤں سے بھی آگاہ تھے۔ چنانچہ جیسے جیسے ان کے شعور و عرفان میں وسعت اور گہرائی آتی گئی، وہ مغرب اور مغرب پرستی کے خلاف آواز بلند کرتے گئے اور ہمارے ہاں مغرب کی عظمت کے حق میں سائنس، ٹیکنالوجی، جمہوریت اور عقل پسندی کے جو بت بن چکے تھے، علامہ اقبال نے ان سب کو ہدف تنقید بنایا۔ اس ضمن میں انہوں نے عقل بمقابلہ عشق کا جو تصور پیش کیا اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا علامہ زندگی میں سرے سے عقل کی اہمیت سے ہی منکر تھے، مذا ایسا ہے اور نہ علامہ ایسے فلاسفر سے اس نوع کی سطحی جذباتیت کی توقع رکھنی چاہیئے۔

علامہ اقبال نے ہر موقع پر عقل کی محدود حیثیت کو واضح کیا ہے۔ واضح رہے کہ سرسید کی مانند اور ان سے بھی زیادہ معتزلہ (دور عباسیہ کا ایک عقلیت پسند فرقہ) کی مانند علامہ اقبال بھی اسلام کی تشکیل جدید کی سعی میں تھے۔ وہ ایک طرف جہالت اور توہمات کے جھاڑ جھنکاڑ صاف کر کے اسلام کے چشمے کی طہارت

بحال کرنا چاہتے تھے۔ تو دوسری طرف خود اسلام کو کل زندگی کے جدید تقاضوں کا ترجمان دیکھنا
چاہتے تھے۔ اس ضمن میں وہ ان مغربی تصورات سے بھی خائف تھے۔ جو تعلیم، سیاست
عقل پسندی کے نام سے فروغ پا رہے تھے ان حالات میں ان کے پاس اس کے علاوہ
کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ عقل کی صورت میں مغرب کی بنیاد کو ہدف تنقید بنائیں۔ لیکن عقل کے
توڑ کے لئے وہ کم عقلی کا پرچار تو کرنے سے رہے اس لئے انہوں نے عشق اور وجدان کا
سہارا لیا کہ ان سے وابستہ مابعد الطبعی مفاہیم مسلمانوں کے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتے
تھے یوں عقل کا نعم البدل بھی مل گیا اور ایک الگ فلسفہ بھی مرتب ہو گیا۔" ؎

اس کتاب (جوش کا نفسیاتی مطالعہ) میں دوسرے مضامین اور رکھے ہیں جس میں انا لحق (۲۵)
میں منصور حلاج کے واقعات کو تاریخی حوالوں سے بیان کیا گیا ہے۔ مرثیہ عہد بہ عہد (۸۹) میں مرثیہ
کی تاریخ بتائی گئی ہے اور جدید تناظر میں اسے پیش کیا ہے۔ حالی کی دکان (۱۱۲) حالی پر ایک
معلوماتی اور پر تکلف خیال آرائی ہے۔ جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حالی کے یہاں نثر و نظم سے متعلق
تمام موضوعات موجود ہیں۔ "پاکستانی ادیب کی ذمہ داری" (۱۲۷) میں ادیبوں کے معاشرے
میں فرائض سے بحث کی گئی ہے۔ "سائنسی معاشرے میں ادب" (۱۵۰) ایک معلوماتی مضمون ہے
جس میں سائنس اور ادب کا دلچسپ مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں بطور مترجم (۱۶۷)
اپنے عہد کے ایک بلند پایہ اخبار نویس تھے۔ لیکن سلیم اختر نے ان کو بحیثیت مترجم کے ان کی ترجمے
کی خدمات میں جائزہ لیا ہے۔ تخلیقی تعطل (۱۹۷) ادب میں جمود اور اس کے متعلقات سے باتیں
کی گئی ہیں۔

"جوش کا نفسیاتی مطالعہ" ایک معنی میں ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید نگاری کے مختلف شیڈ کو
پیش کرتی ہے۔ اور ایک کثیر الجہت اور کثیر المطالعہ ادیب کی حیثیت سے وہ سامنے آتے ہیں۔ یہ ایک
خوش آئند بات ہے کہ اردو کا ایک ادیب مختلف موضوعات پر اظہار خیال کی صلاحیت رکھتا ہے اور
زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔

؎ عقل رویے اور مسلمان مشمولہ جوش کا نفسیاتی مطالعہ از سلیم اختر ص ۹۶-۱۹۵
ناشر فیروز سنز لاہور

اورنگ زیب قاسمی

تیسرا باب

تفہیم اقبال اور ڈاکٹر سلیم اختر نفسیاتی پس منظر

اقبال کا نفسیاتی مطالعہ

ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو تنقید پر جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں ان میں تنوع بھی ہے اور پائیداری بھی۔
ڈاکٹر سلیم اختر کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ تنقید، افسانہ، نفسیات، طنز و مزاح اور ترجمہ
ان سب میں موصوف نے اپنی جودت طبع کی فنکاری اور ذہنی اپج کا مظاہرہ کیا ہے۔ بلاشبہ اس
وقت وہ اردو کے اہم ترین ناقدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ موصوف نے گزشتہ چند برسوں سے اقبالیات
میں خصوصی طور پر توجہ دی ہے جس کا ثبوت ان کے مقالات اور کتابیں ہیں۔ علامہ اقبال کی شخصیت
اور فکر و فن کے علاوہ ان کے نفسیاتی رویوں پر حاصل موصوف نے گہری معنویت کے مقالے پیش کئے
ہیں یہی وجہ ہے کہ اقبال شناسوں نے انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا ان کی کتابیں اقبالیات میں اہم اضافے
کی صورت رکھتی ہیں اس لئے کہ موصوف نے اقبال پر کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے پاکستان میں جب
علامہ اقبال کا سال اقبال منایا جا رہا تھا تو ۱۹۷۷ء میں انہوں نے اقبال کے مطالعے کے موضوع پر سب سے
زیادہ کتابیں پیش کیں اور اقبال کے چاہنے والوں سے خراج تحسین وصول کیں۔
ڈاکٹر سید عبداللہ نے ڈاکٹر سلیم اختر سے متعلق اپنی گراں قدر رائے ظاہر کیا ہے:

"پروفیسر سلیم اختر ادب اردو کے مؤرخ اور نقاد کی حیثیت سے اب اچھے معروف
اور مقبول ہیں کہ ان کا تعارف مسلمات کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔ ان کے تنقیدی
شعور میں علم اور عقل کی سنجیدگی کا امتزاج ہے اور ادب کی تاریخ نگاری سے ان کی
خاص دلچسپی ظاہر کرتی ہے کہ ان کی واقعاتی حس بڑی تربیت یافتہ ہے۔"

سلیم اختر نے اقبال شناسی کی وادی میں قدم رکھا ہے۔ اور اقبال کا نفسیاتی مطالعہ کے نام سے ہمیں علمی وادبی تحفہ دے رہے ہیں۔ اس کتاب میں اقبالیات کے قارئین کو ایک جگہ مطالعہ کا اتنا سامان مل جائیگا جس کے لئے اب تک اقبال شناس ہفت خواں رستم طے کیا کرتے تھے! اس میں دانش اقبال سے متعلق ہر اہم مباحث کا لب لباب موجود ہے۔ شخصیت اقبال کا نفسیاتی تجزیہ سلیم اختر کی انسان شناسی اور اعتراف عظمت کے ساتھ ساتھ، بہ حیثیت انسان، ان کے خصائص ذہنی و ذوقی کا سراغ لگایا گیا ہے۔ اور جلوت کے ساتھ خلوت کے احوال سے بھی روشناس کرایا ہے،، [1]

پروفیسر محمد عثمان رقم طراز ہیں :

سلیم اختر نے جرأت سے کام لیا جو علامہ اقبال کے نفسیاتی مطالعہ کا بیڑا اٹھایا۔ وہ بہت توازن اور احتیاط سے لکھنے والے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں مجھے یوں لگا کہ اُن کا قلم وضع احتیاط سے کچھ زیادہ ہی رُک رُک گیا۔ حالانکہ انھیں زیادہ پر اعتماد ہونا چاہیے تھا۔ اس سے ان کا مطالعہ اور دلچسپ ہو جاتا۔ لیکن جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ بھی نہایت دلچسپ، وقیع اور قابل قدر ہے۔ اس لئے کہ جو موضوع اور گوشے تشنہ رہ گئے ہیں مجھے یقین ہے کہ بہت جلد کوئی سلیم اختر سا نفسیات داں ان گوشوں سے سیر حاصل بحث کرے گا تاہم اس راہ میں اب جتنا بھی کام ہوگا۔ سلیم اختر کی پہل تسلیم کی جائے گی اور تنقید اقبال میں ایک نئی جہت کی دریافت کا سہرا ان کے سر رہے گا،، [2]

کسی فن کار کے درون میں اترنا اور فن کار کی تخلیقات سے اس کے اندرونی گوشوں شعور اور لاشعور میں جھانکنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ سلیم اختر نے یقینی طور پر اس ضمن میں محنت کی ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے لکھا ہے :

،، آئی۔ اے۔ رچرڈس (I.A. RICHARDS) نے نفسیاتی قدروں پر بحث کرتے ہوئے آدمی کو مختر خیال کہا ہے اور خلوت میں انجمن کی تلاش کی ہے۔ قدر اور ابلاغ،، کا مطالعہ اپنے مخصوص نفسیاتی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ تنقید کی تھیوری کی بنیاد قدر

---

[1] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از سلیم اختر حاشیہ پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی گراں قدر رائے۔

[2] " " " " " " پیش لفظ از پروفیسر عثمانی ص ۱۱

اورنگ زیب قاسمی

اور ابلاغ پر قائم کی ہے۔ اندرونی احساسات کے تغیر اور ارتقاء، نفسیاتی کشمکش، تاثرات، ذوق اور جذبات کا عمل، داخلی توازن، بنیادی تحریکات، وجدان کی قدر، اقدار کی افادیت، جبلی رجحانات، مسرت اور پیکر تراشی، اور ابلاغ کی پیچیدگی، الفاظ اور احساس، لہجہ اور مقصد ان تمام باتوں کا ایک اچھوتا اور دلچسپ مطالعہ سامنے آتا ہے۔

اس سلسلے میں رچرڈس کے مخصوص خیالات یہ ہیں۔

" ایک اچھا تخلیقی ادب، فن کار کے نروس سسٹم یا نظام عصبی کی نفسیاتی تنظیم کرتا ہے۔"

" فن کار کی شخصیت کے لئے نفسیاتی تنظیم کی ضرورت ہے اور اس نفسیاتی تنظیم سے شخصیت بیدار ہوتی ہے۔ اسے قدر کا احساس ہوتا ہے۔"

" شاعری اور ادب تنقیدی نظام عصبی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اقدار کی وضاحت کے لئے کسی مخصوص اخلاقی یا مابعد الطبعیاتی نظریے کی ضرورت نہیں۔"

" پسندیدگیوں کی جس تنظیم سے جذبات انسانی کا کم سے کم حصہ مجروح ہو وہ افادی ہے۔ اس لئے اقدار کی اضافیت اور ذہن انسانی میں انتشار کے بعد توازن کی اہمیت پر غور کرنا چاہیے۔"

" اچھا قاری جانتا ہے کہ کسی تخلیق کا مطالعہ کس طرح کیا جائے مطالعہ کے لئے ادراک کی مدد بھی ملتی ہے۔"

" فن کار ابلاغ کی تکمیل کرتا ہے اور قاری اپنے دماغ کو اس کیفیت سے ہم آہنگ کرتا ہے جس میں تخلیق ہوئی ہے۔"

" قاری کی شخصیت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اچھا ادب فن کار کی نفسیاتی تنظیم تو کرتا ہے لیکن ساتھ ہی قاری کے نروس سسٹم یا نظام عصبی کی نفسیاتی تنظیم بھی کرتا ہے۔"

" فن کار کے ذہن میں کسی احساس کی تعمیر آہستہ آہستہ ہوتی ہے اور قاری اس احساس کی مکمل صورت سے یک بیک آگاہ ہوتا ہے۔ اس لئے قاری کو اس احساس سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنے ادراک سے کام لینا چاہیے۔"

" آرٹ، ترسیل، اظہار اور ابلاغ کی سب سے عظیم صورت ہے۔ فن کار اور زبان کا تعلق شعوری اور غیر شعوری کیفیتوں سے ہے۔ سنجیدہ تخلیقات میں اکثر ابلاغ کی قدر کو غلط مسئلہ سمجھنے سے نتائج اچھے نہیں ہوتے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کچھ فن کار ابلاغ کی قدر

پر بہت سوچتے ہیں، یہ سوچتے ہیں کہ مختلف حلقوں کی ذہنیت پر الفاظ کے کیا اثرات ہوئے اور کیا اثرات ہوں گے۔ سنجیدہ فن کار ان تمام باتوں کو ذہن سے دور رکھتے ہیں جو فن کار اور شعرا ابلاغ کے پہلو کو علیحدہ حیثیت دے کر ان باتوں کو سوچتے ہیں وہ بہت اونچے درجے پر نہیں جاتے۔

ابلاغ کے تعلق سے اس حقیقت پر غور کرتے ہوئے یہ بھی کہنا چاہیے کہ ابلاغ کو علیحدہ حیثیت نہ دیتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر ابلاغ کی حیثیت متعین ہو جاتی ہے۔ فن کار کے اچھے تجربوں اور اچھی قدروں کا یکساں احساس دوسروں میں ہوتا ہے اور اس طرح ابلاغ سے جاگرتی پیدا ہوتی ہے پڑھنے والوں میں ایک ذہن کی تشکیل ہوتی ہے۔ رجحانات اور انسانی عمل، لاشعور اور نظام عصبی کی حرکتوں کا مجموعی تاثر اس کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ غیر شعوری عمل سے ابلاغ کی قدر کا احساس ہوتا ہے اور یہی اسلوب کی کامیابی ہے۔

شاعر اور فن کار کے غیر شعوری محرکات بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن تنقید میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ ماہرین تحلیل نفسی ذاتی تسلسل، ذہنی عوامل، اور ذہنی ردعمل کو جتنی بھی اہمیت دیں کسی شاعر کے لاشعور کو تحقیق کا میدان بنانا خطرے سے خالی نہیں۔ کسی نظم یا کسی تخلیق میں لاشعور کا عمل بہت زیادہ رہتا ہے، لیکن صرف کسی 'تخلیق'، کے ذریعہ فن کار کے ذہنی امر و عمل کو اہمیت دینا سمجھنا اور اندرونی حرکت کا اندازہ کرنا خطرناک بات ہے۔" [۱]

اس سے پہلے کہ ہم نفسیات کے اصولوں اور نفسیاتی معلومات اور عام نفسیاتی حقائق اور تحلیل نفسی اور آرٹ اور تنقید پر بحث کریں، ایک بنیادی بحث کو پیش نظر رکھیں اور اس موضوع پر سوچیں کہ ادب کی باطنی قدریں مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ نفسیات براہ راست کردار، ذہن اور پورے وجود کی باطنی زندگی سے دلچسپی لیتی ہے۔ اور تحلیل نفسی سے اس زندگی کا تجزیہ ہوتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ باطنی اور داخلی قدروں کو سمجھنے میں نفسیات ہماری مدد نہ کرے؟ ایک بنیادی حقیقت پر غور فرمائیے ماضی کی تمام ناکامیاں اور شکستیں اور حال اور مستقبل کے تمام پیچیدہ حقائق اور مسائل فطری اعتبار سے نفسیاتی ہیں؟ ان تمام شکستوں، حقیقتوں اور مسئلوں کے بارے میں یہ کہنا غلط تو نہ ہو گا کہ فطری طور پر یہ نفسیاتی ہیں۔ ہاں سماج کی نئی تشکیل مستحکم بنیادوں کی فکر اور پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کی کوشش یہ سب فطری طور پر بہت حد تک اخلاقی ہیں اور ان کا تعلق معلومات اور تجربے سے ہے۔ سماج کی نئی تشکیل کا مسئلہ

---

[۱] ادبی قدریں اور نفسیات از شکیل الرحمٰن ص ۱۲۴ - اور ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰۔ ناشر معصوم پبلی کیشن سری نگر ۱۹۶۵ء

اورنگ زیب قاسمی

اخلاقی مسئلہ ہے۔ اس لئے سماج کی بنیادوں کے استحکام کا خیال اخلاقی اور عمرانی خیال ہے۔ اور تمام پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کی کوشش ایک اخلاقی کوشش ہے۔ اس فکر، اس خیال اور اس کوشش میں اخلاقی ہیجانات کو زیادہ سے زیادہ دخل رہتا ہے۔ مگر افکار و نظریات سے ان کا بہرحال ایک گہرا رشتہ ہے۔ اور نفسیات اخلاقی ہیجانات کا بھی مطالعہ کرتی ہے اور افکار و نظریات کو بھی پرکھتی ہے اس معنی میں یہ بھی داخلی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کا ہر عمل، اس کی ہر فکر، اس کی ہر سوچ، اس کا ہر خیال اور اس کی ہر خواہش خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی "نفسیاتی نظرت" رکھتی ہے اب ہم تو ذرا اس بات پر غور و فکر کر سکتے ہیں کہ سلیم اختر نے اس اعتبار سے اقبال کی فنی کاوشوں کا کس طرح جائزہ لیا ہے۔ پہلے نفسیاتی تنقید کے سلسلے میں سلیم اختر کی رائے جان لیں:

"نفسیاتی تنقید اور بعض دیگر اسالیب نقد جیسے رومانی، تقابلی، یا تشریحی وغیرہ میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ان سب نے ادبی مباحث سے جنم لیا جب کہ ان کے برعکس نفسیاتی تنقید نفسیات کے علم کی ضمنی پیداوار قرار دی جا سکتی ہے اور بقول ڈاکٹر محمد اجمل "جدید نفسیات میں شخصی تصورات کا رجحان اسے ادب اور فن کے بہت قریب لے آتا ہے۔ میکانکی تصورات والی نفسیات ادب اور فن کو بھی "آشنا" کی نظر سے نہیں دیکھتی وہ ہمیشہ ان سے بیگانوں کا سا سلوک روا رکھتی ہے گویا ادب اور فن دیار ذہن کے پناہ گزیں ہیں ان کے برعکس شخصی تصورات والی نفسیات ادب اور فن کو اکیا چاؤ سے اکیا مُخارے سے اور اسی احتراز سے لینے لگتی ہے جس طرح ادیب یا فن کار فن پاروں کو لگتا ہے۔" [۱]

آگے چل کر تحریر کرتے ہیں:

"فرائڈ نے تحلیل نفسی کا نظریہ بطور خاص ادبی تنقید کے لئے وضع نہ کیا تھا نہ ہی اس نظریہ سے وابستہ مقاصد میں ادبی تنقید سرفہرست رہی ہو گی۔ دراصل بعض نظریات میں اتنی آفاقیت ہوتی ہے کہ اپنے عصر کے ساتھ ساتھ وہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ شعور کا تصور بھی ایسا ہی عالمگیر تصور ثابت ہوا۔ جب یہ شعور انسانی شخصیت کی تفہیم کا ذریعہ قرار پایا تو ہر وہ موضوع جس کا انسانی شخصیت سے دور کا بھی تعلق تھا اس تصور سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ادب تو ہے ہی انسانی شخصیت کا اظہار علاوہ اس سے

---

[۱] تخلیق فن کی نفسیات۔ "راوی" گورنمنٹ کالج لاہور کا ماہنامہ ہم زبان "مالی گاؤں" ص ۱۰ شمارہ ۳

کیوں متاثر نہ ہوتا۔ یوں نفسیات کے زیر اثر ادب کی پرکھ کے جن معائر نے جنم لیا انہوں نے
نفسیاتی تنقید کا نام پایا۔ مختصر ترین الفاظ میں اگر نفسیاتی تنقید کی تعریف مطلوب ہو تو اسے
ادبی شخصیات اور تخلیقات میں لاشعوری عوامل اور نفسی محرکات کی کارفرمائیوں کا مطالعہ
قرار دیا جا سکتا ہے۔" ؎۲

تنقید نفسیاتی ہو یا کسی اور طرح کی بلکہ ایک لحاظ سے دیکھیں تو کوئی بھی نظریہ یا مخصوص تصور اچانک اور غیر متوقع طور پر خلاء سے نمودار نہیں ہو جایا کرتا بلکہ یہ مخصوص نوعیت کے سماجی، سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور ادبی حالات و عوامل کا ثمر ہوتا ہے۔ ان حالات و عوامل کی اثر اندازی بھی اچانک نہیں ہوتی۔ بلکہ ان سب کو مخصوص نوعیت کا محرک بنانے میں زمانہ کئی کروٹیں لیتا ہے۔ اور بعض اوقات تو یہ کروٹیں صدیوں پر محیط ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید عہد میں شاید ہی فلسفہ اور علم نقد کا کوئی نظریہ ہو۔ جس کے ابتدائی نقوش قدیم یونانیوں کے یہاں نہ تلاش کئے جا سکتے ہوں۔ اس باب میں لاشعور کے نظریہ سے وابستہ کئی صدیوں پر محیط شخصیات لئے جائیں گے۔ کچھ یہی حال ادبی تنقید میں نفسیاتی بصیرت کا ہے۔ گو تحلیل نفسی کے نظریہ کو مکمل صورت اختیار کئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا لیکن اس کے ابتدائی نقوش و آثار مختلف عہد کی شخصیات کی تحریروں میں مل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے انہیں عوامل و عواقب کی روشنی میں علامہ اقبال کی شخصیت کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اور اس میں انہیں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ بعض امور میں اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن تمام امور میں نہیں۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے سلسلے میں ایک طرح کی اولیت ہے۔ اقبال ہماری ثقافتی تاریخ کا وہ موڑ ہے جہاں ہم اپنے ماضی اور حال کا جائزہ لیتے ہیں اور ان تمام سوالات کے از سر نو جواب دینے کی سعی کرتے ہیں جو وقتاً فوقتاً خود کو نئے الفاظ کا جامہ پہناتے رہے ہیں۔ اسلامی ہند کی پچھلی ایک سو سال کی تاریخ میں اگر کسی شخص نے مسلم سوسائٹی کے روحانی اور فلسفیانہ تضادات کو سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے تو وہ اقبال ہی ہیں۔ اقبال ہماری تاریخ کا وہ وجود ہیں جس کے ذریعہ ہمارے عوام کے ایک بڑے طبقے کی امیدوں اور شبہات کو شعری ڈھانچے میں ڈھالنے والا فن کار ملا ہے۔

وہ ہمارے سامنے بہت سی حیثیتوں سے آتے ہیں۔ شاعر، سیاست داں، ماہر تعلیم، فلسفی لیکن ان کی شاعری کو جو دوام حاصل ہوا ہے اس نے ان کی شخصیت کے دیگر شعبوں کو شاعری کی تفہیم کے لئے مددگار

؎۲ نفسیاتی تنقید ایک تعارف از سلیم اختر شائع شدہ ماہنامہ "ہم زبان" مالی گاؤں شمارہ نمبر ۵۸ ص ۔ از ایڈیٹر سلطان سبحانی

عناصر کی حیثیت دے دی ہے۔ اقبال کی سیاست، فلسفہ، اقتصادی اور تعلیمی نظریے زمانے کے ساتھ ساتھ کم یا زیادہ وقیع ثابت ہو سکتے ہیں لیکن ان کی شاعری کی سرمستی اور خلوص ہر زمانے میں اپنے فن کار کی افادیت کو تسلیم کرواتے رہے ہیں اور آگے آنے والے زمانے میں یہ عمل جاری رہے گا۔ عطیہ فیضی کے ساتھ ان کی ملاقات بھی خوب ہے اور خط و کتابت کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

پروفیسر محمد عثمان لکھتے ہیں :

"اقبال از عطیہ بیگم جس سے اس مجموعے کے اہم ترین حصے کا مواد حاصل کیا گیا ہے۔ اقبال بالخصوص دور شباب کے اقبال کو سمجھنے اور جاننے کا ایک انمول مصدر ہے تاہم اس مواد سے زیادہ تر اس تعلق خاطر پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اقبال اور عطیہ بیگم میں پایا جاتا تھا۔" ؎۱

اقبال اور عطیہ بیگم کے تعلقات کیا تھے ہندوستان کے اقبال شناس جگن ناتھ آزاد سے سنیئے :

"ادھر تو اقبال علم و فضل کی دنیا میں ڈگریوں پر ڈگریاں لیتے چلے جا رہے تھے۔ اور ادھر ان کی افتاد طبع اور ان کا فلسفیانہ مزاج ان کو کسی پہلو آرام نہیں لینے دیتا تھا۔ قیام یورپ کے دوران میں وہ طرح طرح کی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتے۔

پہلی کشمکش تو وہ تھی جس کا تعلق اور ذکر اقبال کی غزلیہ شاعری کے تعلق سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے اس انداز کی غزلیہ شاعری کو تضیع اوقات سمجھا اور جب اس طرح کی شاعری سے انسانی طبیعت بیزار ہوئی تو اس انداز کے اشعار ان کی زبان پر آ گئے۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

؎

ملا محبت کا سوز مجھکو تو بولے صبح ازل فرشتے
مثال شمع مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے

؎

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رخت سفر اٹھائے!
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا؟

؎۱ پیش لفظ : اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۔ ادارہ لاہور ۱۹۷۱ء

مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انہیں مذاق سخن نہیں ہے

٭

دوسری ذہنی پریشانی یہ تھی کہ اقبال کے مطالعے میں تعلیم اسلام کے متعلق بعض ایسی کتابیں آئیں جن کا ان کے نزدیک اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انہوں نے شیخ محی الدین ابن عربی کی "فصوص الحکم" اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی "حکمت الاشراق" کا متعدد بار بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ گو ان بزرگوں کے علم و ذوق میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کتابوں میں اکثر مندرجات کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایران میں مابعد الطبیعات کے ارتقا پر وہ مقالہ تو لکھ ہی رہے تھے۔ اس موضوع پر مزید غور و خوض کے لئے انہوں نے خواجہ حسن نظامی اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کے ساتھ خط و کتابت شروع کی اور اپنے موضوع میں ڈوب گئے۔

اسلام کے بارے میں ایک اور مسئلہ جس نے انہیں پریشان کیا یہ تھا کہ دنیا کے بعض حصوں میں اکثر مصنفین اسلام کو غلط رنگ میں پیش کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مقالات اور لکچروں کے ذریعہ سے اسلام کے بارے میں اکثر و بیشتر غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک خلش اور اضطراب بھی تھا اور وہ ان نقادوں کا خاص موضوع ہونا چاہئے جو اقبال کا نفسیاتی طور پر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس اضطراب کی کیفیت اور ذہنی پریشانی کا ذکر عطیہ فیضی نے کافی تفصیل سے کیا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ کچھ عطیہ فیضی کے قلم سے اور کچھ اقبال کی اپنی زبانی اقبال کی نفسیاتی کشمکش کا ذکر کیا جائے ان اثرات کی تلاش ضروری معلوم ہوتی ہے، جو عطیہ فیضی نے اقبال کی زندگی پر چھوڑے۔ عطیہ فیضی کون تھیں اور اقبال کی زندگی میں وہ کس طرح داخل ہوئیں۔ حیات اقبال کا ایک بڑی حد تک غیر نمایاں لیکن اہم گوشہ ہے عطیہ بیگم والیٔ جنجیرہ نواب سیدی احمد خاں کی سالی تھیں۔ عطیہ اور اُن کی بہنا رفیعہ سلطانہ نازلی بیگم آف جنجیرہ دونوں پڑھی لکھی اور علمی اور ادبی مذاق رکھنے والی لڑکیاں تھیں۔ نواب صاحب جنجیرہ خود علم و ادب اور فن کے قدر داں تھے۔ اہل علم و ہنر

اورنگ زیب قاسمی

کے مربی تھے۔ اور ہندوستان کے اہل قلم کے ساتھ اُن کے مراسم تھے۔ یہ علم پرور شاہی خاندان بمبئی میں مولانا شبلی کی میزبانی کے فرائض انجام دے چکا تھا۔ شبلی کی زندگی میں بھی عطیہ کے حسن و جمال، ذہانت اور دانشوری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

اقبال جب حصول تعلیم کے لئے ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے۔ عطیہ بیگم بھی حصول علم کے لئے وہاں مقیم تھیں۔ اسی زمانے میں مس بیک نامی ایک خاتون لندن میں ہندوستانی طلبا کی دیکھ بھال کے کام پر متعین تھیں۔ وہ کبھی کبھار اُن طالبعلموں کو اپنے یہاں کھانے کی دعوت بھی دیتی تھیں۔ اس سے ایک تو انہیں یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ طلباء اطمنان اور سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں یا نہیں۔ اور اگر انہیں کسی قسم کی تکلیف یا دقت محسوس ہو رہی ہو تو اُسے رفع کر دیا جائے۔ دوسرا اُن دعوتوں میں وہ تمام طلبا اور طالبات کا ایک دوسرے سے تعارف کرا دیتی تھیں۔ اقبال کو انگلستان میں تقریباً دو برس ہو چکے تھے۔ ہو سکتا ہے اس دوران میں انہوں نے عطیہ فیضی کے علم و دانش کا ذکر کہیں سنا ہو یا اتفاقیہ طور پر انہیں کہیں دیکھا ہو لیکن عطیہ فیضی ابھی تک اقبال کے نام سے ناواقف تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مس بیک کی طرف سے مس عطیہ فیضی کو ایک دعوت نامہ ملا یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے اور اس کا مفصل ذکر خود عطیہ کی زبان سے سنئے:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مس بیک نے انہی کے الفاظ میں مجھے ایک خصوصی دعوت نامہ بھیجا کہ میں ایک ذہین اور طباع طالبعلم سے ملاقات کروں۔ جس کا نام محمد اقبال ہے۔ جو کیمبرج سے خاص طور سے مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔ اس دعوت نامے نے میرے لئے قدرے دلچسپی پیدا کر دی۔ اس لئے کہ اس سے قبل میں نے اقبال کا نام بھی نہ سنا تھا۔ اور چونکہ لندن میں مختلف ہندوستانیوں کی طرف سے ایسے دعوت نامے آیا کرتے تھے۔ اس لئے اس دعوت نامے نے عارضی شوق اور تجسس سے زیادہ اور کوئی جذبہ پیدا نہیں کیا۔ مگر چونکہ مس بیک لندن میں مقیم ہندوستانی طلبا کی بہبودی کی نگراں تھیں اس لئے ان کے حکم کی تعمیل لازمی تھی۔ کھانے کی میز پر جو گفتگو ہوئی اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اقبال عربی، فارسی، کے علاوہ سنسکرت میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں بہت بڑے حاضر جواب ہیں اور دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور حاضرین پر مزاحیہ جملے کسنے پر ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ مس بیک نے اُن کے آنے سے قبل یہ حقیقت ذہن نشین کر دی تھی کہ وہ صرف مجھ سے

رہے ہیں اور چونکہ میں نے سیدھی سادی بے لاگ فطرت پائی تھی۔ اس لئے میں نے اقبال سے پوچھا کہ ملاقات کی وجہ کیا ہے۔ اس کی عمیق آنکھوں سے یہ ظاہر نہ ہو سکا کہ آیا وہ تعریف یا تعریض سے کام لے رہے ہیں۔ جب کہ انہوں نے کہا تھا " آپ لندن اور ہندوستان میں اپنی ڈائری کے باعث مشہور ہیں اس لئے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں آپ سے ملاقات کروں " میں نے ان سے کہا " میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ نے کیمبرج سے یہاں آنے تک کی زحمت صرف اس لئے گوارا کی کہ آپ مجھے ہدیہ تحسین پیش کریں لیکن مذاق کو بالائے طاق رکھیے اور بتائیے کہ اس کی تہہ میں حقیقی مقصد کیا ہے؟ میری اس صاف گوئی اور روکھے پن پر وہ قدرے متعجب ہوئے اور کہا کہ " میں آپ کو مسٹر اور مسز سید علی بلگرامی کی طرف سے دعوت دینے آیا ہوں کہ آپ کیمبرج میں ان کی مہمان بنیں اور میرا مشن یہ ہے کہ میں بغیر کسی رکاوٹ کے آپ کی منظوری ان تک پہنچا دوں۔ اگر آپ انکار کریں گی تو اس ناکامی کا داغ مجھ پر رہے گا، جسے میں نے آج تک کبھی قبول نہیں کیا اور اگر آپ دعوت قبول کر لیں گی تو در حقیقت میزبانوں کی عزت افزائی کریں گی"

اقبال کو حسب خواہش اپنے تئیں دلچسپ بنانے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ سوسائٹی میں وہ بہت زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے اور حاضر جوابی اور تعریف کرنے میں وہ کبھی نہیں جھجکتے تھے۔ اگرچہ بسا اوقات ان کے مذاق میں طنز کا رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ دوران گفتگو میں حافظ کا ذکر آگیا اور چونکہ میں خود اس شاعر اعظم سے دلچسپی رکھتی تھی اس لئے میں نے ان کے بہت سے برمحل اشعار سنائے میں نے اندازہ لگایا کہ خود اقبال بھی حافظ کے بے اندازہ مداح ہیں۔ انہوں نے کہا " میں جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں۔ اس وقت ان کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت شاعر کی شخصیت میں گم ہو جاتی ہے اور خود حافظ بن جاتا ہوں۔ انہوں نے ایک اور شاعر کا ذکر کیا جسے ہندوستان میں کوئی نہیں جانتا اور مجھ سے کہا " آپ بابا فغانی کے کلام کا ضرور مطالعہ کریں ان کی بہت کم تصانیف ہندوستان میں دستیاب ہوئی ہیں لیکن ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ ایک جداگانہ زاویۂ نگاہ پیش کرتی ہیں " یہ ہیں اقبال سے میری پہلی ملاقات کے تاثرات اور اس کے دوران میں ہم نے طے کر لیا کہ میں ۲۲ اپریل کو کیمبرج پہنچوں گی۔" ۱؎

(ترجمہ ضیاء الدین برنی)

۱؎ اقبال۔ عطیہ بیگم ناشر اقبال اکیڈمی کراچی ص ۹ - ۱۱ ۱۹۵۶ء بحوالہ مضمون اقبال کی زندگی میں دو اہم عورتیں از جگن ناتھ آزاد شب خون شمارہ ۱۵۰

اورنگ زیب قاسمی

سوانح نگاری بھی ایک فن ہے اور اس میں پوری پوری ایمانداری برتنے کی ضرورت ہے۔ حالی نے مرزا غالب اور سر سید احمد خاں کی سوانح عمریاں لکھیں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

" ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کریٹیکل طریقے سے لکھی جائے اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی برائیاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اس خیال سے ہم نے جو دو ایک مضمون کل حال آج سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی۔" ۱؎

اقبال کی سوانح عمری کا بھی یہی حال ہے۔ شروع ہی میں اقبال کی حیثیت اتنی تیزی سے ابھر کر سامنے آئی تھی کہ لوگ یعنی ان کے سوانح نگاروں نے اقبال سے متعلق جزئیات نگاری کو ان کی سوانح عمری میں راہ نہیں دی۔ اور ان کی بائیوگرافی کو بقول حالی چاندی سونے کے ملمع سے سجائے رکھا اس لئے کہ اقبال حکیم الامت شاعر مشرق اور مفکر اسلام ہیں۔ اقبال اور عطیہ بیگم کو ان کے سوانح نگاروں نے دو طرح سے دیکھا ہے۔ ایک کا خیال ہے کہ اقبال اور عطیہ کی ملاقات محض دو ہم خیال دانشور کی ملاقات ہے جیسے جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے:

" جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اقبال کی دوستی دو دانشوروں کی دوستی تھی۔" ۲؎

" علم و ادب اور فلسفے کا جہاں تک تعلق ہے دونوں میں ایک فکری ہم آہنگی تھی۔ اس لئے عطیہ کی تحریروں میں اقبال کے رجحان طبع ذہانت اور عادات و اطوار کی جو تصویر ملتی ہیں وہ کہیں اور نظر نہیں آتیں۔ اگر عطیہ اقبال کے بارے میں ہمیں اتنا کچھ نہ بتاتیں تو اقبال کی سوانح حیات ہر اعتبار سے نامکمل رہتی کیونکہ عطیہ کی ڈائری اور اقبال کے متعلق ان کی تحریر میں اقبال کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ ہی باطنی کشمکش کی بھی ایک تصویر ملتی ہے جس کے بغیر اقبال کے فکر و فن کو پوری طرح سمجھنا دشوار ہو جاتا۔" ۳؎

۱؎ مقالات حالی از الطاف حسین حالی جلد دوم ص ۲۱

۲؎ اقبال کی زندگی میں دو اہم عورتیں از جگن ناتھ آزاد شب خون ایڈیٹر شمس الرحمٰن فاروقی شمارہ ۱۵۰ ص ۳۹

۳؎ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سید سعید جعفری نے ایک جگہ لکھا ہے :

" سوسائٹی میں عورت کی حیثیت ہی وہ محور ہے جس کے گرد ہمارے سارے معاشرتی مسائل چکر لگاتے ہیں .... اقبال کے فلسفیانہ کردار کی ترتیب اور ذہنی نشوونما میں جو اثر سب سے زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوا وہ ان کا یورپ کا سفر تھا۔" ۱؎

سلیم اختر نے اپنے طویل مقالہ "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" میں عطیہ اور اقبال کے خطوط کو ہی بنیادی مرکز بنایا ہے۔ اور جب عطیہ بیگم کا ذکر آتا ہے تو لامحالہ مولانا شبلی نعمانی کا بھی ذکر آتا ہے اور ساتھ ہی اقبال کا بھی۔ چونکہ یہاں شبلی میرا موضوع نہیں ہیں اس لئے اُن خطوط کا تذکرہ "باعث لذت" نہیں ہوگا لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کے خیالات سے استفادہ ضروری ہے :

" عطیہ بیگم فیضی اردو ادب میں اب ایک LEGEND ایسی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعی شبلی کے لئے بیئیں براؤن اور اقبال کے لئے بیٹریس تھی لیکن اتنا یقین ہے کہ اردو کے ان دو عظیم ادیبوں نے عطیہ کی شخصیت سے بہت گہرے اثرات قبول کئے چنانچہ شبلی نے قصر معلّی (جزیرہ جنجیرہ) میں عطیہ کی میزبانی کے بعد یہ کہا ؎

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی
خیال روزہ و فکر وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
جو دو دن بھی بسر کرے گا اس قصر معلّی میں
اُسے خلد بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
یاد صحبت ہائے رنگیں جو جزیرہ میں رہیں
وہ جزیرہ کی زمیں تھی یا کوئی مے خانہ تھا
لطف تھا ذوق سخن تھا صحبت احباب تھی
مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا

اپنے جداگانہ انداز زیست۔ تعلیم و تربیت اور زمان و ماحول میں انقلابات کے باوجود شبلی اور اقبال میں بعض خصوصیتوں کا اشتراک بھی ملتا ہے۔ جن کا مطالعہ خالی از

۱؎ اقبال کی نگاہ میں عورت کی حیثیت، از سید سعید جعفری مشمولہ سب رس کراچی اقبال حصہ دوم ۱۹۷۷ء صفحہ ۱۶۹

اورنگ زیب قاسمی

دلچسپی نہ ہوگا مثلاً دونوں نے فارسی ادب و زبان کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور فارسی کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ دونوں کو فلسفے سے گہرا شغف تھا۔ بلکہ عجیب اتفاق کہ دونوں نے پروفیسر آرنلڈ سے رہنمائی حاصل کی (اقبال تو خیر آرنلڈ کے شاگرد تھے ہی)۔ دونوں کو مسلمانوں کی گزشتہ عظمت کا احساس ہی نہ تھا بلکہ اس کے دوبارہ حصول کے خواہاں بھی تھے۔ ادبی خدمات کے صلہ میں دونوں انگریزوں کے خطاب یافتہ تھے۔ آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ دونوں عطیہ سے متاثر ہوئے اور بری طرح سے۔ اس ضمن میں دونوں کی عمروں کا تفاوت بھی قابل غور ہے۔" ۱؎

آگے رقم طراز ہیں علامہ اقبال اور علامہ شبلی سے متعلق :

" ایک جوانی گزار چکا تھا اور دوسرا جوان تھا۔ شبلی کا متاثر ہونا بلکہ ڈاکٹر وحید قریشی کے الفاظ میں "عشق کرنا بجھتے چراغ کی آخری بھڑک تھی"۔

ادھیڑ عمر شبلی جس جذباتی تموّج کا شکار ہوئے اس کا نتیجہ تخلیقی عمل کی تیزی کی صورت میں ظاہر ہوا اور گیارہ ستمبر ۱۹۰۶ء کو مہدی افادی کے نام اپنے مکتوب میں لکھا :

" انیس برس بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔"

انیس برس بعد غزل لکھنے سے مراد یہ ہے کہ عطیہ بیگم سے ملاقات کے بعد اُن کے ذہن نے ایک نئی کروٹ لی اور غزلوں کے ذریعہ اپنے خیالات پیش کئے۔

" فرائڈ نے جنسی ارتفاع SEX SUBLIMATION کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اس پر بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ لیکن شبلی ایسی مثالوں کی موجودگی میں اس کی صداقت سے انکار ممکن نہیں رہتا۔

اس جذباتی تموّج نے ارتفاع پذیر ہو کر تخلیقات کی صورت میں تسکین پائی۔ چنانچہ اس وقت کی فارسی غزلیں جب "دستہ گل" کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئیں تو ان غزلوں کا رنگ دیکھ کر حالی نے شبلی کو یوں لکھا :

" کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق، اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھیں غزلیں کاہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہیں جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔"

۱؎ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر لاہور ص ۲۷-۲۸

من فدائے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال
بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را
شب وصل است حیا گر بگذاری چہ شود
یک دم تنگ در آغوش فشاری چہ شود ۔۔ [1]

علامہ شبلی نے جو اپنے خطوط عطیہ کو لکھے ہیں ان کی حیثیت کچھ کم نہیں مثلاً

" عطیہ !
تم سے زیادہ مجھ کو خوشی ہوگی اگر میں کوئی کتاب تمہارے نام معنون کر سکوں۔ یہ وقت ضرور آئے گا لیکن کب ؟ اس کا فیصلہ آج نہیں کر سکتا۔
شبلی ۲۱ جون ۱۹۰۹ء [2]

" عطیہ !
میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے۔
شبلی ۹ اگست ۱۹۰۹ء " [3]

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں :
" شبلی نے بہت گھٹے ہوئے ماحول میں زندگی بسر کی تھی وہ تو ان کے مزاج کی " رجعیت " اور شاعری نے بچا لیا ۔ ورنہ ملاؤں میں گھرا شبلی عطیہ سے متاثر ہونے کی بجائے اسے دیکھ کر لاحول پڑھتا کہ ۲۲ برس کی دوشیزہ بلا نقاب نامحرموں میں گھری فلسفہ پر گفتگو کرتی ہے۔ شبلی کا ذہن تو عطیہ ایسی عورت کو مسترد کر سکتا تھا لیکن شاعر کا دل نہیں اور اسی لئے جذباتی ابال تخلیقی ابال بنا۔ اس میں عمر کا کوئی قصور نہیں۔
لیکن کشمیر النسل اقبال کا معاملہ جداگانہ تھا کہ رگوں میں پنجابی خون دوڑ رہا تھا۔ یہ تو بالکل واضح ہے لیکن وہ کس قسم کا جوان تھا۔ اس کی جذباتی ساخت کیا تھی بحیثیت ایک مرد اس

---

[1] دیباچہ مکتوب حالی بنام شبلی بحوالہ تحریک نئی دہلی سلور جبلی نمبر ص ۵۷۹ ۱۹۷۹ء
[2، 3] شبلی بنام عطیہ : بحوالہ تحریک سلور جبلی نمبر ۱۹۷۹ء ص ۸۰-۵۷۹

اورنگ زیب قاسمی

کی پسند اور ناپسند کیا تھی اس ضمن میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کچھ تو اس لئے کہ ہمارے سوانح نگاروں نے ان امور کو در خور اعتنا نہ سمجھا اور کچھ اس لئے بھی کہ اقبال نے اپنی تحریروں میں دانستہ (یا غیر دانستہ طور پر) اس نوع کے اشارات سے احتراز کیا۔ اقبال نے بھی غالب کی مانند بے شمار خطوط لکھے ان میں مداحوں ناقدوں اور پرستاروں کے علاوہ بے تکلف دوست اور مشفق احباب بھی شامل تھے ۔ لیکن سوانحی نکات کے لحاظ سے ان خطوط کی اہمیت برائے نام ہے۔ " [1]

لیکن پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں :
" بحیثیت شاعر اقبال کے ذہن کا کوئی گوشہ اردو ادب کے طالب علموں سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ بحیثیت انسان اقبال کو سمجھنے میں ان کی سوانح عمریوں سے مدد مل سکتی ہے۔ تاہم ان کے چند خطوط جو شائع ہو چکے ہیں وہ ہم کو انسان اقبال سے جس قدر قریب پہنچا سکتے ہیں وہ شاید ان کی سوانح عمریوں سے بھی ممکن نہیں۔ " [2]

ایک ایسے مفکر شاعر کی شخصیت اور شعور کے کسی خاص پہلو کا مطالعہ جس نے انسانی زندگی تہذیب اور معاشرہ کے گوناگوں پہلوؤں پر اپنے خطوط کے ذریعے اظہار کیا ہو۔ خاص طور پر ارتقاء اور تبدیلی کے ایک نازک عبوری دور میں نتیجہ خیز بھی ہو سکتا ہے اور مطالعہ آمیز بھی۔ اس لئے ان خطوط کا مطالعہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جیسے کسی خاص عبارت اور اس کی نکتہ آفرینیوں کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ تفہیم و تعبیر کا یہ عمل اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے، جب وہ شخصیت شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی ہو، عالم دین بھی، اور جدید تر سماجی اور سائنسی علوم کی عارف بھی جس کی ذات میں روحانی قدریں اور مادی قوتیں، علم و وجدان، جذبہ و عمل، ماضی و حال، حقیقت و تصور جیسے متضاد محرکات ایک طویل آویزش ایک حشر سامان کشمکش کے بعد ایک دلکش اور شفاف دھارے میں ڈھل گئے ہوں یا کم از کم ایسا محسوس ہوتا ہو۔ شعور و احساس کے اس مضطرب اور متحرک دھارے میں سے ان اجزاء یا عناصر کو الگ کرنا جن کا تعلق خود فنکار کی اپنی نجی زندگی اور اس کی جنسی زندگی سے ہو اور جو جذبات و تصورات میں ڈوبی ہوئی ہو آسان نہیں۔ لیکن عطیہ فیضی کے نام لکھے گئے

---

[1] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۳۰
[2] اقبال کے خطوط کی سوانحی اہمیت از پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم شائع شدہ ماہنامہ سب رس کراچی اقبال نمبر ۳-۱۹۷۸ء

خطوط نے اقبال کی نجی زندگی کے بہت سے راز افشا کر دیتے ہیں بقول ضیاء الدین احمد برنی:

"یہ خطوط جہاں تک اقبال کی زندگی کا تعلق ہے گہری دلچسپی سے پڑھے جانے کی چیز ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں انہوں نے کس قسم کی زندگی بسر کی۔ ہندوستان آنے پر ان پر کیا افتاد پڑی اور وہ کیسی کیسی ذہنی تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ ایک خط سے ان کی گھریلو زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ وہ پہلو ہے جو آج پبلک کی نظروں کے سامنے نہیں آیا۔ اس دور کی نظمیں بھی سراپا سوز و گداز سے پُر ہیں اور پڑھنے والے پر ایک خاص کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ اگر عطیہ بیگم اقبال کو عالم یاس و قنوطیت سے باہر نکال لائیں تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ رجحان طبع کہاں پر جا کر ختم ہوتا۔" [1]

اقبال نے مشرقی روایات کے حامل ایک دیندار گھرانے میں جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم اور سیالکوٹ میں ایف۔ اے پاس کرنے تک اس کے اثرات کسی ذہنی مزاحمت کے بغیر قائم رہے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کرنے کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی آتی گئی اور اس انقلابی تبدیلی نے ان کی خانگی زندگی پر بڑا اثر ڈالا۔ یہاں تک کہ ان کی پہلی شادی بھی ناکام ہو گئی اور ان کے فلسفیانہ خیالات میں بھی بے پناہ تبدیلی کا دور شروع ہو گیا اس کی طرف سلیم اختر اشارہ کرتے ہیں:

"یہی انداز اس کی جذباتی زندگی میں بھی کارفرما نظر آئے گا۔ پہلی شادی سے اقبال خوش نہ تھا۔ یورپ میں عطیہ سے ملاقات ہوئی اور ہم مذاق اور ہم مشرب کو اس نے جذباتی ناآسودگی کے لئے باعث تسکین بنانے کی سعی کی لیکن بوجوہ یہ بات نہ بن سکی اس کی وجہ اقبال تھا یا عطیہ۔ اس ضمن میں وثوق سے اب کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ علاج بالمثل کے طور پر دو شادیاں ضرور کیں۔ اس کی نوٹ بک میں حقیقی شادی کے بارے میں اقبال کی یہ رائے قابل غور ہے:

"The beauties of nature can be realised only through the eyes of a lover. Hence the importance of a true marriage" (P.133)

اقبال نے عام روایتی انداز میں میاں بیوی کو دو پہیے قرار دے کر شادی کو چھکڑے میں تبدیل نہ کیا بلکہ اسے حسن فطرت سے ہم آہنگ کر کے اس کے لئے ایک وسیع تر تناظر مہیا کیا اور فطرت کے حوالے سے اس رشتہ کی جڑیں بھی انسانی فطرت میں پیوست کر دیں۔ اس کا حوالہ ایک فلسفیانہ مقولے کے طور پر نہیں دیا گیا نہ ہی اسے ملفوظات اقبال کے طور پر پیش کیا گیا بلکہ اس امر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ایک ناکام شادی اور یورپ کی پر بہار زندگی کے بعد ۳۲ سالہ اقبال شادی کو کیا سمجھتا تھا یہ وہ وقت تھا (۱۹۱۰ء) جب اقبال کی جذباتی ناآسودگی عروج پر تھی۔ لیکن شادیاں ہو جانے اور زندگی میں ایک بلند مقام

۱؎ اقبال اور عطیہ بیگم ترجمہ ضیاء الدین برنی ناشر اقبال اکیڈمی کراچی ص ۱۶-۱۵

اورنگ زیب قاسمی

حاصل کر لینے کے بعد اقبال نے شادی کے بارے میں بالکل مختلف قسم کا مقولہ پیش کیا۔" [1]

اقبال کی فلسفیانہ ذہنی تبدیلی پر غور کرنے سے پہلے یہ جان لیں کہ خود ان کا عورت کے سلسلے میں کیا تصور تھا اور عورت کو بنیادی طور پر وہ کیا سمجھتے تھے۔ مثنوی رموز بیخودی میں اقبال فرماتے ہیں:

نغمہ خیز از زخمۂ زن ساز مرد
از نیاز او دوبالا ناز مرد
آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر او فرمود با طیب و صلوٰۃ
نیک اگر بینی امومت رحمت است
زانکہ اورا با نبوت نسبت است
شفقت او شفقت پیغمبر است
سیرت اقوام را صورت گر است
از امومت گرم رفتار حیات
از امومت کشف اسرار حیات (رموز بیخودی ص ۱۷۰)

اقبال نے عورت کے متعلق اسلامی نظریے کو مندرجہ بالا اشعار میں اس طرح پیش کیا ہے جس سے عورت کا احترام اور اسلامی معاشرے میں اس کی حیثیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اقبال عورت کے سب سے بڑے مقصد کو اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ اگر وہ معاشرے میں اعلیٰ فرد پیدا کرے تو اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا اس کا حسن اور زیبائش سب ظاہری اور وقتی چیزیں ہیں۔ قوم کی تعمیر کے لئے ایک بھی صاحب کردار فرد معاشرے کو دے سکی تو وہ لازوال ہو جاتی ہے اور ایک ایسی عورت جو فریب خوردۂ مغرب ہے اور جو اپنے باطن سے زیادہ ظاہر کی نمائش کرتی ہو۔ قوم کو اس کی ضرورت نہیں۔

واں تہی آغوش نازک پیکرے
خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکر او از تاب مغرب روشن است
ظاہرش زن باطن او نازن است
بندہائے ملت بیضا گسیخت
نازکش عشوہ ہا گل کردہ ریخت
ایں گل از بستان ما نارستہ بہ
داغش از دامان ملت شستہ بہ (رموز بیخودی ص ۱۷۵)

۱؎ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ناشر مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء

مغرب کی نسائی آزادی جنسی خود غرضی کے مترادف ہے عورت کا شرف اور بزرگی اس کی تخلیق اور نسائیت ہی میں پوشیدہ ہے۔ اگر یہ جوہر اس سے جاتا رہا تو وہ اپنی قدر کھو بیٹھتی ہے ؎

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

اسلامی معاشرے میں عورت کا سب سے بڑا فرض قوم کی تعمیر سیرت ہے اور مرد کا فرض عورت کی جائز آزادی اور اس کے حقوق کا احترام تاکہ دونوں ایک دوسرے کی تعمیر کر کے ایک تیسری زندگی کو بنا سکیں خاندانی زندگی کا بھی یہی مقصد ہے۔ قوم میں بہتر افراد پیدا کرنے کے لئے معاشرے میں نیک عورتوں کی ضرورت ہے ان کی تعمیر بھی معاشرے کا فرض ہے۔ عورت جنسی خود غرضی کے لئے نہیں ہے۔ اس کا مقصد اتنا بلند اور اس کا درجہ ایسا محترم ہے کہ اسے مظلوم بنانا اسے کمتر مخلوق سمجھنا ایک لعنت ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر لعنت اس سے جوہر نسائیت چھین لینا ہے۔ قدیم و جدید زمانے میں یہ دو لعنتیں موجود ہیں۔ ایک جاگیرداری نظام کی پیداوار ہیں اور دوسری سرمایہ داری کی۔ مسلمانوں میں بھی جاگیرداری نظام کی بدولت عورت کو اپنے اصل مقام سے محروم کر دیا گیا اور بادشاہوں اور امراء نے عورت کو زندگی سے ہٹانے کی کوشش کی اور رومیوں کے سے رسوم اختیار کر کے عورتوں کو پنجروں میں بند کر دیا۔ اقبال خواتین ملت کو مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

اے ردایت پردۂ ناموس ما
تاب تو سرمایۂ فانوس ما
طینت پاک تو مارا رحمت است
قوت دین و اساس ملت است
کودک ما چوں لب از شیر تو شست
لاالٰہ آموختی او را نخست

اورنگ زیب قاسمی

می تراشد مہر تو اطوار ما
فکر ما گفتار ما کردار ما
اے امین نعمت آئین حق
در نفس ہائے تو سوز دین حق
دور حاضر تر فروش و پُرفن است
کاروانش نقد دیں را رہزن است
ہوشیار از دستبرد روزگار
گیر فرزندان خود را در کنار
فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند
تا حسینے شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بہ گلزار آورد

(رموزِ بیخودی صفحہ …)

اقبال کی شاعری اور شعور کی جہتیں بہت متنوع اور مختلف زاویہ ہائے خیال پر محیط ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ملی نقطۂ نظر سے سوچا بلکہ قومی اور ملکی مسائل پر بھی غائر نظر ڈالی۔ عالمی افکار بھی ان کے یہاں اس فراوانی اور وسعت کے ساتھ ملتے ہیں جس کی مثال فارسی اور اردو میں مشکل سے ملے گی۔ اسلامی تاریخ اور اس کی رہنما شخصیتیں اقبال کے لئے چراغ راہ کا کام دیتی رہی ہیں۔ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کی زندگی کو خواتین کے لئے ایک مثالی زندگی مانتے ہیں۔ حضرت فاطمہ کی شخصیت عالم انسانی اور خصوصاً نسوانی معاشرے کے تئیں ایک نصب العین کا درجہ رکھتی ہے۔ اس طرح حضرت امام حسینؓ جو حضرت علی اور حضرت فاطمہ کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ اپنی حریت فکر، غیرت کردار اور دینی حمیت کے رشتے سے عالم انسانی کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ ہیں اور حضرت نے ایثار و قربانی اور اعلائے کلمۃ الحق کے واسطے سرزمین کربلا میں پہنچ کر جو دینی جہاد کیا تھا وہ بھی تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہے غرض کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت امام حسینؓ کی زندگی ملت بیضا اور خواتین اسلام کے لئے ایک مثالی زندگی ہے۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

نورِ چشمِ رحمۃ للعالمیں
آں امامِ اولین و آخریں
آں کہ جاں در پیکرِ گیتی دمید
روزگارِ تازہ آئیں آفرید
بانوئے آں تاجدارِ ھل اتیٰ
مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا
مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق
مادرِ آں کارواں سالارِ عشق
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں
پشتِ پا زد بر سرِ تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں
قوتِ بازوئے احرارِ جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسینؓ
اہلِ حق حریت آموز از حسینؓ
مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

(رموزِ بیخودی)

اسلام کے دورِ اول کی تمدنی فتوحات اور تہذیبی پیش رفت کی سمت و رفتار اس وقت بدل گئی ہے جب خلافت عباسیہ کے دور میں شہنشاہیت کا ادارہ قائم ہوا اور تسلط و اقتدار کو وقت کا دستور و آئین مان کر شاہانِ وقت نے اپنے تخت و تاج اور جاہ و جلال کے واسطے خلقِ خدا پر مظالم کا سلسلہ شروع کیا۔ فتنۂ تاتار نے کچھ وقت کے لئے بڑی بڑی بادشاہتوں کی بساط الٹ دی۔ مگر خود ان کی چیرہ دستیوں اور خون آشامیوں کے سامنے ہر طرف تہذیب و شائستگی کے چراغ بجھتے ہوئے نظر آئے بستیاں ویران ہو گئیں ملک شہر کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے۔ ایسے وقت میں بزرگانِ باصفا کی مقدس شخصیتوں نے دین و دانش کے روحانی رشتے کو باقی رکھنے کی سعئ بلیغ فرمائی۔ خدا کی مخلوق کو دینی تعلیمات اور نظام کی سعادتوں سے مستفیض کیا اور دلوں کو زندہ رکھا۔ انسانیت پر اعتماد و یقین کو

اورنگ زیب قاسمی

بحال کیا اور دین و دانش کے چراغ کو بجھنے سے بچا لیا۔

اب سے چار پانچ صدی پیشتر اگر ایک طرف عرب و عجم اور مصر و شام اور ہندوستان اور ترکستان میں عظیم الشان سلطنتوں کا دور دورہ تھا تو دوسری طرف مغربی ممالک ایک بڑے تاریخی اور سیاسی انقلاب سے گزر رہے تھے جس پر قابو پانے کے بعد انہوں نے مشرق کی طرف رخ کیا۔ سمندروں پر قبضہ و تصرف قائم کیا اور مشرق کی تہذیبی بساط کو الٹ دیا۔ مشرقی مجمع الجزائر سے لیکر تیونس اور الجزائر تک کے علاقے مغربی قوموں اور ملکوں کے دستِ تصرف میں آ گئے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز سے لیکر انیسویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک دو صدیاں ایسی گزریں جب مشرق کے بیشتر ملک مغرب کی سیاسی غلامی کی طوق پہنے رہے۔ ان کی فکری آزادیاں جیسے سلب ہو گئیں۔ ان کی غیرت و حمیت کو برابر مغربی تہذیب للکارتی رہی۔ لیکن کسی طرف سے وہ صدائے حریت سنائی نہ دی جو مشرق کی روح کو بیدار کر دے اور ایک بڑے ذہنی انقلاب کے لئے حرفِ آغاز بن جائے۔ اگر یہ بات ہندوستان کے حوالے سے کی جائے اور کہی جائے تو برصغیر میں اس آواز کو ہم اقبال کے ملی شعور سے اس طرح وابستہ کر سکتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اقبال نے ہندوستان کے بارے میں سوچا، عرب و عجم اور مصر و شام کے مسائل پر غور کیا اسلام کے تاریخ کے روشن مرحلے ان کی نظر میں رہے۔ اور مغرب کی مادی فتوحات اور تہذیبی پیش رفت کو انہوں نے عالمی تاریخ کے تناظر میں دیکھا۔ اقبال کی شخصیت و شعور کو سمجھنے کے لئے اُس بڑے پس منظر کو بھی نظر میں رکھنا ہوگا جس کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا اور بحیثیت انسان ان کی ذہنی زندگی کے روشن دریچوں پر بھی نظر ڈالنا ہوگا۔ اقبال مفکر بھی تھے مدبر بھی تھے فلسفی بھی تھے فن کار بھی۔ فن کار اقبال سے فلسفی اقبال تک پہنچنا اور فلسفی اقبال کے ذہن و زندگی میں ان کی انسانی فطرت اور فکری سرچشموں کو تلاش کرنا اقبال فہمی کے لئے شاید اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ ان کی عظمت کا اعتراف کرنا۔

میں عطیہ بیگم اور اقبال کے تعلقات پر آگے روشنی ڈالوں گا پہلے اقبال کے فلسفیانہ تصورات پر ایک نظر ڈال لیں:

ڈاکٹر سلیم اختر اپنے طویل مقالے "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

"اقبال کو ایک مفکر، معلم، اور فلسفی کے روپ میں پیش کرنے والے یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ کبھی وہ بھی جوان رہا ہوگا اور اس کے قلب و نظر اور ذہن

متضاد اثرات کی آماجگاہ بھی بنے ہوں گے چنانچہ اگر غلطی سے کوئی چونکا دینے والی بات سامنے آجائے تو ذہن کو گویا ۔۔۔ وولٹ کا جھٹکا لگتا ہے۔ مثلاً اقبال کی یادداشتوں پر مشتمل نوٹ بک STRAY REFLECTION (مرتبہ جاوید اقبال) میں ایک موقع پر یہ بتاتے ہوئے کہ اس کی زندگی میں ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل، اور ورڈزورتھ کے افکار ونظریات اور شاعری نے کیا کردار ادا کیا اس امر کا بھی اعتراف کیا کہ ورڈزورتھ نے زمانۂ طالبعلمی میں مجھے دہریت سے بچالیا۔" [1]

وہ آگے لکھتے ہیں:

"یہ اعتراف اتنا خطرناک نہیں جتنا بظاہر لفظ دہریت سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اسے اقبال کے افکار ونظریات کے ارتقائی مدارج میں خصوصی اہمیت بھی نہیں دی جا سکتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اقبال کے ذہن کے ایک خاص رُخ کا اندازہ یقیناً لگایا جاسکتا ہے جاوید اقبال اس کی توجیہہ یوں کرتے ہیں۔

"زمانۂ طالبعلمی کی یہ دہریت اس کے ذہن کے متجسسانہ رویہ اور استفسار پسندی کی غمازی کرتی ہے وہ ان میں سے نہیں تھا جو دوسروں پر اعتبار کرتے ہوئے کسی بھی شئے کو تسلیم کرلیتے ہیں ۔۔"

یہ توجیہہ کچھ غلط نہیں۔ مشرقی روایات اور مذہبی عقائد میں پروان چڑھے ذہن نے مغرب کے فلسفہ اور سائنس کے تجزیاتی انداز سے پہلی مرتبہ روشناسی پر یقیناً اعتقاد کی بنیادوں کو متزلزل پایا ہوگا لیکن میرے خیال میں بات یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی کیونکہ "دہریت" اعتقادی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص ذہنی رویے کی بھی غماز ہے اور وہ ہے انتہاپسندانہ رویہ یہ انتہاپسندی ہی تھی جس نے پہلے اس میں دہریت کو ابھارا اور پھر اس کے ردعمل میں وہ تمام عمر ہر نوع کی بت پرستی کے خلاف جہاد کرتا رہا۔ اقبال نے اسی نوٹ بک میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

"اگر تم اس دنیا کے شور میں اپنی آواز کی سماعت چاہتے ہو تو اپنی روح کو کسی ایک تصور کے تابع فرمان کردو۔ یہ ایک تصور والے ذہن کا حامل انسان ہی تو ہے جو

[1] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از سلیم اختر ص ۲۲-۲۳ ناشر مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء

اورنگ زیب قاسمی

سیاسی اور سماجی انقلابات برپا کرتا ہے۔ حکومتوں کی تشکیل کرتا اور دنیا کو قوانین دیتا ہے۔" [1]

وہ آگے تحریر فرماتے ہیں اور ایک مستقل رائے ظاہر کرتے ہیں:

"اقبال نے جس یک رُخے ذہن کی توصیف کی ہے اُسے کس حد تک اقبال کی اپنی شخصیت کا عکس بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور اس امر پر زور دینے کی ضرورت ہی نہیں کہ انتہاپسندی کا کرداری سانچہ یک رُخے ذہن سے جنم لیتا ہے۔ اقبال کی صورت میں یہ انتہاپسندی فلسفہ کے روپ میں جلوہ گر ہوئی اور یک رُخے ذہن کو اپنی کارکردگی کے لئے دو نقاط کے درمیان مختصر ترین فاصلے طے کرنا پڑا۔" [2]

سر عبدالقادر اور مسٹر آرنلڈ نے ان کو یقین دلایا تھا کہ تمہاری شاعری وہ شاعری نہیں ہے جو عمل کے منافی ہو بلکہ اس کے ذریعہ سے تم قوم کے اندر زبردست قوت عمل پیدا کرسکتے ہو۔

"شاعری اور شاعروں کی نسبت ہمیشہ سے مختلف قسم کے خیالات دنیا میں مروج رہے ہیں۔ کبھی کوئی قوم قدیم عربوں کی طرح شعر کو ایک اعجاز اور شاعر کو قوم کے لئے ایک سرمایۂ قوت تصور کرتی تھی۔ اور قبیلے میں شاعر کا ظہور ایک نعمت عظمیٰ خیال کیا جاتا تھا۔ کبھی ایسا ہوا کہ شعر اور اس کے ساتھ شاعر ایسا ذلیل ہوا کہ سقراط اور افلاطون جیسے مصلحین نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنی مجوزہ تصوری مملکت میں سے یا تو شعراء کو بالکل خارج کردیا جائے یا ان پر بڑا کڑا احتساب قائم کیا جائے کہ وہ قوم کو اخلاقی ضرر نہ پہنچا سکیں۔ مسلمانوں کی نسبت یہ رائے عام طور پر صحیح ہے کہ یہ قوم ہمیشہ سے ایک شعر پسند قوم رہی ہے۔ لیکن جہاں شعر سے اکثر ناجائز کام لینے کا رواج عام ہوا وہاں مسلمانوں میں بھی شعر اور شاعر پاکبازوں اور مصلحین کی نظروں سے گرگئے۔ خود مولانا روم جن کی تمام تر تصنیف منظوم ہے فرماتے ہیں کہ میرے وطن میں شاعر کو بہت ذلیل خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے میں عام وخاص کی تلقین کے لئے اس امر پر مجبور ہوگیا کہ اپنے جذبات اور افکار کو نظم میں ادا کروں۔ شاعری اگر اپنی غلط روی سے ذلیل بھی ہو جائے تو بھی کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ اس میں سحر اور قوت باقی رہتی ہے۔ افلاطون نے شاعروں کو بہت بُرا بھلا کہا لیکن وہ خود بھی اپنی نثر میں کسی بلند پایہ شاعر سے کم نہیں۔ مولانا حالی نے جب قوم کے اخلاقی انحطاط کے وجوہ پر نظر ڈالی تو وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ اس تخریب میں ایک زبردست

[1] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ناشر مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء ص ۲۲-۲۱

[2] " " " ص ۲۲

عامل وہ شاعری بھی ہے جو صدیوں سے غلط راہوں پر پڑ کر قوم کے تخیلات اور جذبات کو خراب کر رہی ہے۔ قول رد قصائد کے ناپاک ذوق کے خلاف انہوں نے احتجاج کیا۔ شاعر اگر اپنی قوت کا صحیح استعمال کرے تو تلمیذ الرحمٰن ہو جاتا ہے۔ اگر غلط استعمال کرے تو تلمیذ الشیطان بھی بن سکتا ہے۔ ایک حکیم کا قول ہے اگر میرے ترانے کسی قوم میں رائج ہو سکیں تو میں قطعاً اس کی پروا نہیں کروں گا کہ اس قوم کے لئے قوانین کون بناتا ہے۔ شعر کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے اور دلوں کی کیفیات پر باقی تمام زندگی کا مدار ہے۔

اقبال کے زندگی سے رشتے اور ذہن کی آرٹ سے وابستگی کے معاملے کو اگر ہم اقبال کی نفسیات کی روشنی میں سمجھنا چاہیں تو عطیہ اور اقبال کے باہمی ذہنی روابط کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

ضیاء الدین احمد برنی کا خیال ہے:

"جہاں تک خطوط سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اقبال بے تکلفی کے باوجود اُن کا (عطیہ فیضی) احترام کرتے تھے اور اس بے تکلفی اور احترام دونوں کی جھلک خطوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ میرے اپنے ذاتی مشاہدات سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ اقبال ان کے ساتھ خصوصیت سے پیش آتے تھے۔ اور خود عطیہ بیگم بھی ان کی عظیم المرتبت شخصیت کا پورا پورا خیال رکھتی تھیں۔ دراصل یہ خطوط دو ایسی شخصیتوں کے باہمی تبادلۂ خیالات کا عکس ہیں جو اپنے طور پر ہنگامہ پرور اور عجیب و غریب واقع ہوئی ہیں۔ ان کی دوستی چالیس سال قبل شروع ہوئی تھی۔ اور آخر وقت تک قائم رہی۔ اقبال نہ صرف انہیں نظمیں بھیجتے تھے اور ان سے تنقید کے طالب ہوتے تھے بلکہ انہوں نے اپنے مقالے بھی یونیورسٹی میں بھیجنے سے پہلے انہیں پڑھ کر سنائے تھے اور اُن سے درخواست کی تھی کہ وہ ان پر تبصرہ کریں۔ چنانچہ بعض خطوط سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال ان کے تبصروں سے ایک حد تک مستفید بھی ہوئے! اپنے دلی درد یا سوز دروں کی کہانی اقبال نے اپنے خطوط میں انہیں کو اور غالباً صرف انہیں کو سنائی اور اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اقبال جانتے تھے کہ سوائے اُن کے اور کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جو ان کے دلی جذبات کو سمجھتی ہو۔ اور اُن کی قنوطیت کو دور کر کے ان میں روشنی اور سکون پیدا کر سکتی ہو۔ بہر حال دو یکساں طبیعت رکھنے والے افراد کی یہ نہ ٹوٹنے والی دوستی تھی جو خطوں کی شکل میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہی"۔ [1]

[1] اقبال عطیہ بیگم تمہید از ضیاء الدین احمد برنی۔ ص۔ ب۔ ج۔ اردو ایڈیشن ۱۹۵۶ء اقبال اکیڈمی لاہور
بحوالہ: شب خون ۱۰۵، ص ۳۶ - ۳۵

اورنگ زیب قاسمی

یورپ کے قیام کے دوران وہ عجیب کشمکش کے شکار ہوئے لیکن اس کشمکش کا اظہار مدتوں تک علامہ اقبال نہ کر سکے۔ ایک نکتہ جان لینا ضروری ہے کہ علامہ نے ۱۶ سال کی عمر میں شادی کی تھی اور یورپ جانے سے پہلے دو تین بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ لیکن یورپ کے قیام کے زمانے کے ایک خاص حصے پر میری نگاہ ہے۔ یورپ سے واپس آنے کے بعد آپ کے خیالات میں جو تبدیلیاں ہوئیں اور ۹ اپریل کو ایک طویل خط جو عطیہ فیضی کو لکھا اس سے اقبال کی نفسیاتی کشمکش کی گرہیں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اسی خط کو بنیاد بنایا ہے اور ان کے نفسیاتی مطالعہ کی ایک کڑی قرار دی ہے۔

"ہاں میں نے علیگڑھ کی فلسفہ کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور چند دن ہوئے میں نے لاہور گورنمنٹ کالج میں تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ کسی قسم کی ملازمت نہیں چاہتا۔ میرا مقصد ہے کہ میں جلد سے جلد اس ملک سے بھاگ کر کہیں چلا جاؤں۔ آپ کو اس کی وجہ معلوم ہے۔ میں اپنے بھائی کا ایک طرح کا اخلاقی قرضدار ہوں اور یہی چیز مجھے روک رہی ہے۔ میری زندگی سخت مصیبت بنی ہوئی ہے۔ وہ مجھ پر کوئی سی بھی بیوی زبردستی منڈھ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہ تھا۔ بالخصوص جب کہ میں نے اس قسم کے تعلق میں پڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس کی کفالت کرنے پر رضامند ہوں لیکن میں اسے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی اجیرن نہیں بنانا چاہتا، ہرگز نہیں۔ انسان ہونے کے ناطے مجھے مسرت اور خوشحالی حاصل کرنے کا حق ہے۔ اگر سوسائٹی یا فطرت مجھے وہ حق دینے سے انکار کرے تو میں دونوں کا کھلم کھلا مقابلہ کروں گا واحد علاج یہ ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو چھوڑ کر چلا جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ لوں۔ جو خودکشی کو آسان بنا دیتی ہے۔ کتابوں کے مردہ بنجر اوراق مجھے مسرت نہیں دے سکتے میری روح میں کافی آگ پنہاں ہے جو انہیں جلا سکتی ہے اور تمام سماجی رسوم کو بھی۔ آپ کہیں گی کہ اچھے خدا نے یہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر اس زندگی کے واقعات مختلف نتیجے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ کسی اچھے خدا کی بجائے ذہنی طور پر کسی قادر مطلق شیطان پر یقین لے آنا زیادہ آسان ہے۔ براہ کرم ان خیالات کے اظہار کے لئے معاف کیجئے گا میں ہمدردی کا خواستگار نہیں ہوں۔ میں تو صرف اپنی روح کے بوجھ کو اتار دینا چاہتا

تھا۔ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں اور اسی وجہ سے میں نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

مجھے امید ہے کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں نے ملازمت سے کیوں انکار کیا۔" [1]

اس خط کے بعد اس کا جواب عطیہ فیضی نے ایک طویل خط میں لکھا اور اقبال نے لکھا کہ آپ کے خط سے مجھے بہت سکون ملا۔ اس خط میں اقبال لکھتے ہیں :

"اور آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپایا کرتا اور میرا اعتقاد ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرے خطوط بالکل اطمینان دلانے والے نہیں ہوتے۔ لیکن اس کا سبب وہ وجوہ ہیں جن کا ذکر آپ نے گزشتہ خط میں کیا تھا مجھے فراموشی کا الزام دینے میں کوئی چیز نہیں بھولتا لیکن میں تشریح سننا پسند کروں گا محض یہ دیکھنے کے لئے کہ آپ کیا تشریح کرتی ہیں۔ گزشتہ رات بہشت میں جا پہنچا۔ دوزخ کے دروازوں میں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اس جگہ کو خوفناک طریقہ پر سرد پایا۔ جب فرشتوں نے مجھے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ یہ جگہ اپنی فطرت کے اعتبار سے سرد ہے۔ لیکن وہ شدت سے گرم ہو جاتی ہے اس لئے کہ ہر ایک شخص اپنے انگارے ساتھ لاتا ہے۔ اس ملک میں جہاں کوئلے کی کانیں بہت زیادہ نہیں ہیں۔ جتنے انگارے ممکن ہے جمع کر رہا ہوں.......

یہ خیال نہ کیجئے گا کہ میں یاس پسند ہوں میں آپ سے کہتا ہوں کہ تکلیف نہایت لذیذ چیز ہے اور میں اپنی بدقسمتی سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور ان لوگوں پر ہنستا ہوں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ خوش و خرم ہیں۔ آپ دیکھتی ہیں کہ میں اپنی مسرت کس طرح چھپا چھپا کر حاصل کر لیتا ہوں۔" [2]

بہا یو ہیٹ

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

بمبئی ۱۰ر ستمبر ۱۹۳۱ء
محمد اقبال

[1] شب خون ۱۵۰۔ اقبال کی زندگی میں دو اہم عورتیں از جگن ناتھ آزاد ص ۱۴۰
[2] " " " " " " " " " " " " ص ۱۴۱

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر سلیم اختر تحریر کرتے ہیں :

"اقبال نے یہ معنی خیز شعر اس وقت لکھا جب لندن اور ہائیڈل برگ میں عطیہ بیگم کے ساتھ گزرے لمحات کو گزرے لگ بھگ ربع صدی بیت چکی تھی وہ لمحات کیسے تھے؟ اُن کی شاہد عطیہ بیگم کی ڈائری ہے! وہ لمحات کس حد تک دور رس اثر ثابت ہوئے اس کا اندازہ عطیہ بیگم کے مکاتیب سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن در حقیقت تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں صرف قیاسات سے ہی کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسے معاملات میں قیاسات بعض اوقات تارِ عنکبوت سے بھی نازک ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً اس سلسلے میں ایک بنیادی سوال کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ کیا اقبال عطیہ سے شادی کے خواہاں تھے؟ لیکن اس کا جواب بھی واضح نہیں ہے۔ چنانچہ پروفیسر محمد عثمان نے عطیہ بیگم کے نام لکھے گئے خطوط کی بنا پر "حیات اقبال کا ایک جذباتی دور" میں (ص ۸۹) عطیہ بیگم کا نام لئے بغیر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اقبال عطیہ سے شادی کے خواہاں تھے۔ لیکن ان کے رشتہ دار خالد نظیر صوفی نے اس کی جذباتی انداز میں تردید کی ہے! یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ علامہ اقبال عطیہ بیگم کو ایک علمی دوست کی حیثیت سے تو پسند کر سکتے تھے لیکن بیوی کے روپ میں وہ ان کے لئے ناقابل قبول تھیں کیونکہ وہ جس قسم کی بیوی کے خواہش مند تھے وہ عطیہ سے مختلف تھی۔ عطیہ بیگم نے خود اور نواب آف جنجیرہ نے علامہ اقبال کو یورپ سے واپسی کے فوراً بعد جنجیرہ آنے کی دعوتیں دیں۔ لیکن انہوں نے ہر بار معروفیت کا عذر کر دیا۔ آخر کیوں؟ صاف ظاہر ہے کہ اقبال عطیہ کی دیرینہ خواہش (شادی) کو پورا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔" [1]

لیکن ڈاکٹر سلیم اختر، خالد نظیر صوفی کے دفاعی رویہ سے متفق نظر نہیں آتے اور اقبال کے شباب اور مردانگی اور "پنجابی خون" پر اصرار کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

"خالد نظیر صوفی کا ان امور میں انداز دفاعی ہے اس لئے اسے استدلال قرار نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ عطیہ بیگم کے نام لکھے گئے مکاتیب میں اقبال کی شخصیت کا ایک نیا اور انوکھا روپ نظر آتا ہے اس میں اچنبھا تو نہ ہونا چاہئے کہ اقبال بھی انسان تھا

[1] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۵۵ [2] اقبال درون خانہ از خالد نظیر صوفی ص ۱۴۲

تھے۔ لیکن قوم نے کیونکر یہ فراموش کر دیا کہ اقبال اور سب کچھ ہونے کے علاوہ مرد بھی تھا اس لئے ان خطوط کی تیز جذباتیت اور یاس سے دبے دبے شگفتگی کی کیفیت متعجب کرتی ہے۔"[1]

سلیم اختر صاحب نے عطیہ فیضی اور اقبال کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت چھان پھٹک کر لکھا ہے "اور اقبال اور عطیہ فیضی کے خطوط اور ڈائری کے مطالعہ سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ اہم ہیں اور ان سے کس حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہی نہیں اقبال کے بعض اشعار کے ذریعہ بھی انہوں نے اقبال کی فطرت کا نفسیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ اقبال جرمنی اور انگلینڈ میں عطیہ کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کو یاد کرتا ہے کبھی لطف اندوز ہوتا ہے اور کبھی کرب محسوس کرتا ہے۔ اقبال اور عطیہ فیضی ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق اطلاعات ہمیں عطیہ فیضی سے ہی ملتی ہیں چاہے خطوط کی شکل میں چاہے ان کی ڈائری کی صورت میں۔ اقبال کی شخصیت کا مطالعہ عطیہ نے اس انہماک اور دلچسپی سے کیا ہے کہ اقبال کا کوئی طالب علم مطالعہ اقبالیات کے دوران اسے نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی اقبال اور عطیہ کے خطوط اور ڈائری سے اپنی پسند کے مطابق ایک موضوع چن لیا اور وہ "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ تھا اور ڈاکٹر سلیم اختر نے صرف اس موضوع کے مطالعہ کے لئے عطیہ اور اقبال کے خطوط اور ڈائری پر ہی بھروسہ نہیں کیا بلکہ اقبال کے کلام سے بھی بھرپور استفادہ کیا اور اقبال کے مطالعہ کے لئے نئی راہیں ہموار کیں اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اقبال اور عطیہ کے تعلقات ایک "علمی دوست" کی حیثیت سے کچھ آگے بڑھ گئے تھے۔ لیکن بعد کے فیصلے انہوں نے بھی ایک سمجھدار مصنف کی طرح اپنے قاری پر ڈال دیئے ہیں۔

ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔؟

"کیا اقبال نرگسی تھے۔؟" دراصل یہ مضمون ہندوستان کے ادیب ڈاکٹر سلام سندیلوی کی کتاب "اردو شاعری میں نرگسیت" پر ایک بھرپور تبصرہ ہے۔ لیکن سلیم اختر صرف اس بات پر مُصِر نظر آتے ہیں کہ سلام سندیلوی نے اقبال کے اندر بھی اور ان کی شاعری کے اندر بھی نرگسیت کے جراثیم کو تلاش کیا اور ڈاکٹر سلیم اختر ڈاکٹر سلام سندیلوی کے اخذ کردہ نتائج سے متفق نہیں ہوئے۔

یونانی علم الاصنام میں نارسی سس NARCISSUS نام کے ایک نوجوان کی داستان ملتی

[1] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر مکتبہ عالیہ لاہور ص ۱۵۶

اورنگ زیب قاسمی

ہے۔ ایک یونانی دوشیزہ ECHO اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی۔ مگر نارسی سس کی علاقہ توجہی اور بے التفاتی نے ایک دن ایکو کی جان لے لی۔ اس جرم کے لئے یونانی دیوتاؤں نے نارسی سس کو سزا دی کہ وہ چشمے میں اپنا عکس دیکھ کر خود فریفتہ ہو جائے اور یہی صورت حال اس کی موت کا باعث بنی۔ بالآخر یہی ہوا۔ کہتے ہیں کہ نرگس کا جنم اسی خاک سے ہوا۔ وادئ کشمیر میں نرگس کا پودا پایا جاتا ہے۔ مارچ کے قریب جبکہ مہینوں سے پڑی ہوئی برف جب دھیرے دھیرے پگھلنے لگتی ہے تو اچانک یہ نقیب بہار نرگس کا پودا زمین کا سنگلاخ سینہ چیر کر ایک سہانی صبح باہر نکل آتا ہے اور اس میں سفید اور زرد پتے کھل اٹھتے ہیں اور دور دور تک یہ پھول نمایاں رہتے ہیں۔ مہینوں کے بعد ہری کونپل اور زرد پتے جنت نگاہ ثابت ہوتے ہیں۔ نرگسیت بھی تحلیل نفسی کا ایک نظریہ ہے۔ اور اس کی تفسیر و تشریح بھی مختلف انداز میں کی ہے۔

فرائڈ نے نرگسیت کو ابتدائی اور ثانوی میں تقسیم کیا ہے یعنی دو حصوں میں۔ ابتدائی نرگسیت کا مقصد اور مرکز جسم اور اس سے وابستہ جنسی اور حسی کیفیات کی لذت ہوتی ہے۔ جب کہ ثانوی نرگسیت کا مرکز جسم نہیں بلکہ اس کا محور ذہن بنتا ہے اور اس کا مظاہرہ تکمیل ذات کے حصول، مقاصد اور تخلیق کارشوں سے وابستہ فخر اور مسرت ہوتا ہے۔ فرائڈین اسکول کا ایک نقاد کیرن ہارنی بھی ہے۔ اور کیرن ہارنی نرگسی رجحان پر جبلی بنیاد کی روشنی میں غور نہیں کرتا بلکہ اس کو سماجی ماحول کا اثر قرار دیتا ہے۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اقبال کی شاعری کو بھی مختلف نفسیاتی زاویئے پر رکھا ہے۔ جیسے خودداری، خود پسندی، تخلیقی خواہش، تصوریت اور کنارہ کشی وغیرہ۔ پھر لکھتے ہیں کہ:

"ان کی شاعری کا مطالعہ بھی ان کی خودداری کو ثابت کرتا ہے۔"[1]

"اقبال کے بہت سارے اشعار سے ان کی خودداری پر روشنی پڑتی ہے۔ اقبال کی خودداری میں بڑی چمک دمک اور شگفتگی و زندگی ہے یہ خودداری ان کو نرگسی شعراء کے حلقے میں بٹھا رہی ہے۔"[2]

ڈاکٹر سلام سندیلوی مزید لکھتے ہیں:

[1] اردو شاعری میں نرگسیت از ڈاکٹر سلام سندیلوی ص ۵۴ ناشر نسیم بکڈپو لکھنؤ ۱۹۷۷ء
[2] " " " " " " " " ص " "

"اقبال کی شاعری میں اس قسم کی خودشناسی کی جھلکیاں جا بجا ملتی ہیں۔ اقبال سے قبل اس قسم کی خودشناسی اردو شعراء کے بعض اشعار میں پائی جاتی ہے؟ مگر اقبال نے اس موضوع کو اپنایا ہے اور اس کو بحیثیت فلسفہ پیش کرکے اس کے رموز و نکات سے ہم کو آگاہ کیا ہے۔ بہرحال خودشناسی بھی ایک قسم کی خودپسندی ہے اس لئے ہم اس رجحان کے اعتبار سے اقبال کو نرگسی شعراء کی انجمن میں جگہ دے سکتے ہیں۔" ؎۱

اس سلسلے میں موصوف نے اقبال کی مشہور نظم تصویر درد سے مختلف مثالیں پیش کی ہیں اور اقبال کی شاعری میں نرگسیت کے عناصر تلاش کئے ہیں۔

اپنے دعویٰ اور خیال کو موصوف نے اس طرح ثابت کیا ہے:

"اقبال کی تصوریت کا مرکز خودی ہے یہ خودی افراد اور اقوام دونوں کے لئے مفید اور ضروری ہے۔ اقبال نے خودی کی تشکیل کرکے اپنی انا کا اظہار کیا ہے جس سے اُن کی نرگسیت پرورش پاتی ہے۔" ؎۲

اگر اقبال کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے اندر انا بدرجۂ اتم موجود تھی اور وہ اپنے کو کسی سے کمتر نہیں مانتے تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر سید شبیہ الحسن کا بیان بھی قابل توجہ ہے۔

"اقبال کا تصور خودی شدید طور پر نرگسیت زدہ ہے۔ ان کی انا نہ دنیا میں تحلیل ہو پاتی ہے اور نہ الوہی جلووں میں۔ ان کا تصور خودی انتہائی نرگسیت پر مبنی ہونے کی وجہ سے غزل کا فطری جز بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ وہ چند غیر معتدل ذہنوں کو مطمئن کر سکتا ہے۔ جن کی نرگسیت مرض کی حد تک پہنچ گئی ہو۔ مگر غزل سے لطف اٹھانے والوں کی اکثریت ایسی نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے اقبال کی خودی باوجود اپنی گھن گرج کے انفرادیت کے اندھے کنوئیں سے باہر نکل کر سماج کا جز نہیں بن سکتی۔ وہ ایک چیخ ہے جو کانوں کو سُن کر سکتی ہے مگر دل میں اترنے کی صلاحیت نہیں ہے۔" ؎۳

لیکن ڈاکٹر سلیم اختر دونوں ہندوستانی نقادوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے:

؎۱ اردو شاعری میں نرگسیت از ڈاکٹر سلام سندیلوی ص ۹۵ ناشر نسیم بکڈپو لکھنؤ ۱۹۷۷ء
؎۲ از سلام
؎۳ تنقید و تحلیل از پروفیسر سید شبیہ الحسن ص ۹۵

اورنگ زیب قاسمی

"یہ جذباتی تحریک جس کا دلائل سے تعلق ہے اور نہ ہی اقبال کی تصورِ خودی سے۔ خودی کو اقبال کے فلسفے میں جو اساسی حیثیت حاصل ہے وہ اتنی واضح ہے اور اس پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اقبال کے افکار میں خودی کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لئے معروف ناقدین کے حوالے جمع کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔" ؎۱

اُن کا خیال ہے کہ جوش و حرکت و جدوجہد کا شاعر ہے جو وصل پر فراق کو اس لئے ترجیح دیتا ہے کہ اس طرح آرزو کا شعلہ فروزاں رہے گا اور جو سعیٔ مسلسل کی بنا پر جبرئیل پر ابلیس کو برتر کا دیتا ہو اس اقبال کے اساسی تصور کو محض نرگسیت زدہ قرار دیکر اسے جنسی دور کی طرف مراجعت کیسے کہا جا سکتا ہے؟

اقبال کی پہلی شادی اور خانگی زندگی

اقبال کی زندگی کے حوالوں کے سلسلے میں عطیہ بیگم کا نام بھی ضروری ہے۔ اقبال اُن سے اپنی کوئی چیز نہیں چھپاتے تھے بلکہ اپنے دل کی تمام باتوں کا اظہار بڑی فراخدلی سے کیا کرتے تھے۔ ایک خط میں انہوں نے لکھا ہے:-

"بائرن، گوئٹے اور شیلے کا ان کے لوگوں نے مطلق احترام نہیں کیا اور اگرچہ میں شاعرانہ اعتبار سے ان سے کہیں کم ہوں تاہم میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس بارے میں مجھے اُن سب کی رفاقت حاصل ہے۔"

یہ بات تو عیاں ہے کہ اقبال کی خانگی زندگی خاصی کشیدہ اور پر ملال تھی اور اس کا اظہار انہوں نے عطیہ بیگم کو کئی خطوط لکھ کر کیا اور یہاں تک لکھا کہ والد کو میرے لئے خاص طور سے شادی بیاہ کے معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ اور پھر یہ کہ میرے بھائی کا مجھ پر قرض ہے۔ میں اُسے اتارنا چاہتا ہوں اور میں ہندوستان سے باہر جانا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے سید حامد جلالی کی کتاب "علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی یعنی والدۂ آفتاب اقبال" پر ایک تجزیاتی نگاہ ڈالی ہے لیکن وہ حامد جلالی کے خیال سے مطمئن نہیں ہیں۔ اور لکھتے

؎۱ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۸۸-۹۹ مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء

ہیں کہ :

" مندرجہ بالا کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے شادی ہی کے موضوع پر ہے لیکن اس میں شادی کے علاوہ باقی سب کچھ مل جاتا ہے۔" ؎۱

حالانکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کی خانگی زندگی کو پُر فتن بنانے میں علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا بہت اہم رول تھا۔

" حضرت علامہ نے جس طرح بیوی کو بے حق کیا اسی طرح سے اس کے بیٹے کو بے حق کیا اور اس ظلم ناروا میں ان کے بھائی عطا محمد کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ آفتاب اقبال کی بجائے ان کا اپنا بیٹا جو قریب قریب آفتاب صاحب کے ہم عمر ہے علامہ کی توجہ کا مرکز بن جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ الغرض عطا محمد صاحب موصوف کا رویہ علامہ کی بیوی بچوں کے ساتھ ہمیشہ سے نہایت سخت اور معاندانہ تھا۔ آفتاب اقبال کو زدوکوب کرنا سب و ستم سے پیش آنا ان کا معمول تھا۔" ؎۲

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کا خیال ہے کہ " سید حامد جلالی نے یہ کتاب آفتاب اقبال کے ایما پر لکھی ہے۔"

دراصل یہ مضمون سلیم اختر صاحب کا سید حامد جلالی کی کتاب " علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی یعنی والدۂ آفتاب اقبال " پر ایک تبصرہ ہے جس میں سلیم اختر صاحب نے جناب جلالی کے خیالات کو رد کر دیا ہے اور ان کے خیالات سے متفق نظر نہیں آتے۔

ڈاکٹر سلیم اختر دوسری کتاب جو خالد نظیر صوفی کی تحریر کردہ ہے اور اس کا نام " اقبال درون خانہ " ہے کے بارے میں لکھتے ہیں :

" علامہ اقبال کی وفات سے لیکر اب تک ان کے بارے میں تاثراتی تحریروں اور نئی معلومات پر مبنی مضامین کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اب تک ختم نہیں ہوا .... اس لئے خالد نظیر صوفی کی تالیف " اقبال درون خانہ " کو بھی یوں ہی بے دلی سے دیکھنا شروع کیا لیکن چند صفحات کے مطالعہ کے بعد

؎۱ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۹۰

؎۲ اقبال کی پہلی شادی اور خانگی زندگی از سید حامد جلالی ص ۳۰، ۳۹ بحوالہ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از سلیم اختر ص ۹۲

اندازہ ہو گیا کہ عام ڈگر سے ہٹ کر ایک نئے انداز کی تالیف ہے۔" ؎۱

اور آخر میں سلیم اختر دونوں کتابوں سے متعلق اس فیصلہ پر پہنچتے ہیں :

" یہ دونوں کتابیں (علامہ اقبال کی پہلی بیوی یعنی والدۂ آفتاب اقبال اور اقبال درون خانہ) اقبال کی شخصیت کے دو پہلو سمجھنے میں خاصہ اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اول الذکر جس کا محرک گزشتہ ایام کی تلخی ہے اپنے اندر بہت سا ایسا کارآمد مواد رکھتی ہے جس سے بالواسطہ طور پر اقبال کی گھریلو زندگی کے درجۂ حرارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب کیونکہ دفاعی انداز کی حامل ہے اس لئے اس سے یہ تو نہیں معلوم ہوتا کہ اقبال اپنی پہلی بیوی سے کیوں تنگ تھے۔ لیکن اس اہم سوال سے قطع نظر یہ کتاب اور کئی باتوں کو منظر عام پر لاتی ہے۔ ایسی باتیں جن کی بابت کوئی باہر والا کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے مقابلہ میں " اقبال درون خانہ " البتہ خاصی ہلکی پھلکی کتاب ہے بلکہ بعض امور میں تفریحی بھی ثابت ہوتی ہے۔" ؎۲

اقبال کا تنقیدی شعور

تخلیق اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے کہ بغیر تنقید کے تخلیق میں جلا نہیں آ سکتی اور تخلیق کو چار چاند نہیں لگ سکتے۔ زمانہ قدیم سے ہی اردو شعراء میں تنقیدی صلاحیت موجود تھی اور اپنی شاعری کے ذریعہ سماج کے ساتھ ساتھ ادب و فن پر بھی گہری تنقیدی نگاہ ڈالتے تھے۔ مشاعروں میں استادان فن جمع ہوتے اور پیش کردہ غزلوں اور نظموں پر کھری تنقید کرتے۔ جن سے بعض لوگ تلملا اٹھتے اور یہاں تک کہ یاوہ گوئی اور ہزل پر اتر آتے۔

اقبال کے اندر بھی تنقیدی صلاحیت موجود تھی اور تنقید حیات کے قائل تھے اور خاص طور پر تعمیری تنقید۔ وہ ہجو اور ہزل گوئی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اقبال ایک مصلح قوم تھے اور ایسے معلم جس نے انسانیت سے خطاب کے لئے ادب کی لطیف ترین صنف یعنی شاعری کو اپنایا۔ اقبال چونکہ ایک مقصد پسند شاعر تھے اس لئے ادب یا اظہار کے دیگر سانچوں کے بارے میں خود اقبال کے

؎۱-۲ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۰۲-۱۰۰

اورنگ زیب قاسمی

اپنے مخصوص نظریات کا ہونا لازم ہے اور ادب و فن کی تشکیل نو پر زور دیتے ہوئے مختلف مواقع پر اشعار میں اپنے نظریۂ ادب کی تشریح و توضیح کی ہے اقبال کی تنقیدی بصیرت کے جائزے سے پہلے اس کا خیال ضروری ہے کہ وہ شاعر تھے فلسفی تھے، مصلح تھے وہ کوئی پیشہ ور نقاد نہیں تھے۔ انہوں نے زندگی اور اس کے مظاہر پر تنقیدی نگاہ تو ڈالی لیکن وہ آج کے معنوں میں کوئی ادبی ناقد نہ تھے لیکن اس کے باوجود اُن کا ادبی اور تنقیدی شعور کافی گہرا تھا۔

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست
کہ برمن تہمت شعر و سخن بست

اقبال کے افکار و خیالات کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ اقبال ادب برائے ادب کے نظریے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ادب برائے زندگی کے ہمنوا تھے۔ اس لئے کہ خود اقبال زندگی کے شاعر تھے۔ دراصل اقبال سے پہلے سرسید اور حالی نے بھی اس ادب برائے ادب والے نظریہ کو مسترد کر دیا تھا اور خود کو مرکزی نقطہ مان کر اپنے بالیدہ شعور کو اس راہ پر لگایا۔

اقبال نے ابلیس، خدا، شیطان، انسان اور دوسرے موضوعات پر کھل کر تنقیدیں کی ہیں لیکن اُن کی تنقید برائے بہتر زندگی تھی۔ اقبال ادب کو ایک زندہ اور حرکی عمل سمجھتے ہیں۔ جہاں افسردگی اور بے عملی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اکبر الہ آبادی کو کئی خطوط لکھے جس میں مورخہ ۱۱ رجون ۱۹۱۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا تمام لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے PESSIMISTIC LITERATURE کبھی زندہ نہیں رہ سکتا قوم کی زندگی کے لئے اس کا مطالعہ اور اس کے لٹریچر کا OPTIMISTIC ہونا ضروری ہے۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

کیا ہیں اس کی فکر کے بنیادی اجزا جن پر شاعر اعظم نے اپنی شاعری اور اپنے خیالات اور تنقیدی شعور کی عمارت کھڑی کی ہے۔ وہ بہت بڑا شاعر تھا اتنا بڑا کہ صدیوں میں ایسے شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ اقبال سے بھی ایک صاحب نے دریافت فرمایا کہ آپ شعر کیسے کہتے ہیں۔ ردیف، قافیہ کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ علامہ نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ فطرت کے اندر ہر تخلیقی فعل جس میں انسان کچھ پیدا کر سکتا ہے، ایک خاص جذبے کے ساتھ وابستہ ہے مجھکو جذبۂ شعر بھی ایک جنسی جذبہ معلوم ہوتا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

اس کی تحریک بھی اس طرح سے یک بیک پیدا ہو کر ناقابل یقین اور لذت آفریں معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ محض تشبیہ نہیں ہے کہ شاعر اپنے اشعار کو، مصنف اپنی تصنیف کو اور فن کار اپنی پیداوار کو اپنی اولاد سمجھتا ہے شاعر جس احساس کو آمد کہتے ہیں۔ اقبال نے اس کی ایسی دلکش تشریح کی کہ اس کی تمام نفسیات کو دو لفظوں میں ادا کر دیا۔

اقبال نے اپنے عہد کے تمام ممتاز دانشوروں اور ادیبوں سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا جس میں لمعہ حیدرآبادی، اکبر الہ آبادی، عطیہ بیگم، مولانا عبدالماجد دریابادی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، سید سلیمان ندوی اور شوکت حسین قابل ذکر ہیں۔ اقبال نے ادبی تنقید کو نہ تو کوئی نیا نظریہ دیا اور نہ ہی اپنے تنقیدی مباحث کی روشنی میں اہم عصر ادب کی تشریح و تعبیر کی۔ اگر اُن کے متفرق خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو بھی اس میں اُن کے تنقیدی شعور کی شرح و بسط نہ ملے گی صرف ہلکے پھلکے اشارے ملیں گے اس لئے کہ بقول اقبال "شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا۔"

اقبال نے اپنے سلسلۂ فن اور شاعری کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جو قابل مطالعہ ہے۔ اقبال کا اپنا شعری اور ادبی نظریہ ہے۔ قوم کی زندگی مصاف زیست میں اس کے عمل اور تنازع للبقا میں اس کی مثبت جد و جہد میں مضمر ہے۔ اس لئے ادب سمیت ہر وہ شے جو اس منصب سے قوم کو دور لے جائے اس میں پست ہمتی اور دوں ہمتی پیدا کرے اسے مقاصد جلیلہ سے عاری بنا دیتی ہے۔ اقبال اس کے مخالف ہیں اس لئے وہ غنائی شاعری سے لے کر تصوف تک سبھی کو مسلم قوم کے لئے مضر سمجھتے ہیں اور شاعری کو ایک خاص مقصد کا تابع قرار دیتے ہیں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

اقبال کے تصور فن کا اگر بے باکی سے مطالعہ کیا جائے تو دو باتیں خاص طور سے نظر آتی ہیں۔ اول یہ کہ اُن کی شاعری فرد کی شاعری نہیں تھی بلکہ قوم کی شاعری تھی اور اجتماعی شاعری تھی۔ دوسرے یہ کہ شاعری میں اُن کا مطمح نظر، فلسفہ و فکر دوسرے شعراء سے جداگانہ تھا۔ گرچہ وہ داغ کے شاگرد تھے لیکن داغ کی رہبری میں زیادہ دور تک نہ چل سکے اور ایک دوسرے موڑ پر جا کھڑے ہو گئے۔ حافظ کی روح اپنے اندر حلول کئے ہوئے محسوس کرنے کے باوجود وہ حافظ کے سحر سے آزاد ہو گئے اور رومی سے پیر و مرشدی کا رشتہ قائم کر لیا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے۔ حافظ اور داغ

دونوں فرد کے شاعر ہیں اور ذاتی احساسات سے اونچا نہیں جاتے۔ حالی جب اپنی قوم کے زوال کا رونا رو رہے تھے تو اقبال نے بھی کچھ اپنی قومی شاعری میں پیش کیا تھا لیکن حالی اقبال کے راہنما بن سکے بلکہ سمت نما بن گئے اور اقبال کو دوراہے سے ہٹا کر ایک نئی راہ کی طرف اشارہ کیا۔

زندگی سے فرار اور انحطاط پذیر معاشرتی حالات نے قسمت پرستی کے فلسفہ کو رواج دیا۔ معاشرہ جب طبقاتی درجہ بندی سے بالاتر ہو کر اخلاقی اقدار پیدا کرتا ہے تو تقدیر بدل جاتی ہے۔ جب 'عامۃ الناس' قسمت پرستی کے پرامن گوشے میں دھکیل دیئے جاتے ہیں تو اس وقت فقر و توکل قناعت اور قسمت بے عملی کا بہانہ بن جاتے ہیں۔ نتیجتاً ارتقاء کا عمل رک جاتا ہے۔ ایک صحت مند اور آزاد معاشرہ میں فقر و توکل ذریعہ ہیں اور ایسے معاشرے سے ادب اور فلسفہ ڈوب کر نکلتا ہے۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

اقبال کا سارا فلسفہ اس تصورِ حیات کی جڑیں کاٹتا ہے جس نے صدیوں سے مشرق کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اقبال کے فلسفۂ اجتماعیت کا لب لباب یہ ہے کہ وہ رموزِ کائنات کو طبقاتی طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ معاشرتی اقدار کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک انسانیت اس وقت تک قسمت کے بھنور میں چکر کاٹتی رہتی ہے جب تک اجتماعی روحِ حیات زمانہ کے اس طلسم کو نہ توڑ دے جس میں طبقاتی روح کو اجتماعی روح قرار دیا جاتا ہے۔

دراصل اقبال فطرت اور انسانی فطرت کو برابر پلڑے میں رکھنا چاہتے ہیں اس لئے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اقبال عمل اور جدوجہد کا شاعر ہے۔ لہٰذا ہر اس نظریہ، تصور و خیال کے خلاف ہے جس سے قوم کا مجموعی کردار داغ دار ہوتا ہو ہم ایک اجتماعی تصور کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنا سکتے ہیں اور اپنی منزل پا سکتے ہیں۔

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی اقبال کے فنی دھاروں کا بہت ہی دلکش خوبصورت اور برمحل حوالوں

اورنگ زیب قاسمی

سے ذکر کیا ہے اور ایک فنی تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

حالی اور اقبال کے مقاماتِ آہ و فغاں

حالی اور اقبال اپنے عہد کی دو اہم ادبی اور تہذیبی شخصیتیں ہیں اور دونوں نے اپنی قوم کی فلاح کی راہ تلاش کی۔ اس زمانے میں پنجاب میں ایک ادارہ انجمن حمایت اسلام، لاہور ہوا کرتا تھا اور اس کے سالانہ جلسوں میں اقبال نے اپنی دلگداز نظمیں پڑھیں۔ جیسے 'نالۂ یتیم'، 'فریادِ امت'، 'بہ حضور سرورِ کائنات'، 'اور دل'، اور متنازعہ فیہ نظم 'شکوہ' انجمن کے جلسہ (منعقدہ ۱۹۱۱ء) میں پڑھی گئی اور پھر 'جواب شکوہ'۔ یہ اقبال کی ان نظموں میں سے ہیں جن کی مقبولیت بدلتے ادبی نظریات اور پسند کے تغیر پذیر معائر کے باوجود اب تک برقرار ہیں۔

اردو میں حالی کی مسدس مدوجزر اسلام یا مسدس حالی نے بھی خوب دھوم مچائی اور زوال پذیر معاشرہ کو خوابِ گراں سے جگانے کی کوشش کی۔ اس مقام پر دونوں (حالی اور اقبال) قابلِ تعریف ہیں۔ جنہوں نے مسدس کے پیرایہ میں دو لازوال نظمیں لکھیں اور آج بھی دونوں کی افادیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

حالی نے ۱۸۵۷ء کا غدر دیکھا تو اقبال نے وہ انقلاب جو غدر کے بعد ہندوستانیوں کی زندگی میں پیدا ہوا۔ دونوں نے شاعری سے اصلاح کا کام لینا اپنا مقصد قرار دیا۔ لیکن اقبال حالی سے اس لحاظ سے بھی بڑھ گئے۔ حالی نے کہا تھا کہ:

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے!

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

" حالی کی اپنی فطرت میں جو زناری تھی اس کے نتیجے میں وہ بت شکنی کے باوجود پیروی مغربی کی صورت میں خداوندانِ نو کے لئے معبد تعمیر کر رہے تھے۔ قومی شاعر ہونے کے لحاظ سے اس بنا پر اقبال حالی سے بڑھ جاتے ہیں کہ اقبال نے سب سے پہلے مغرب کے سومناتھ پر حملہ کیا۔ لیکن غالباً حالی سے اتنے پختہ شعور کی توقع بے جا ہوگی اور بالخصوص ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں تو حالی (یا کوئی اور بھی) ۱۹۴۷ء کا خواب دیکھنے کی سکت نہ رکھتا تھا۔" [1]

[1] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۹۶

اس لئے اردو شاعری کی دنیا میں دلبستگی اور لطف انگیزی کا ماحول نیا رہو گیا۔ حالی کی اصلاحی شاعری کون سنتا سب ہی داغ اور امیر کے دیوانے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اقبال حالی کی عزت کرتے تھے۔

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
جاری ہے مرے لب پہ کلام حالی

اقبال نے یہ قطعہ لکھ کر حالی کی پذیرائی کی۔ سرسید اور حالی کی انگریز نوازی نے اُن کی شاعری کے بنیادی تضاد کو گہرا کر دیا۔ حالی اور ان کے معاصرین کے مقابلہ میں اقبال کی فکر تضادات سے پاک ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اقبال کو حالی کی مانند مفاہمت کی ضرورت نہ تھی۔ حالی کے وقت میں جن سیاسی امور پر لب کشائی گردن زدنی کے مترادف تھی اقبال کے زمانے تک وہ باتیں اتنی ضرر رساں نہ رہی تھیں۔

بعض معاملات میں حالی اور اقبال کی فکر کے دھارے آپس میں ملتے جلتے نظر آتے ہیں خاص طور سے مسدس حالی اور اقبال کے شکوہ جواب شکوہ کی روشنی میں، اس لئے کہ دونوں نے اپنی اس معرکہ آرا مسدس میں قوم کا رونا ہی بھر کے رویا ہے۔ حالی نے تو اپنی مسدس یاس و نا امیدی پر ختم کی اس لئے کہ حالی کو اپنے حوصلوں پر اعتماد تھا۔ لیکن قوم کی پست حالی سے امید نہیں تھی کہ اس میں سدھار ہو سکے گا۔ اقبال نے خدا اور بندہ کے مکالمہ کے ذریعہ قومی پستی کا نقشہ کھینچا ہے۔ لیکن بعض اختلافی امور کے باوجود دونوں کی بعض مشابہتوں کا مطالعہ دلچسپ ہے۔ اقبال نے مسجد قرطبہ، نوجوانانِ اسلام، مسلم اقوام اور قوم کے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اللہ سے شکوہ اقبال نے کیا لیکن حالی حدِ ادب سے نہ بڑھ پائے۔

حالی اور اقبال کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ دونوں نے ایک ہی مطمحِ نظر کے تحت شاعری کی ایک خاص مقصد اور منصب کے لئے۔

لیکن سلیم اختر کہتے ہیں:

"کیا اقبال کی صورت میں حالی کے مسدس 'مدوجزر اسلام' کی تکمیل نہیں ہو جاتی؟ اس سوال کا جواب کیا دیا جائے۔ بس یہی کہ حالی اور اقبال کی منزل ایک ہی تھی مگر راہیں الگ الگ"۔

مولانا الطاف حسین حالی کے مدوجزر اسلام اور علامہ کے شکوہ جواب شکوہ کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیا جائے تو اساسی نوعیت کی ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ حالی اور اقبال دونوں نے مسلمانوں کی گزشتہ عظمت کا احساس کرانے کی کوشش تو کی۔ لیکن حالی نے یاس اور نا امیدی پر مسدس ختم کی جبکہ اقبال جواب شکوہ میں رجائیت پر مبنی رویہ اپناتے ہیں۔ اس میں بھی ان دونوں کے مخصوص تاریخی حالات اور سیاسی تناظر کا بہت دخل ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کے شعری رویوں میں بتدریج تبدیلی کا تجزیاتی مطالعہ کرنے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ حالی نے کسی اضطراری جذبے کے تحت فوراً ہی مسدس کی داغ بیل نہ ڈالی تھی بلکہ اس تحریر کے پس منظر میں ان کی سوچ اور تصورات حیات پر مبنی ذہنی رویہ کارفرما تھا اور حالی نے اپنی قوم کے لئے ایک آئینہ خانہ بنایا جس میں وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔

مسدس حالی کی طرح شکوہ جواب شکوہ بھی مسلم قومیت کی شاعری ہے۔ خطاب صرف مسلمانوں سے ہے لیکن اقبال نے ان نظموں میں انسانی نفسیات سے گہری واقفیت کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں محض جوش دلا کر نعروں سے مستی پیدا کرنے والا بنانے کے برعکس ایک نفسیاتی حربہ بروئے کار لایا ہے۔ بلکہ شکوہ کے لہجے میں واسوخت کی یاد آتی ہے جس طرح واسوخت کا شاعر اپنے محبوب کو جلانے کی بات کرتا ہے اسی طرح اقبال بھی شکوہ میں ذرا ویسا انداز روا رکھتے ہیں۔ شکوہ کی اپنی جداگانہ نفسیات ہے اور اس کے اپنے مخصوص نفسی تقاضے ہیں۔ شکوہ کی اسی اساسی نقطے پر اساس استوار ہے کہ حرف شکایت اپنے لب پر لانے کے باوجود محبوب کی محبت دل سے نہیں نکالی جاتی۔ اپنی وفائیں جتانے اور اس کی بے وفائیاں یاد دلانے کے باوجود راہ وفا سے قدم ہٹایا نہیں جاتا۔ شکوہ اپنے بارے میں روا رکھے گئے برے سلوک کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے اور رشک و حسد کی بنا پر دوسروں سے اچھے سلوک کا بھی شکوہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر بنیادی جذبہ ایک ہی ہے یعنی اپنی ناقدری اور مظلومیت کا احساس دلا کر محبوب کے مقابلے میں خود کو بہتر ثابت کرنا اور اس مقصد کے لئے محبوب کو ظالم جفاگر ہرجائی وغیرہ ثابت کرنا لازم ہوتا ہے۔ اردو غزل میں شکوہ پر مبنی اشعار کا اگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے تجزیاتی مطالعہ کریں تو ان مذکورہ امور پر بالعموم جداگانہ طور سے زور دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات دونوں سے کام بھی لیا گیا ہے۔

غزل میں نئی جہت ــ اقبال

ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال کی غزلوں کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے اور ان کی تاریخ وار غزلوں

اورنگ زیب قاسمی

کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ جس وقت اقبال نے غزلیں کہنی شروع کیں اس وقت داغ کی غزل گوئی کی شہرت اپنے شباب پر تھی۔ اس زمانے کی شعری تخلیقات سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر صورتوں میں وہ طرز داغ کو اپنے سامنے رکھتے تھے۔ داغ زبان داں اور محاورہ ساز کے اعتبار سے اس وقت کی بہت معتبر شاعرانہ شخصیت تھی اس لئے اقبال بھی اس رنگ میں کامیاب غزلیں کہنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ کیوں کہ اس دور میں یہی چیز مقبولیت اور شہرت کی ضامن تھی۔ داغ نے اپنا عنفوان شباب قلعہ معلی میں گذارا تھا۔ اُن کے مزاج میں جو رنگینی تھی وہ دہلی کے سوز و گداز سے مناسبت نہیں رکھتی تھی چنانچہ وہ لکھنوی خارجیت اور معاملہ بندی کی طرف مائل ہوئے۔ دہلوی ہونے کی حیثیت سے دلی کی شاعری کی خصوصیات بھی ان کی شاعری پر اثر انداز ہوئیں۔ اس دہلی اور لکھنؤ کے امتزاج نے ایک نئی شاعری کو جنم دیا جو کہ داغ کا اپنا مخصوص رنگ تھا۔ اس دور میں لوگ داغ کے دلدادہ تھے۔ ہندوستان کے ہر حصے کے شاعر ان کے تلامذہ میں شامل تھے۔ یہاں تک کہ امیر مینائی جیسا شاعر اور ماہر فن اپنی عمر کے آخری حصے میں داغ کے رنگ کی غزلیں کہنے لگا۔ حالی جو اردو شاعری میں بنیادی تبدیلی کے خواہاں تھے وہ بھی داغ کی شاعری کو سراہتے تھے۔

اس وقت اقبال بھی داغ کے رنگ سے متاثر ہو کر غزلیں کہنے لگے۔ بحیثیت مجموعی انہوں نے بھی داغ کا رنگ اپنایا۔ چنانچہ اقبال کی ابتدائی غزلیں اسی انداز کی ہیں جیسے ؎

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

تامل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

یہ غزل مکمل طور سے داغ کے رنگ کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہی اٹھان وہی لب و لہجہ حاوی ہے۔ اقبال نے داغ کے رنگ میں بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ گو داغ کا سا رچاؤ ان کے یہاں نہ پیدا ہو سکا کیونکہ داغ کا رنگ ان کی شخصیت کا جزو تھا۔ جبکہ اقبال فطری طور پر اس سے مناسبت نہیں رکھتے تھے۔

بانگ درا کے پہلے حصے کی پہلی غزل :

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

اس غزل کا آخری شعر ہے :

کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ

ان اشعار میں روایتی تصوف اپنے رچے ہوئے انداز میں موجود ہے۔ اس غزل میں ایک اور شعر ہے ؎

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

دوسرا مصرعہ " تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ " ہمارے ذہن کو غزل کے عمومی تصور سے ہٹائے جاتا ہے۔ ہمارے تصور میں ایک ایسی شخصیت ابھرنے لگتی ہے جو دو بدو بات کرنے کی رکھتی ہے۔ جسے اپنی عظمت کا احساس ہے۔ اقبال نے گو روایتی انداز میں غزل گوئی شروع کی لیکن وہ بتدریج روایتی انداز سے ہٹتے چلے گئے تاکہ اس میں ایک مخصوص اختیاری انداز پیدا ہو سکے۔ انہوں نے روایتی حسن، عشق اور تصوف و اخلاق سے ہٹ کر حیات و کائنات کے گہرے مسائل کو غزل میں بیان کیا کہ غزل کی روح تغزل پوری آب و تاب سے برقرار رہی۔ اس انداز نے غزل کے دامن کو بڑی وسعت سے وسیع تر کیا۔

سلیم اختر نے اردو غزل کو دو[2] حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک غزل کے اندر جنس کا جسمانی تصور اور دوسرا لاجنس عشق۔ انہوں نے اس ضمن میں قلی قطب شاہ سے لیکر رشید اور مولانا حالی کی غزلوں کو زیر بحث لایا ہے اور اقبال کی طرف رجوع ہوئے۔ ان کی تاریخ وار غزلوں کا جائزہ پیش کیا اور اس نتیجے پر پہنچے :

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اقبال کی تمام شاعرانہ جد و جہد دراصل اسی ٹوٹے ہوئے تارے کو مہ کامل بنانے کے لئے تھی اور ان کی غزل اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ۔ " اقبال کی نثر کا مزاج " بھی ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک عالمانہ اور سنجیدہ مضمون ہے۔ فاضل مصنف نے اقبال کی نثری تخلیقات افکار و خیالات کا

اورنگ زیب قاسمی

ایک تجزیاتی اور ٹھوس مطالعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی گفتگو کا آغاز اقبال کی پہلی نثری تصنیف "علم الاقتصاد" سے کیا ہے۔ جسے خود علامہ نے اپنی "علمی کوششوں کا پہلا ثمر" قرار دیا ہے۔ نثر سے اقبال کو کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہونے کے باوجود اقبال کی پہلی تخلیق نثری کی ہے۔

اقبال کی نثری صنف کے مطالعہ میں بہر حال اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ اقبال نے اپنے کو روایتی اور پیشہ ور نثر نگاروں اور شاعروں سے الگ رکھا اور اپنے اس تصور اور خیال پر اصرار کی صورتوں میں کیا مثلاً ایک خط میں رقم طراز ہیں :

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے"۔ [۱]

مولوی احمد علی کو لکھتے ہیں :

"دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے فرصت کے اوقات کے لئے شاعری سے بہتر مصرف تلاش کریں۔ اگر اردو کی خدمت کا شوق ہو تو اس وقت نظم سے زیادہ نثر کی ضرورت ہے"۔ [۲]

اقبال سرسید عہد کی پیداوار ہیں اور یہ دور خصوصی طور پر نثر کا دور رہا ہے۔ سرسید، حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد وغیرہ نے اپنی شہرت کے مینارے نثر ہی کے ذریعہ قائم کئے۔ اس لئے سلیم اختر صاحب نے اقبال کی نثر کے سلسلے میں لکھا ہے :

"مجھے تو اقبال کی نثر سرسید کی نثر سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے۔
میرے خیال میں اقبال کی نثر کے اساسی اوصاف میں اس کا منطقی رنگ، غیر ضروری طوالت سے احتراز کرتے ہوئے مواد کی مدلل پیش کش، عالمانہ متانت کی خشکی وغیرہ کو بطور خاص گنا جا سکتا ہے اور یہی تمام اوصاف سرسید کی نثر میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ البتہ سرسید کے برعکس اقبال کو انگریزی الفاظ کے استعمال کا شوق نہیں

---

[۱] اقبال نامہ ص ۱۹۶

[۲] اقبال نامہ ص ۲۶۵

اورنگ زیب قاسمی

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اقبال انگریزی پر بھی عالمانہ دستگاہ رکھتے تھے۔ یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی اور انگریزوں سے قطعاً مرعوب نہ تھے اس لئے وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ تھے جس میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے دانشور مبتلا نظر آتے ہیں"۔ [۱]

اقبال کی نثر کی مثال ملاحظہ ہو :

"نوع انسانی کی موجودہ ترقی جیسا کہ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کوئی سستے داموں کی چیز نہیں ہے۔ سیکڑوں قومیں علمی اور تمدنی ترقی کی حسین دیوی کے لئے قربان ہوتی ہیں اور ہزاروں افراد کا خون اس کی خوفناک قربان گاہ پر بہایا جاتا ہے۔ جنگیں، وبائیں اور قحط اس ہمہ گیر قانون کے عمل کی عام صورتیں ہیں اور اگر ان کو ارتقائے نوع انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ واقعات جو بظاہر آفات سماوی معلوم ہوتے ہیں۔ طبقۂ انسانی کے لئے ایک برکت ہیں جس کا وجود نظام قدرت کی آراستگی کے لئے اعتبار رجحہ کا ضروری ہے۔۔۔ [۲]

(قومی زندگی)

دیکھا جائے تو اقبال کی نثری اور شعری تخلیقات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بقول سلیم اختر صاحب

"اقبال کی نثر اور شاعری کا بیک وقت مطالعہ کرنے پر یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ دو الگ شخصیتوں کا اظہار ہے مجھے تو نثر نگار اقبال وکیل نظر آتا ہے۔ اس کی نثر میں ادبی حسن کے مقابلے میں "لیگل ڈرافٹنگ" کا انداز زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔۔۔

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

اور اسی پر مضمون ختم کیا جا سکتا ہے کہ شاعر اقبال کا فنی منصب اسی سے واضح ہو جاتا ہے وہ فنی منصب جس کی تشریح اس کی نثر سے بھی ہو جاتی ہے۔

عِلمُ الاقتصاد (یعنی سیاستِ مُدُن)

یہ اردو زبان معاشیات، اخلاقیات اور سماجیات پر اقبال کی وہ پہلی باضابطہ تصنیف ہے جسے

---

[۱] + [۲] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۲۴ — ۲۲۳

سا طور پر ایک معیاری کتاب کہا جا سکتا ہے۔ اس کی زیادہ شہرت نہ ہونے کی وجہ تھی کہ اقبال نے اسے دوبارہ شائع نہ کرایا اور اردو داں حلقہ میں اس طرح کے موضوعاتی مضامین کا زیادہ چرچا نہ تھا۔ دوسرے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کے نظریات بھی تبدیل ہوتے گئے۔ لیکن اقتصادی مسائل سے ان کی دلچسپی آخر دم تک قائم رہی اور آخری دور میں جو خطوط قائداعظم محمد علی جناح کے نام لکھے تھے ان میں اقبال نے بار بار اسلامی مملکت کے قیام کے نصب العین کے علاوہ اقتصادی بہتری کی طرف بھی توجہ دلائی تھی۔ یہ تصنیف عرصہ سے نایاب تھی اور ۱۹۶۱ء میں اقبال اکیڈمی کراچی نے دوبارہ شائع کیا۔

"اس کتاب میں علم الاقتصاد کے دقیق اصولوں کی توضیح کے ساتھ ساتھ مصنف نے ہندوستان کی موجودہ تمدنی، اخلاقی اور اقتصادی حالات کی طرف لطیف اشارے کئے ہیں جن سے پڑھنے والوں کی نظر وسیع ہوتی ہے۔ اور اس کو مسائل الاقتصاد پر آزادانہ غور کرنے کی تحریک ملتی ہے۔ اقتصادی اصطلاحات کا ترجمہ اس دور میں دشوار تھا۔ آپ نے علامہ شبلی نعمانی سے اس میں مدد لی اور کچھ مصر کے اخباروں سے بھی مدد لی۔ خود علامہ نے لکھا ہے کہ میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئی علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر با مذاق آدمی جانتا ہے۔ میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں۔ جو آج کل عربی زبان میں متداول ہیں۔"

(دیباچہ علم الاقتصاد)

صدی کی ابتداء سے ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی بے شمار مسائل پیدا کر رہی تھی۔ اس دور میں تحدید نسل کا نظریہ نہ صرف درست بلکہ انقلابی معلوم ہوتا تھا۔ اسراف بے جا بھی ہندوستان کی غربت کا بڑا سبب ہے جس کی بنا پر ہندوستان کے غریب عوام مہاجنوں اور محدود مراعات یافتہ طبقے کے ظلم و ستم میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس حالت میں سادگی اور کفایت شعاری پر زور وقت کی اہم ضرورت تھی۔ انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ بھی ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن اقبال نے اس مرحلے کو بھی بخیر و خوبی حل کیا۔ بعض اصطلاحات تو اب بھی جوں کی

اورنگ زیب قاسمی

توں استعمال کی جا سکتی ہیں۔ آپ نے ہندوستان سے غربت دور کرنے کے لئے زور دیا تھا کہ یہاں بھی مشینیں لگائی جائیں اور جدید ترقیات سے فائدہ اٹھایا جائے تاکہ ہندوستان محض خام مال کی منڈی نہ بن جائے بلکہ اعلیٰ درجہ کی معیاری اشیاء خود پیدا کرے اور اس طرح ہندوستان زرعی دور سے نکل کر مشینی دور میں داخل ہو جائے۔

"اقبال کا تجزیاتی مطالعہ" کے ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اُن عوامل کی تلاش اور تحقیق کی کہ علامہ اقبال پر سب سے پہلا انتقادی مضمون کس نے لکھا۔ لیکن فوراً ہی وہ ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں:

"اقبال پر سب سے پہلا باضابطہ تنقیدی مقالہ کس نے قلم بند کیا۔ اس کے بارے میں تو اب وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے البتہ یہ ہے کہ تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی شہرت کے باعث وہ جلد ہی مرکز نقد بن گئے ہوں گے۔" [1]

میرے خیال میں اقبال کی شاعری کو وزن اور وقار بخشنے والے وہ جلسے ہیں جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے زیر اہتمام منعقد کئے جاتے تھے اور جس میں ملک کے جید ادبا اور شعراء شریک ہوا کرتے تھے اور اقبال اپنی قومی اور وطنی نظمیں سنایا کرتے تھے اور مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔ اُن جلسوں میں حالی، امیر مینائی، شبلی، وغیرہ باقاعدگی سے شرکت کیا کرتے تھے۔ اقبال کے پہلے ناقد تو مجھ ناچیز کے خیال میں وہ عوام تھے جو اپنے فنکاروں کو سننے کے لئے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا: مخزن کے ایڈیٹر سر عبدالقادر نے بھی ان کی بعض نظموں کی اشاعت میں خصوصی نوٹس دیئے ہیں۔ وہ بھی نقد ادب کی کڑی قرار دی جا سکتی ہے۔ "اسرار خودی" کی اشاعت پر زور زیادہ زور دار طریقہ سے ان پر مخالفت اور موافقت کا دور شروع ہوا۔ بانگ درا کی اولین اشاعت کے دیباچے میں بھی اقبال کی شاعری سے متعلق سر عبدالقادر کا ایک خصوصی دلچسپ مضمون ہے جو کلام اقبال کی تفہیم کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس موضوع پر کافی چھان بین کی اور نقد اقبال کے سلسلے میں بہت سارے مفید باتیں پیش کی ہیں اور مضمون کے آخر میں علامہ اقبال پر لکھے گئے ابتدائی زمانوں کے مضامین اور ان کے مصنفین کے نام کے ساتھ ایک فہرست ہے جو کلام اقبال کے نقد و نظر میں معاون ہوگی "نشاۃ الثانیہ کا نقیب ـــــ اقبال" کے تحت موصوف نے لکھا ہے کہ:

---

[1] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۵۵

"علامہ اقبال تاریخ کے جس دور میں بقید حیات رہے وہ ملت اسلامیہ کے لئے تاریکی اور ادبار کا دور تھا۔ برصغیر کی غلامی اور عالم اسلام کی سیاسی پسماندگی ایسے وقوعات نہ تھے کہ اقبال ایسا حساس شاعر ان سے آنکھیں بند کئے رکھتا اور اسی لئے اقبال نے فارسی کے ذریعہ تمام مسلمانوں سے خطاب کی سعی کی۔ یوں علامہ اقبال کے پیغام کی دو جہات بن جاتی ہیں۔ ایک برصغیر کے مسلمانوں کے لئے اور دوسری مسلمانان عالم کے لئے۔ لیکن دونوں کی فکری اساس ایک تھی۔ اس لئے دائرہ اور وسعت اثر میں کمی بیشی کے باوجود یہ ہم مرکز دائرے بن جاتے ہیں۔۔۔ ۱؎

عصر حاضر میں قوم کی تعمیر نو کا تصور سب سے پہلے جمال الدین افغانی مرحوم نے پیش کیا اور یہ اُن کے دماغ کی اولین اُپج ہے۔ علامہ موصوف بلاشبہ خالق کائنات کی طرف سے ایک دردمند دل اور عقابی نگاہ لیکر آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اسلامی ملکوں کا جائزہ لیا تو انہیں ہر ملک میں مسلم معاشرہ روبہ زوال نظر آیا۔ چنانچہ انہوں نے ان اسباب کا کھوج لگانا شروع کیا۔ جن کی وجہ سے نہ صرف قومی انحطاط پیدا ہوا تھا بلکہ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ زوال کا باعث یہ ہے کہ زمانے کے نئے تقاضوں اور ان کی زندگی میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کی جس قدر عظیم الشان کوشش کی اس کی بنا پر ہم انہیں بلا مبالغہ مسلمانان عالم کی نشاۃ الثانیہ کا بانی اور اولین علمبردار کہہ سکتے ہیں۔ ان کی مقناطیسی اور متحرک شخصیت ان کے عمیق اور زندگی بخش افکار نے تمام دنیائے اسلام میں بیداری کی لہر پیدا کردی۔ چنانچہ ترکی میں سعید حلیم پاشا، مصر میں مفتی عبدہ اور علامہ رشید رضا، سوڈان میں مہدی سوڈانی وغیرہ، طرابلس میں شیخ محمد ادریس السنوسی اور ہندوستان میں علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اُن کے افکار کی اشاعت کی اور ہندی مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دیا چنانچہ کہتے ہیں ؎

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

علامہ اقبال نے علامہ افغانی اور حلیم پاشا دونوں کو اپنی زندہ جاوید تصنیف 'جاوید نامہ'

۱؎ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۷۲

اورنگ زیب قاسمی

میں فلک عطارد میں دکھایا ہے اور ان کی زبان سے مسلمانان عالم کو پیغام بھی دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"حالات حاضرہ کا مطالعہ کرو۔ اپنی اجتماعی زندگی کا جائزہ لو اس سرعت کا اندازہ کرو جس کے ساتھ زمانہ بدل رہا ہے۔ عصر حاضر اور اپنی اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرو اپنے قوانین اور عصر حاضر کے تقاضوں میں مطابقت پیدا کرو تاکہ اقوام عالم کی صف میں عزت کا مقام حاصل کر سکو اور اس عالم نو کی تشکیل میں حصہ لے سکو جو پردۂ تقدیر سے بتدریج باہر نکل رہا ہے"

اگر علامہ اقبال کے کلام کا تفصیل سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو سکتی ہے کہ انہوں نے ساری عمر مسلمانوں کو عالم نو اور حیات نو کی تعمیر و تشکیل کی دعوت دی۔ بیسویں صدی میں ان کے سوا کسی شاعر نے انسان سے یہ نہیں کہا ؎

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

اُن کی نگاہوں نے یہ حقیقت دیکھ لی تھی کہ عصر حاضر میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت عنقریب ایک نئی دنیا کا ظہور ہوگا۔ اگر مسلمانوں نے اپنی قومی زندگی کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا اور قوم کی از سر نو تعمیر و تشکیل نہ کی تو وہ پیچھے رہ جائیں گے کیونکہ زمانہ کسی فرد یا قوم کا انتظار نہیں کرتا۔ جو قومیں بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت نہیں کرتیں یا تو وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں یا ترقی یافتہ قوموں کی دست نگر بن کر رہ جاتی ہیں ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے :

"فکر کی یہ وہ منزل ہے جہاں اقبال ایک وسیع تناظر میں ملی وحدت کی نشاۃ الثانیہ پیش کر سکتے تھے۔ پہلے اسلام ازم ایک مجرد تصور نہ تھا اقبال کے لئے بلکہ جیسا کہ سطور بالا میں تجزیاتی مطالعہ سے واضح کیا گیا ان کی سوچ کا منطقی نتیجہ بنتا ہے وطن، جمعیت اور ملت کے بارے میں ان تصورات کے بعد مسلمانوں کو ایک وسیع کل میں اور دنیا کی وحدت کے رشتے میں منسلک دیکھنا ان کی اپنی سوچ کے رخ

کے عین مطابق تھا ہاں! ملت کی منزل پر پہنچ کر اگر وہ ملی وحدت کا تصور پیش نہ کرتے تو یہ یقیناً باعث تعجب ہو سکتا تھا یہ امر ملی وحدت کی نشاۃ الثانیہ کے لئے لازم تھا۔" [۱]

"اقبال اور نظریۂ پاکستان" کی اساس ان خیالات پر ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اقبال نے مسلم قوم کے لئے ایک ملک اور الگ حکومت کی وکالت کی تھی اور نظریۂ پاکستان پیش کیا تھا۔ یہ تو واضح ہے کہ اقبال ایک سیاسی آدمی نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود دنیا میں پیش آنے والے واقعات سے ایک حساس فن کار ہونے کے ناطے غافل نہیں تھے۔ اور وہ ہندوستان میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور اس کا اظہار وہ شعر و نثر کے ذریعہ بھی کیا کرتے تھے۔ نظریۂ پاکستان سے متعلق انہوں نے کچھ اشارے کئے ہیں شاعرانہ اشارے جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان سے نظریہ پاکستان کو تقویت اور حمایت حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ بریں قائداعظم محمد علی جناح سے خصوصی تعلقات تھے اور انہیں بھی اکثر خطوط لکھا کرتے تھے اور ان کی قیادت کو تسلیم کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے اندر اور باہر کی دنیا پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس ملک میں محض معاشی مسئلہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ تہذیبی مسئلہ ہندوستان کے بیشتر مسلمانوں کے لئے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کم از کم اسے معاشی مسائل سے بلحاظ اہمیت کسی طرح سے بھی کمتر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ہندوؤں پر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کی سیاسی چالیں خواہ وہ کتنی لطیف ہی کیوں نہ ہوں، ہند کے مسلمانوں کو اپنے تہذیبی تشخص سے باز نہیں رکھ سکتیں۔"

اقبال بنام قائداعظم

حالانکہ بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مسلم لیگ نے پاکستان کی داغ بیل ڈالی وہ مسلم لیگ صحیح طور پر اقبال کے خوابوں کی تکمیل نہیں کر سکی اور اس سیاسی جماعت کو بھی اس خاص معاملے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ سیاسی جبریت کا شکار ہو گئی۔

اب سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ "کیا آج اقبال کی ضرورت ہے"، میرے خیال میں اقبال کے پیغامات صرف کسی خاص دور کے لئے نہیں تھے بلکہ ان کی اہمیت دائمی ہے اور دنیا کے مسلمان آج بھی ان سے روشنی حاصل کر سکتے ہیں اس لئے کہ سیاسی اعتبار اور معاشی طور پر آج کا ہندوستان اور

---

[۱] اقبال کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۸۲

اورنگ زیب قاسمی

پاکستان کا مسلمان زیادہ باشعور اور معاشی طور پر زیادہ خوش حال نہیں ہو سکا ہے۔ اس لئے اقبال کے پیام کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے "نیل کے ساحل سے لیکر تا بہ خاک کاشغر" ملت اسلامیہ کے اتحاد کا جو خواب ہے وہ آج بھی ادھورا ہے۔

اقبال شعاع صد رنگ

یہ ڈاکٹر سلیم اختر کی تالیف ہے۔ موصوف نے اپنی صلاحیت، محنت، لگن اور مطالعہ کی وجہ سے اردو ادب و تنقید میں اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے۔ اور انہیں علامہ اقبال کی ذات و صفات سے ایک تعلق خاص ہے۔ جس کا اظہار وہ مختلف مواقع پر اپنی تحریر اور تقریر کے ذریعہ کیا کرتے ہیں زیر مطالعہ کتاب "اقبال شعاع صد رنگ" بھی اقبال کی زندگی کے بیشتر گوشوں کو روشن اور تابناک کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس تالیف کو سلیم اختر کے چمن عقیدت کا گل سرسبد سے تعبیر کیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے اقبال کو اقبال بنانے میں جہاں خود اقبال کی محنت ذہانت روشن بینی اور بلند خیالی کو دخل ہے وہیں ان نقادان کرام کا بھی کم حصہ نہیں ہے جنہوں نے اقبال کے تصورات، خیالات اور پیغامات کو عام کرنے میں بیش بہا حصہ لیا ان عقیدتمندوں میں اگر سلیم اختر کو بھی شامل کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"اقبال پر سب سے زیادہ لکھے جانے کے باوجود موضوعات اور مباحث میں تکرار و توارد کی بنا پر اقبالیات کی ذیل میں آنے والے مقالات کی فکری سطح بالعموم اتنی بلند نہیں ہوتی کہ ان سب کو اقبال شناسی میں جگہ دی جا سکے۔ عقل، عشق، خودی، مرد مومن، اسلام، مغربی تہذیب، سعی و عمل اور اس انداز کے موضوعات تو سدا بہار ہیں اور بلا مبالغہ صرف ان ہی پر سیکڑوں مقالات لکھے گئے ہوں گے۔"

سلیم اختر نے درست لکھا ہے کہ اقبال کے سلسلہ میں کسی نئی جہت کا سراغ نہیں ملتا، [illegible] شخصی مضامین، یادداشتیں، ملاقاتیں، سفرنامے، "ٹائپ کی چیزیں اقبال شناسی کی فہرست میں ڈال دی گئیں۔ ضرورت ہے کہ اقبال کو ذرا اس سے ہٹ کر دیکھا جائے اس لحاظ سے سلیم اختر کی تصنیف "اقبال شعاع صد رنگ" کتابوں کی بھیڑ میں یقیناً پہچانا جانے والا چہرہ اور اقبال اور عہد اقبال سے مزین یہ کتاب قارئین کو دعوت نظر دیتی ہے "اقبال شعاع صد رنگ" کی بنیادی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

سلیم اختر نے لکھا ہے :

"اقبالیات کے دورِ اول میں لکھے گئے بعض مقالات کا انتخاب ہے۔ فہرست مقالات پر ایک نظر ڈالنے سے موضوعات میں تنوع کا احساس ہو جاتا ہے۔ ان مقالات کے انتخاب کا صرف ایک جواز ہے کہ یہ دورِ اول کے فراموش کردہ مقالات ہیں۔ آج شاید ان کی ادبی حیثیت نہ محسوس ہو لیکن ان کی تاریخی حیثیت کو جھٹلانا ناممکن ہے۔ اور نہیں تو اسی بنا پر کہ ۱۹۳۸ء تک فکرِ اقبال کے جتنے گوشے کھنگالے جا چکے تھے۔ سرسری نگاہی سے ہی جائزہ لینے پر یہ معنی خیز حقیقت بھی اجاگر ہوتی ہے کہ آج جن موضوعات پر ہمارے ناقدین بطورِ خاص خامہ فرسائی کرتے ہیں ان میں سے بیشتر ۱۹۳۸ء تک لکھا جا چکا تھا۔" [1]

یہ حقیقت ہے کہ اقبال کے سلسلہ میں آج کل جو بھی مقالات سامنے آ رہے ہیں ان میں بیشتر وہ گیرائی اور گہرائی نہیں ہے جو اس کتاب میں شامل مقالوں سے ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ خاص طور سے م۔م۔ جوہر میرٹھی کا مقالہ "اقبال اور مارکس کے زاویہ ہائے نگاہ" اور مرزا صفدر بیگ کا مقالہ "اقبال اور اشتراکیت" تو بہتر طور پر قابلِ مطالعہ ہے اس لئے کہ کسی بڑے اسلامی قومی شاعر سے کارل مارکس وغیرہ کا تعلق قائم کر دینا اس زمانے میں چھوا چھوت کا معاملہ ہو جاتا تھا۔ لیکن باہمت ادیبوں نے اقبال کی شاعری میں مارکسی اور اشتراکی خیالات بھی ڈھونڈ لئے۔

مخدوم محی الدین کا مقالہ "مجاہد اقبال" خود مخدوم کے اپنے سیاسی نظریہ کی اپج ہے اسے بھی پڑھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اس کے علاوہ بھی اسلوب احمد انصاری کا مقالہ "اقبال کا ذہنی ارتقا" انصاری صاحب کے گہرے مطالعے کا پاسدار ہے۔

دیا نرائن نگم کے مقالہ "علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال" پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تو کوئی حرج نہیں کہ دیا نرائن نگم صرف ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ ایک اسکول اور ایک ادبی ادارے کے ساتھ اردو کے محسن کا نام ہے۔

بقیہ مقالات بھی دعوتِ نظر دیتے ہیں۔ سلیم اختر کی یہ کاوش اقبال سے ان کی عقیدت کی غماز ہے۔

اقبال کے افکار میں اتنا تنوع اور اتنی ثروت ہے کہ اگر اس کے تفکر و تاثر کے ہر پہلو کی توضیح و تشریح اختصار سے بھی کی جائے تو ہزار ہا صفحات بھی اس کے لئے کافی نہ ہوں گے وہ مشرق و مغرب کے کم از کم سہ ہزار سالہ ارتقائے فکر کا وارث ہے۔ اقبال سے کتنی صدیاں پیشتر مسلمان حکما، صوفیا،

[1] اقبال شعاع صدر نگ۔ پیش لفظ از سلیم اختر صفحہ ۱۱

اورنگ زیب قاسمی

شعرائے کرام اور مفکرین نے انسان کے ماضی کی تمام دولت علم و ہنر کو سمیٹ کر اس کو کیمیائے اسلام سے اکسیرِ حیات بنا دیا۔ اسلام ادیانِ عالیہ کی آخری ارتقائی شکل تھی۔ اقبال نے اپنے فکر و فن کو انہیں خیالات سے روشن کیا جو اُسے قرآن اور حدیث سے ملے تھے۔

فکرِ اقبال کا تعارف

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "فکرِ اقبال کا تعارف" خاتون ادیبہ لوس کلوڈ میتیخ کی کتاب کا اردو روپ ہے جو شاید ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ملا عبدالمجید ڈار ۱۹۶۲ء میں اور بعد میں یعنی ۱۹۸۳ء میں سلیم اختر نے "فکرِ اقبال کا تعارف" کے نام سے شائع کیا۔

"اسرارِ خودی" کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال کی شہرت یہاں سے وہاں تک پھیل گئی اور اُن کی آواز برصغیر سے نکل کر مغربی ممالک میں گونجنے لگی۔ اسرارِ خودی کا ترجمہ پروفیسر نکلسن نے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔ بعد میں فرانس، جرمنی، روس، اٹلی، امریکہ، کینیڈا، اسپین، سویڈن، چیکوسلواکیہ سے لیکر سری لنکا تک اقبال کے مطالعہ کا ذوق و شوق پیدا ہوا۔ واضح ہو کہ ان تمام ممالک میں علامہ اقبال کے شعری مجموعے اردو فارسی کے علاوہ انگریزی اور مقامی زبانوں میں دستیاب ہیں۔

سلیم اختر لکھتے ہیں :

"برطانیہ میں پروفیسر نکلسن کے علاوہ پروفیسر آربری نے جاوید نامہ، رموزِ بیخودی، زبورِ عجم، شکوہ جواب شکوہ اور پیامِ مشرق سے لالۂ طور کا ترجمہ کیا ہے۔ وی۔ جے کیرنن نے ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کے علاوہ منتخب نظموں کے تراجم کئے ہیں۔ مغربی جرمنی کی ڈاکٹر شمل نے اقبال شناسی میں مخصوص نام پیدا کیا۔ چنانچہ پیامِ مشرق اور جاوید نامہ کے منظوم تراجم کے علاوہ انہوں نے موخر الذکر کا ترکی زبان میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ علامہ اقبال کے فکر و فن پر مبنی مقالات کا ایک مجموعہ "محمد اقبال شاعر مفکر" کے نام سے طبع کر چکی ہیں۔ اس کتاب میں اقبال کی بعض نظموں کے انگریزی اور جرمن تراجم بھی ہیں۔ غرض کہ اقبال کے فن اور شخصیت پر دوسرے ممالک میں مطالعے جاری تھے اور آج تک جاری ہیں۔ روس اور چیکوسلواکیہ میں بھی اقبال پر مطالعہ کا کام جاری ہے۔ فرانس کی مادام ایوا ماریوچ اقبال شناس کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔" [1]

[1] فکرِ اقبال کا تعارف تالیف ڈاکٹر سلیم اختر پیش لفظ ص ۱۱

زیرِ نظر کتاب "فکرِ اقبال کا تعارف" جو مادام لوس کلوڈ میتغ کی تصنیف ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ
اس کتاب میں فکرِ اقبال کا سرسری مطالعہ روا رکھا گیا ہوگا لیکن حقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ اقبال کی فکر کے
تمام گوشوں پر مختصر ہی سہی لیکن جامع طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور فرانسیسی زبان جاننے والوں کے لئے یقیناً یہ
کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی ہوگی۔ سلیم اختر نے اس کتاب کے ترجمے کے بعد اسے دو آتشہ بنا دیا
ہے۔ ایک تو مغرب کا تصور دوسرا مشرق کا خیال، مل جل کر ایک نئی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اور
اقبال کے فکروفن کی ایک من بھاونی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ مغربی ادبا اسلام کی تشریح
وتصریح میں ذرا تحمل اور ذہنی تعصب سے کام لیتے ہیں لیکن لوس کلوڈ ایک استثنا رہیں۔ لکھتی ہیں۔

"یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو اور وہ قرآن مجید سے اثرات
قبول نہ کرے؟ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ فکرِ اقبال قرآن مجید سے اخذ وقبول کرتا ہے۔ اور یہیں
تو کم از کم اس کے فکر کی وسیع حدود کے لحاظ سے یہ بالکل درست ہے۔ شاعرِ اقبال قدم قدم پر
قرآن مجید سے استفادہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے کلام میں آیات کے جو بار بار حوالے ملتے ہیں تو اس
سے بھی یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اقبال ہر ممکن طور پر پیغمبر صلعم کی متعین کردہ حدود سے انحراف
نہیں چاہتے۔"

مادام لوس کلوڈ نے اقبال کا تعارف اور اقبال کی شناخت صحیح تناظر میں کی ہے۔ دوسرے مغربی
مفکرین کی طرح اقبال کی فکر کو مغربی دانشوروں سے نہیں جوڑا بلکہ اقبال کی خود اپنی اہمیت اور
اصلیت کا انکشاف کیا ہے لوس کلوڈ نے لکھا ہے:

"بعض ناقدین نے اقبال پر نطشے کے فلسفیانہ اثرات کے بارے میں غلو
سے کام لیا ہے اس حد تک گویا اقبال اس کا ایک ادنیٰ شاگرد رہو۔ لیکن یہ انداز نظر غلط
ہے اور کوتاہ بینی پر مبنی ہے۔۔۔" ۱؎

کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لوس کلوڈ ایک آزاد اور بے تعصب اقبال شناس ہیں۔
جب خود ان کے ملک کے فلسفی برگساں کا نام آتا ہے تو وہ بھی وہاں پر اقبال کی اہمیت کو کم نہیں کرتیں
بلکہ اقبال کے وقار اور عظمت کو نقصان پہنچائے بغیر اقبال اور برگساں کے فلسفیانہ تخیلات پر تقابلی مطالعہ
پیش کرتی ہیں۔

۱؎ فکرِ اقبال کا تعارف تالیف از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۴

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:

"ہمارے اقبال شناسوں کو اس نقطہ پر غور کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان دنوں
یہ کچھ فیشن سا بن چکا ہے کہ جس کسی دانشور کا بھی اقبال کے کلام میں نام نظر آگیا تو اس کے
حالات وکوائف پر ایک جامع مقالہ قلمبند کرکے فکرِ اقبال میں اس کا مقام متعین کرنے کے
درپے ہوجاتے ہیں۔"

اقبال شناس مسلم مفکرین کے ساتھ اقبال کے ڈانڈے ملانے سے
باز نہیں آتے جیسے رومی، رازی، حافظ، وغیرہ وغیرہ لیکن لوس کلوڈ کے الفاظ میں:

"دائرۂ اسلام کے باہر فکرِ اقبال نے مسلم مفکرین سے برائے نام ہی
استفادہ کیا ہے جبکہ حلقۂ اسلام میں صرف قرآن مجید کی تعلیمات اور رومی کے تصورات نے
انہیں خاص طور پر متاثر کیا ہے۔" ۱؎

غرض کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک غیر جانبدار اور غیر متعصب ادیب کی کتاب کا اردو ترجمہ پیش کر
کے یقیناً اردو والوں پر احسان کیا ہے۔ ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اس کے مطالعہ کے دوران
یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ بلکہ سلیم اختر کی اپنی تصنیف کردہ کتاب معلوم ہوتی ہے۔

اقبال شناسی کے زاویے

اقبال شناسی کی دنیا بھر میں کوششیں ہوتی رہی ہیں اور ہندو پاک دونوں کے ادیب، شاعر
اور فلاسفر اپنے اپنے طور پر فکرِ اقبال اور فلسفۂ اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں لگے ہوئے
ہیں۔ آندھرا پردیش سے انگریزی میں ایک رسالہ اقبال کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ جس میں اقبال
کے کلام اور اس کے فلسفہ پر انگریزی میں تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

"اقبال شناسی کے زاویے" بھی پاکستانی اردو رسالہ "اقبال" میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۸۴ء تک
شائع شدہ مضامین کا خوبصورت جامع اور معیاری انتخاب ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ شعروں کے
انتخاب نے رسوا کیا مجھے۔ لیکن سلیم اختر صاحب نے جو فکرِ اقبال کے موضوع پر مجلہ "اقبال" سے

۱؎ فکرِ اقبال کا تعارف تالیف از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۴

جن مضامین اور مقالات کا انتخاب کیا ہے ان میں سلیم اختر کی کوئی رسوائی یا بدنامی نہیں ہے بلکہ ان کی نیک نامی میں اضافہ ہی ہوا ہے اس لئے کہ یہ مضامین ایک لحاظ سے معیاری ہیں اور ان اہل قلم کے تحریر کردہ ہیں جنہوں نے کافی محنت اور گہرے مطالعہ اور مشاہدے کے بعد اپنا مقام بنایا ہے جیسے احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سید عبداللہ، عبدالحمید یزدانی، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر وقار عظیم، پروفیسر محمد عثمان، بشیر احمد ڈار اور سلیم اختر ان تمام مقالہ نگاروں نے اقبال کی شاعری، ان کے فکر و افکار کا کئی جہتوں سے جائزہ لیا ہے اور اپنی جگہ پر ایک نئے انداز سے اقبال کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے احمد ندیم قاسمی کے مضمون کو پہلے لیجئے:

"وہ کون ہے جس کا شعور ذرا سا بھی بیدار اور ذوق ذرا سا بھی نکھرا ہوا ہو اور ضرب کلیم کا مطالعہ کرتا ہو علامہ اقبال کا یہ شعر نہیں اپنی گرفت میں نہ لے لے

دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے

احمد ندیم قاسمی صاحب کا اپنا ایک نظریہ ہے وہ لکھتے ہیں:

"اس شعر میں مروجہ ظالمانہ نظام معیشت، اور استحصال و جبر سے اٹے ہوئے نظام زرعی نے جس بھرپور اور ہمہ گیر انداز میں اظہار پایا ہے وہ کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں"۔ [1]

جناب احمد ندیم قاسمی کا یہ بھی خیال ہے کہ جس طرح پاکستان میں اقبال کا کلام بعض لوگوں نے چھپا کر رکھا ہے اسی طرح اقبال کے مندرجہ بالا شعر کو بھی پاکستانی حکومت نے چھپا کر رکھا ہے اور اسے کبھی ریڈیو، یا ٹی۔ وی پر پیش نہیں کیا جاتا۔ نہ جانے کون سا انقلاب آجائے گا۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"گذشتہ چند برسوں سے ہماری قومی زندگی میں خرد دشمنی کا رویہ جس طرح مسلسل تقویت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ ایک دن وہ بے حد خطرناک نتائج کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اس لئے یہ خرد دشمنی کے ذیل نتائج کی رو سے تعلیم و تدریس بے معنی، سائنس منافی اسلام اور علمی تحقیق و جستجو لاحاصل قرار پاتی ہے۔ چنانچہ ذرائع ابلاغ

---

[1] اقبال کے ساتھ انصاف کیجئے۔ از احمد ندیم قاسمی مشمولہ اقبال شناسی کے زاویے ص ۱

اورنگ زیب قاسمی

کی تقاریر سے لیکر ٹیلی ویژن کے ڈراموں تک و اشگاف یا بالواسطہ انداز میں یا پھر کنائے کے اسلوب میں تعلیم، عقل اور ان کے ثمرات کو غیر ضروری قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ہر شخص اپنی رائے کے اظہار کا حق رکھتا ہے لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ اس خرد دشمنی کا سب سے بڑا جواز علامہ اقبال کے ان اشعار سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جن میں انہوں نے عشق و وجدان کو عقل پر فوقیت دیکر اس امر پر زور دیا تھا:

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اگر ان اصحاب کی مساعی اسی طرح جاری رہیں تو اندیشہ ہے کہ ایک دن علامہ اقبال کو خرد دشمنی کی عظیم علامت کا روپ دے دیا جائے گا"۔ [1]

ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ اب پاکستان میں ایک ایسا طبقہ ابھر رہا ہے جو علامہ کے اشعار سے اُن کے افکار کی الٹی تعبیریں پیش کر رہا ہے اور مولویوں کی طرح جس طرف چاہے شرعی مسائل اور فقہی مسائل کو اپنے حق میں کر لیتا ہے یا دوسروں کے خلاف دلیل کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ گویا ایک طرح سے پاکستان کا ایک طبقہ وہ بھی علمی طبقہ ایسا کھڑا ہو گیا ہے۔ جو علامہ کے استعاروں کا استحصال کر رہا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے:

"آج ہمیں محض علامہ کے اشعار کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے کہ ہر شخص لغت کی مدد سے یہ فریضہ انجام دے سکتا ہے بلکہ فکر اقبال کے درست تناظر کی ضرورت ہے"۔ [2]

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مقالوں کے موضوعات کے لحاظ سے اسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جو ایک حساب سے ٹھیک ہے اور اس سے قاری کو کتاب کے مطالعہ میں زحمت نہیں اٹھانی پڑتی ہے۔

"طلوع" کے عنوان کے تحت جو مقالے شامل انتخاب ہیں دراصل وہ انقلابی خیالات رکھنے والے ادیبوں کے مقالات ہیں جو اقبال کے افکار پر ارضی زندگی کے عکس کے متلاشی ہیں۔

"تنوع" عنوان کے تحت جن مقالات کا انتخاب کیا گیا ہے اُن سے علامہ کے افکار کی نمو اور ارتقا

---

[1] اقبال شناسی کے زاویے ترتیب سلیم اختر مقدمہ ص

[2] 〃 〃 〃 〃 ص

پر روشنی پڑتی ہے اور کچھ نئے نکتے سامنے آتے ہیں جو دوسرے مقالوں میں خال خال ملتے ہیں ۔ مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ " گلشن راز جدید خطبات کے آئینہ میں " ، اور پروفیسر وقار عظیم کا مقالہ " تلاش عزلت اور احساس تنہائی " اور علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں " (ڈاکٹر سلیم اختر) ۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون دراصل فراق گورکھپوری کے ایک مضمون " علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں " جو ماہنامہ افکار کراچی اور ماہنامہ آج کل دہلی میں کم وبیش ایک ساتھ شائع ہوئے تھے اور جس میں اقبال سے متعلق کچھ تیز اور تیکھی باتیں فراق گورکھپوری نے کی تھیں اس کا جواب اسی عنوان سے سلیم اختر نے دیا ہے اور اسی تیز اور تیکھے انداز میں جس سے ایک طرح کا مناظراتی انداز پیدا ہوگیا ہے ۔

" فن " کے عنوان کے تحت جن مقالوں کا انتخاب کیا گیا ہے اس میں اقبال کے فنی حسن وقبح سے بحث کی گئی ہے جیسے اسلوب ، تشبیہ ، استعارے ، تلمیحات جن میں عربی فارسی ، اور قرآن شریف کی تلمیحات کا خاص طور سے ذکر ہے ۔ انتخاب کا یہ حصہ اس لئے اہم ہے کہ زبان وادب کی ترقی میں قواعد وضوابط کی بھی بڑی اہمیت ہے ۔ اور یہ مضامین طالب علموں کے لئے بھی بے حد کارآمد ہیں اس ضمن میں عبداللہ فاروقی کے " کلام اقبال میں تلمیحات قرآنی " اور چودھری نذیر احمد کا مقالہ " تشبیہات اقبال " اور ڈاکٹر مجید ریاض کا مقالہ " اقبال کے چند تراجم و ماخوذات " خاص محنت اور دیدہ ریزی سے لکھے گئے ہیں اور کلام اقبال کا یہ گوشہ منور ہوتا ہوا نظر آتا ہے ۔

" نایاب " کے تحت ان مضامین کا انتخاب ہے جو اقبال اور دوسرے فلسفیوں کے افکار اور جہان دیگر کی تلاش کی گئی ہے ۔ فکر وفن کی اس صورت نے تلاش اقبال میں ایک نئی جگہ حاصل کرلی ہے اور یقیناً قاری کو اس سے فائدہ ہوگا ۔ اُن کو بھی جو اقبال کے فکر وفن سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اور انہیں بھی جو اقبال شناسی میں کوئی مقام حاصل کرچکے ہیں ۔ دونوں اس سے مستفید ہو سکتے ہیں ۔

ایران میں اقبال شناسی کی روایت

ایران ، تہذیب وتمدن اور زبان کے لحاظ سے بالکل دوسرا ہے خاص طور سے ہندوستانی اور پاکستانی تہذیب وتمدن کے لحاظ سے ۔ یہ الگ بات ہے ہندوستان اور پاکستان پر اس ملک کے جزوی اثرات وتہذیبی اثرات آج بھی پائے جاتے ہیں ۔ لیکن بحث فی الحال اس سے

اورنگ زیب قاسمی

ہے کہ کلام اقبال کے اثرات ایرانی تہذیب وتمدن پر کیا اور کیسے پڑے ؟ یہ بات درست ہے کہ اقبال کے فارسی کلام نے ایران میں دھوم مچادی ہوگی ۔ ہندوستان اور پاکستان کے اکثر دانشور ایران کا اتفاقی دورہ بھی کرتے رہتے ہیں اس لحاظ سے انہیں اندازہ ہوتا ہوگا کہ ایران اور ایران کی فارسی شاعری کے علاوہ ملک وسماج پر اس کے کیا اثرات ہیں ۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں :

" جو ایرانی اقبال شناسوں نے علامہ پر باضابطہ کتابیں قلمبند کیں ان کے افکار و اشعار قلمبند کئے جن میں سے کئی مقالات کے تراجم کئے ہیں علامہ کے نظام فکر کے اساسی تصورات کی تفہیم کی سعی میں لاتعداد مقالات کے اردو تراجم بھی ہو چکے ہیں جن کے نتیجہ میں اردو داں طبقہ بھی ایرانی اقبال شناسوں کی تحریروں سے آشنا ہو چکا ہے یہ انہیں تراجم کی برکت ہے کہ استاد محیط طباطبائی ایسے بزرگ اقبال شناس ہمارے ہاں یوں معروف ہیں گویا وہ اپنے ہوں اور دیکھا جائے تو اقبال سے محبت کی بنا پر وہ اور اقبال کے دیگر مداح اپنے ہی تو ہیں یوں دیکھیں تو یہ کتاب " ایران میں اقبال شناسی کی روایت " درحقیقت چند " اپنوں " کی تحریروں کو یکجا کرنے کی سعی بن جاتی ہے " ۔ [1]

اس کتاب کے مقالہ نگار ممتاز حسن لکھتے ہیں :

" اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے ۔ یہ زبان انہوں نے کچھ اس وجہ سے اختیار کی کہ انہیں اس سے بے انتہا محبت تھی اور کچھ اس لئے کہ ان کا پیغام ہندوستان کے برصغیر سے باہر پہنچے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے علاوہ دنیا کے مسلمان بھی سنیں ۔ ایران سے اقبال کو خاص لگاؤ تھا ۔ یہ اس " حکیم پاکزاد " اس " مرشد رومی " کا وطن تھا جس نے اقبال پر مرگ وزندگی کے راز منکشف کئے تھے ۔ اور جس کی روحانی شخصیت کے سامنے وہ اپنے آپ کو مرید ہندی سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے ۔ اور پھر ان کا آبائی وطن کشمیر بھی " ایران صغیر " کی حیثیت رکھتا تھا ۔ یہی نہیں بلکہ اقبال کی عمر کا ایک حصہ ایرانی ادبیات کے سدا بہار باغ کی سیر میں صرف ہوا اور اس سے انہوں نے وہ پھول چنے جن کی خوشبو سے ان کا سارا کلام معطر ہے " ۔ [2]

---

[1] ایران میں اقبال شناسی کی روایت از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۔ [2] اقبال ۔ ایران میں ۔ ممتاز حسن (مضمون مشمولہ ایران میں اقبال شناسی کی روایت ص ۶۰) مرتب ڈاکٹر سلیم اختر ناشر سنگ میل پبلیکیشنز لاہور

ایران میں اقبال شناسی کی روایت کوئی نئی نہیں ہے۔ بلکہ اقبال شناسی کے ذریعہ اس دردو محبت کی توسیع کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے پر دو امور بطور خاص اجاگر ہوتے ہیں ایک تو ایران اور اہل ایران سے علامہ کی گہری محبت، دوسرے زبان و اظہار کے بارے میں عجز کا اظہار۔" [1]

علامہ اقبال کے "زبور عجم" کی ایک غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

چوں چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
اے جوانان عجم جان من و جان شما

علامہ اقبال کے افکار کا اثر ایرانی عوام پر کیا ہوا اس کی خبر مجھے مکمل طور پر نہیں لیکن اصل چیز یہ ہے کہ فارسی داں ایرانی سے ان کی زبان و بیان کا مقابلہ کس طرح ہو، میری گتھی کو علامہ کے ایک معتقد نے حل کی۔

"اقبال کے فارسی کلام میں الفاظ تراکیب اور سبک کے اعتبار سے کوئی مشکل اور ابہام نظر نہیں آتا۔ میں یہ بات بلاخوف تردید کہوں گا کہ اقبال کا ایک کمال ان کی سادہ گوئی بھی ہے۔ اور بڑی دل آویزی کے ساتھ وہ فلسفے کے دقیق مسائل بیان کر جاتے ہیں۔ سادگی کا ایک اثر یہ ہے کہ بسا اوقات قاری ان کے نکات پر غور کئے بغیر گزر جاتا ہے۔ اقبال کی یہ سادگی ان کے مرشد معنوی مولانا جلال الدین رومی اور ایک حد تک خواجہ شیرازی کے سبک سے مشابہ ہے رومی اور لسان الغیب حافظ نے قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبوی کے استفادے سے تصوف و عرفان کے بلند پایہ مسائل بیان فرمائے اور اقبال نے ان موضوعات کے علاوہ فلسفیانہ اور سیاسی افکار کو بھی اسی سادگی سے منظوم کر ڈالا۔ وہ شاعری کی قوت سے ناقہ بے مہار کو قطار کی طرف کھینچ رہے تھے ان کی باتیں ایسی تھیں جنہیں برملا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس لئے ہم نفسان خام کو سرگرم عمل رکھنے اور دھیرے دھیرے انہیں اپنے مقاصد

[1] اقبال — ایران میں از ممتاز حسن (مضمون مشمولہ ایران میں اقبال شناسی کی روایت ص ۱۱۴ مرتب ڈاکٹر سلیم اختر ناشر سنگ میل پبلیشرز لاہور۔

اورنگ زیب قاسمی

سے آگاہ کرنے کی خاطر انہوں نے کنائے کی زبان اختیار کی ہے۔" [1]

ڈاکٹر احمد علی رجائی (ترجمہ: ڈاکٹر محمد ریاض) نے مندرجہ بالا مضمون میں اقبال کے فن زبان اور دوسری تکنیکل باتوں کی طرف اشارے کئے ہیں جو ایک طرح سے درست اور صحیح ہیں۔

سید محمد طباطبائی نے لکھا ہے:

"سارے ایران میں وہ سب لوگ جو فارسی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ پاکستان کے عظیم شاعر محمد اقبال کو بخوبی جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ اور آج ایران میں شاید ہی ایسا کوئی فارسی داں موجود ہو جس کو ان کا فارسی کلام پڑھنے یا سننے کی سعادت نصیب نہ ہوئی ہو" [2]

آگے لکھتے ہیں:

"مقام حیرت ہے کہ اہل ایران، پاکستان کے اس فارسی گو شاعر سے یورپ میں مستشرقین کے ہاں اس کی شاعری اور افکار کی اشاعت کے بہت بعد آشنا ہوئے۔ اقبال کی شہرۂ آفاق تصنیف "اسرار خودی" کا انگلستان میں انگریزی ترجمہ اس کے فارسی متن کے ایران میں شائع ہونے سے پہلے قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ گیا تھا۔ اور انگریزی کی اس عارفانہ تصنیف تک رسائی، شاعر کے "ہم سخن" اور "ہم زبان" ایرانیوں سے پہلے ہوئی۔۔۔" [3]

"میں نے ۱۳۰۵ شمسی (۱۹۲۶ء) میں پہلی بار "اسرار خودی و رموز بے خودی" کا دوسرا ایڈیشن اور "زبور عجم" اور "پیام مشرق" کا پہلا ایڈیشن آبادان میں "اینگلو ایرانین آئل کمپنی" کے بعض ہندوستانی ملازمین کے پاس دیکھے اور اس کے نسخے بعض مقامی تاجروں کی وساطت سے حاصل کر کے اپنے ہمراہ تہران لایا۔ [4]

[1] ایران میں اقبال شناسی کی روایت: مرتب ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۱۸ ناشر سنگ میل پبلیکیشن چوک اردو بازار۔ لاہور ● [2] [3] ایران میں اقبال شناسی کا پس منظر از سید محیط طباطبائی مشمولہ ایران میں اقبال شناسی کی روایت از سلیم اختر ص ۱۳ — ۱۲ ● [4] ایران میں اقبال شناسی کا پس منظر از سید محیط طباطبائی مشمولہ ایران میں اقبال شناسی کی روایت از سلیم اختر ص ۱۳ —

دراصل مجھے یہ دیکھنا ہے کہ اہل ایران اقبال کو اہل زبان ایرانی فارسی شعراء کے برابر تصور کرتے ہیں یا نہیں۔ اس سلسلے میں سید عبدالواحد کا خیال ملاحظہ ہو :

"فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے جن کو اہل زبان کو بھی چاروناچار ماننا پڑا ۔ خسرو و فیضی"

شعرالعجم ص ۲۳

مولانا نے فیضی کی ایران میں مقبولیت کے سلسلے میں خوش اعتقادی سے کام لیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس برصغیر نے امیر خسرو اور اقبال دو شعرا پیدا کئے ہیں جن کو اہل زبان بھی مانتے ہیں۔ اس صورت حال کے اظہار سے فیضی کی شاعری کی تنقید مقصود نہیں ہے فیضی کے کمالات شاعری سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر ہر وہ متعلم جو ایران کے تنقیدی ادب سے واقف ہے جانتا ہے کہ وجوہات جو کچھ بھی ہوں صورت حال وہی ہے جس کا اظہار ہم نے یہاں کیا ہے ۔ علامہ اقبال نے اسرار خودی کی تمہید میں لکھا ہے :-

ہندیم از پارسی بیگانہ ام
ماہ نو باشم تہی پیمانہ ام
حسن انداز بیاں از من مجو
خوانسار و اصفہاں از من مجو

ان اشعار میں اقبال نے اعلان کر دیا ہے کہ میری فارسی آخر اس برصغیر کی شاعری ہے نہ کہ ایرانی فارسی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے فارسی مقامی استادوں اور کتابوں کے ذریعہ حاصل کی تھی لہذا ان کی زبان محاورۂ قدیم کے مطابق ہے نہ کہ محاورۂ جدید کے مطابق۔ ایک ایرانی فاضل نے لکھا ہے کہ:

"اقبال کی زبان (فارسی) سعدی اور حافظ کی زبان ہے ایک شاعر یا ادیب جو اہل زبان نہیں ہے اور صرف زبان داں ہے اس کی زبان دانی کی اس سے بڑھ کر اور کیا داد دی جا سکتی ہے۔" [1]

اقبال مختلف اصناف سخن میں مختلف شعراء کے پیرو ہیں ۔ وہ غزل میں رومی، حافظ اور

[1] اقبال کی فارسی شاعری اور ایرانی اہل قلم از سید عبدالواحد مشمولہ مضمون ایران میں اقبال شناسی کی روایت از سلیم اختر ص ۱۰۵

اورنگ زیب قاسمی

نظیری سے متاثر ہیں۔ مگر ان کے یہاں نظیری جیسی مضمون آفرینی اور خیال بندی بالکل نہیں ہے ۔ بلکہ سادہ اور مرصع انداز بیان ہے ۔ جو متصوفین کا شیوہ ہے ۔ رباعی میں انہوں نے باباطاہر کے اسلوب کو پسند کیا ہے ۔ جہاں تک مثنوی کا تعلق ہے اقبال لفظی اور معنوی اعتبار سے مولانا روم کے پیرو ہیں ۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ رومی، عطار اور محمود شبستری کی پیروی کی جرأت صرف اقبال ہی کر سکتے تھے ۔ اس لئے کہ کسی کی پیروی کے لئے بھی علم و صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مولانا جامی کے بعد کوئی صاحب صفات شاعر فارسی میں پیدا ہوا تو وہ علامہ اقبال ہی کی ذات صفات تھی ۔ اس لئے فارسی شاعروں میں اقبال کے مقام کا تعین اس پس منظر میں کرنا چاہئے ۔

خواجہ عبدالحمید یزدانی نے لکھا ہے ۔

"آج سے ربع صدی پیشتر علامہ اقبال ایرانیوں کے لئے معروف شخصیت نہ تھے جن کی غالب وجوہ یہ ہیں کہ نہ حکیم الامت خود کبھی ایران تشریف لے گئے اور نہ کسی نے انہیں متعارف کرانے ہی کی زحمت گوارا کی ۔ ایرانی فضلاء میں سے بقول ڈاکٹر ع فانی، صرف سعید نفیسی مرحوم نے دو ایک مرتبہ ان سے خط و کتابت کی ۔

"ایران میں اقبال کا ذکر سب سے پہلے "انجمن فرہنگی ایران و ہند" کے افتتاحی اجلاس میں ہوا جس میں" ملک الشعراء بہار مرحوم نے اقبال کے متعلق اپنا ایک منظوم مقالہ پڑھا ۔ اس مقالہ میں انہوں نے مقام اقبال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زمانۂ حاضر کو "عصر اقبال" کے نام سے یاد کیا ہے ۔ لیکن ایرانی ادبا و شعرا میں اقبال کی حقیقی شہرت کا آغاز پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد ہوا ۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی مرتبہ ان کی شخصیت اور شاعری پر ایک مختصر سی کتاب "اقبال لاہوری" کے نام سے چھپی ۔ جس کے مصنف ایران کے نامور فاضل ادیب بزرگ آقائے مجتبیٰ مینوی تھے ۔" [1]

ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ تالیف ہر اعتبار سے اعلیٰ اور بہتر ہے جس کے ذریعہ اقبال کی فارسی کے باب میں ان کے مقام کا تعین ہوتا ہے ۔ اقبال صدی کا یہ تحفہ اقبال کے مداحوں اور عقیدتمندوں کے لئے یقیناً کارآمد ہوگا ۔

[1] اقبال ایرانیوں کی نظر میں از خواجہ عبدالحمید یزدانی مشمولہ مضمون ایران میں اقبال شناسی کی روایت مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر ص ۴۴

فکر اقبال کے منور گوشے

ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ تالیف بھی اقبالیات کے سلسلے کی ایک اہم اور روشن کڑی ہے جس کے ذریعہ اقبال شناسی کی نئی راہیں ہموار ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کتاب میں شامل مضامین کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں اقبال شناسی کے سلسلے کے تازہ مضامین ہیں جو ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں اور قارئین کو اقبال کے مطالعہ کے سلسلہ میں کئی جگہوں کی خاک نہیں چھاننی پڑتی۔

سلیم اختر لکھتے ہیں :

راز حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

"علامہ اقبال کے فکر و فن کی توضیح میں قلم بند کئے گئے معروف ناقدین کے مقالات کے اس مجموعہ کا سرنامہ بننے والے شعر پر غور کریں تو محسوس ہوگا اردو ناقدین کی کثیر تعداد اقبال کی گفتگو کے محرمانہ انداز کی تشریح و توضیح میں مصروف رہی ہے کہ راز حرم محض ایک شاعرانہ ترکیب ہی نہیں بلکہ اقبال کے فلسفے کی اساس بھی ہے۔"

اسی پیش لفظ میں آگے رقم طراز ہیں :

"علامہ اقبال پر جتنا کام کیا گیا ——— وہ بلا شبہ غالب کی استثنائی مثال سے قطع نظر تمام اردو شعراء کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال محض شاعر نہ تھے بلکہ مفکر اور فلسفی تھے ایسا مفکر جس نے ——— اپنے فکر کی اساس بعض تصورات پر استوار کی اور ایسا فلسفی جس نے مشرقی فلسفے کی روایات و اسالیب کو بدل کر رکھ دیا۔ اقبال سے قبل اردو شاعری دشت غزل میں افتاں و خیزاں آگہی کا سفر طے کرتی نظر آتی ہے مگر اقبال نے شاعری کو غزل کے نامرادانہ عشق کے گورکھ دھندے سے نکال کر اظہار و ابلاغ کی بلندیوں سے روشناس کرایا۔"[1]

مشہور شاعر فیض احمد فیض نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔

"کبھی کبھی اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پر جو بیسیوں کتابیں

[1] پیش لفظ فکر اقبال کے منور گوشے از سلیم اختر ص ۱ ناشر سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

لکھی گئی ہیں وہ قریب قریب سب یا تو ان کے پیام، فلسفے اور فکر سے متعلق ہیں یا ان کی ذات اور سوانح کے بارے میں ہیں۔ میری نظر سے کوئی بھی کتاب ایسی نہیں گزری جس میں ان کے شعر کے محاسن اور خصوصیات بیان کی گئی ہوں۔........ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جیسے جیسے علامہ اقبال کی فکر و خیال کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ویسے ویسے ان کے موضوعات مرتکز ہوتے گئے اور آخری مرکز پر پہنچ کر غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی کے شاعرانہ امکانات جو جدید شعراء کی نظر سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے، اور خاص طور سے غزل، علامہ کی کاوش سے اس طور دوبارہ واضح ہوئے کہ تنگنائے غزل کی وسعتیں دوبارہ ان کے معاصرین اور متاخرین پر اجاگر ہوئیں اور وہ عمل اب تک جاری ہے۔ دوم یہ کہ ان کے طویل سفر سخن کے جن بظاہر تضادات پر کچھ لوگ حرف گیری کرتے ہیں وہ تضادات نہیں ارتقا کی منزلیں ہیں کسی بھی شاعر، مفکر اور ادیب کی عظمت کا مدار لکیر مٹنے میں نہیں ہے خواہ وہ لکیر خود اس نے ڈالی ہو یا اس کے اجداد نے۔ بلکہ اس میں ہے کہ اس لکیر کو حالات عالم میں اپنے افکار کی پختگی اور اپنے فن اور قدرت کی مناسبت سے نئی نہج میں منتقل کی جائے۔"[1]

فیض احمد فیض نے اپنے مختصر مقالے میں اقبال کی بنیادی باتوں کی طرف سیر حاصل اشارے کئے ہیں۔ مشہور ترقی پسند نقاد محمد علی صدیقی نے ان الفاظ میں فکر اقبال کے توسط سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے :

"میں اقبال کے بارے میں سکہ بند سوشلسٹوں کے خیالات رقم کرنے سے قصداً پرہیز کر رہا ہوں شاید ان خیالات کی اشاعت زیادہ سود مند بھی نہ ہو اور خواہ مخواہ ایک منفی ردعمل کو تقویت دے۔ ورنہ بات تو یہ ہے کہ اقبال حسرت موہانی کی طرح ایک اشتراکی مسلم تھے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ بعض شارحین اقبال اپنے نقطۂ نظر کو فکری چھینا جھپٹی کے اس دور میں خواہ مخواہ اقبال کے سر منڈھ دیتے ہیں اور اقبال کو اپنے طرف کی سطح پر کھینچ لاتے ہیں جس سے اقبال فہمی کی بجائے شارحین اقبال فہمی کی ابتدا ہو جانی چاہیئے اشتراکی مسلم کی اصطلاح بھی اقبال کے سر وانس

[1] علامہ اقبال کی ایک گفتگو از فیض احمد فیض مشمولہ اقبال کے منور گوشے ص ۱۶

اورنگ زیب قاسمی

نیگ مزبرنیسٹر کے نام خط سے مشتق ہے جس میں اقبال نے بولشیزم اور اسلام کے فرق کو ظاہر کیا ہے ۔

مطالعۂ اقبال میں کلامِ اقبال کے علاوہ خارجی شواہد بھی ضروری ہیں اور اس سے ان کے خطوط، خطبات اور مذہب و فلسفہ پر نثری تحریریں شعری مجموعوں سے کم اہم نہیں ہیں۔ کیوں کہ صرف اسی طرح مطالعۂ اقبال ممکن ہے۔ مطالعۂ اقبال کے لئے شاعری کے علاوہ دیگر تحریروں کے مطالعے سے صرف ایک رُخ بار بار آتا رہتا ہے کہ حرکت اور تبدیلی کا عاشق اقبال مذہبی روح کو خیرباد کہے بغیر ایک ایسا ترقی پسند ہے جس کے سامنے بہت سے بزعمِ خود ترقی پسند حضرات رجعت پرست دکھائی دیتے ہیں" [1] دیکھا جائے تو محمد علی صدیقی نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت خوبصورت ڈھنگ سے کی ہے۔ اقبال ترقی پسند تھے یا رجعت پسند اس پر ابھی بحث کا موقع نہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی آراء کا لحاظ بھی یہاں ضروری ہے :-

"اقبال کے افکار و پیغام کے تناظر میں ان کے تصورِ ادب اور نظریۂ فنون کا جائزہ لینے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر ادب برائے مقصد کے حامی اور فن برائے مقصد کے داعی تھے ۔ وہ ترقی پسند نہ تھے لیکن مقصدیت کے معاملے میں ترقی پسندوں جیسے ہی کٹر تھے ۔ ان کے بقول کسی قوم کی زندگی میں موقوف علیہ چیزیں محض شکل و صورت نہیں ہیں ۔ مثلاً جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ تخیل ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے، وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہلِ سیاست کی پامردی سے نشوونما پاکر مر جاتی ہیں ۔ پس میری خواہش یہ ہے کہ افغانستان کے شعراء اور انشاپرداز اپنے ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں ۔ جو قوم ترقی کے راستے پر چل رہی ہے اس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے ۔" [2]

[1] ترقی پسندی کی ایک جہت اقبال از محمد علی صدیقی مشمولہ فکرِ اقبال کے منور گوشے مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر ناشر سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ص ۹۳-۹۴

[2] اقبال کی مقصد پسندی :- از ڈاکٹر سلیم اختر مشمولہ فکرِ اقبال کے منور گوشے ص ۹۱ - ۹۰

اورنگ زیب قاسمی

سلیم اختر کے مذکورہ بالا خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال ادب میں صرف مقصدی ادب کے قائل تھے ۔ اس لئے کہ جس ادب کا کوئی مقصد یا منزل نہ ہو اس سے عوام کو کیا حاصل ہوگا۔

"افکار کی حنابندی" کے عنوان سے جو مقالے شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں پروفیسر محمد منور کا مقالہ "مرگِ مجازی اور اقبال" پڑھے جانے کے لائق ہے۔ انور سدید نے بھی اقبال کا تصورِ مرگ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو اقبال شناسی کے سلسلے میں اہم مقالات ہیں ۔ پروفیسر محمد منور نے ایک خاص نقطۂ نظر سے اقبال کی شاعری میں مرگ کے تصور کا جائزہ لیا ہے ۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں چند اچھے مباحث چھیڑے ہیں انہوں نے مصر کے ایک دانشور مشہور احمد شوقی کے اس قول سے بات شروع کی ہے ۔

"لوگ دو قسم کے ہیں ۔ ایک قسم ان کی جو جیتے جی مرے پڑے ہیں اور دوسرے وہ جو قبر میں بھی زندہ ہیں" مرگِ مجازی سے اپنی مراد یہ پہلی موت ہے، اور مجازی آنجہانی یہی لوگ ہیں جو سانس تو لے رہے ہیں مگر ان کا شمار زندوں میں نہیں ۔ چلتی پھرتی لاشیں ۔ وہ نامسعود وجود جن کو قبروں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو اور وہ بجستجوئے قبور میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر مارے مارے پھرتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی حیات کو حیات کون کہے ۔ ان کی حیات ایک مرگِ مسلسل ہے ۔ اس اعتبار سے ان کی حیات کو اگر کوئی حیات کہنے پر مصر ہو تو وہ حیاتِ مجازی ہی کہلائے گی ۔ حیات جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہ ہو ۔ ایسی بے معنی زندگی کے مالک وہ افراد ہیں جن کی روحیں منجمد اور قلب افسردہ ہیں، مقصد نایاب ہے اور عزم نابود، نیکی اور بدی کے شعور سے محروم ۔ بلکہ آدمیت کے احساس ہی سے عاری ۔

ایسے افراد جس معاشرہ میں جتنے زیادہ ہوں گے وہ معاشرہ اتنا ہی مردہ اور بے رونق ہوگا ۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ افراد کی زندگی سے زندہ اور افراد کی مرگ سے مردہ کہلاتا ہے ۔ زندگی ذمہ داری کا نام ہے اور ذمہ داری کا احساس خود آگاہی کے بغیر ممکن نہیں ۔ جب کوئی فرد یہ نہ جانتا ہو کہ وہ کیا ہے اور کائنات میں اس کا مقام کیا ہے تو اسے یہ کیوں کر پتہ چلے کہ اس کے فرائض کیا ہیں ۔ اور پھر جب تک یہ نہ کھلے کہ فرائض کیا ہیں تو یہ کیوں کر واضح ہو کہ حقوق کی حقیقت کیا

ہے۔ خود آگاہی مقام آدمیت سے آگاہی کا دوسرا روپ ہے اور یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ آدمی خاک سے نمودار ہوا اور سینکڑوں گوں ناگوں عناصر نے ان کے جسد عنصری کی پرورش اور تکوین میں حصہ لیا ـــ وہ ایک جاندار قطرہ آب سے شروع ہوا اور پلا بڑھا ـــ اگر اس کی تربیت نہ ہو تو وہ تمام عمر ایک چلتا پھرتا طبعی بخار رہتا ہے۔ اسکی روح بیدار نہیں ہوتی۔ اگر اس کی تربیت ہو جب بھی جسم کا طبعی اسے چین نہیں لینے دیتا۔ مادی دنیا سے برآمد ہونے والا اور مادی عنصریت تو اک حاصل کرنے والا وجود اپنے مادی منصب کی جانب مسلسل کھنچتا رہتا ہے اگر وہ عزم و ارادہ سے کام نہ لے روح کو بیدار نہ رکھے تو اس کے وجود کا طبعی مادی ملبے کی طرف واپس چلا جاتا ہے گویا وہ بحیثیت انسان رحلت کر جاتا ہے۔" [1]

پروفیسر منور نے مرگ مجازی اور مرگ حقیقی سے متعلق بہت ہی عارفانہ گفتگو کی ہے۔ انور سدید نے اس الجھے ہوئے فلسفہ کو واضح طور پر پیش کیا ہے۔

"اب تک کی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال اس جوہر حیات کو زیادہ فوقیت دیتا ہے جو فرد کو تب و تاب جاودانہ عطا کرتا ہے اور زندگی کی رزم گاہ میں تگ و تاز مسلسل پر آمادہ کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک زندگی درحقیقت حرکت کا نام ہے۔ اس حرکت کو ذوق طلب کی حرارت اور عشق کی موج بلاخیز قوت بخشتی ہے اور جب یہ حرکت تھم جاتی ہے تو انسان کے مادی جسم پر موت وارد ہو جاتی ہے۔" [2]

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے۔

"فکر اقبال کے منور گوشے" کی ترتیب میں ان مقالات کو پیش نگاہ رکھا

---

[1] مرگ مجازی از پروفیسر محمد منور۔ فکر اقبال کے منور گوشے ص ۱۰۲-۱۰۳

[2] اقبال کا تصور مرگ از انور سدید مشمولہ فکر اقبال کے منور گوشے ص ۱۳۶-۱۳۷

اورنگ زیب قاسمی

گیا ہے جو کسی نہ کسی طرح سے فکر اقبال کے کسی نئے گوشے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مطالعہ اقبال میں نئے مواد کا اضافہ کرتے ہیں یا اقبال کے بارے میں نیا نقطۂ نظر، نیا تناظر اور نئی سوچ مہیا کرتے ہیں۔" [1]

اقبال شناسی کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی اس کاوش کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ سلیم اختر صاحب سے زیادہ پاکستان میں اقبال پر کسی اور نے کام نہیں کیا اور ان کی دیدہ ریزی اور ذہنی مشقت کے بعد یہ خوبصورت کتابیں قارئین کو ملی ہیں۔ ورنہ مشکل تھا کہ اقبالیات کے سلسلے میں اتنے مواد کو حاصل پاتے۔

اقبال کا ادبی نصب العین

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب کی ترتیب اور پیشکش میں اس بات کا بہر حال خیال رکھا ہے کہ اقبال کے نظریات سے متعلق تمام مباحث سامنے آجائیں جن میں اقبال نے اپنے نظریہ کو پیش کیا ہے۔ مثلاً نظریۂ فن، نظریۂ زندگی، نظریۂ ملک، اور نظریۂ سلطنت وغیرہ سلیم اختر صاحب لکھتے ہیں

"بالغ نظر فلسفی ہونے کے باعث علامہ اقبال کی نگاہ میں معاصر زندگی کے تمام گوشے تھے۔ اس لئے اشعار کو اپنے عصر کا آئینہ بنایا تو فکر کو پیغام!

چنانچہ مذہب، سیاست، تعلیم، عقل، تہذیب و تمدن ایسے مسائل کی اقبال نے جس طرح گرہ کشائی کی وہ سوچ کے نئے آفاق منور کرنے کے مترادف تھی اور اس لئے اقبال شناس حضرات شروع سے ہی ان موضوعات و مسائل کے ضمن میں کلام اقبال کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ملتے ہیں۔" [2]

ترقی پسند نقاد ممتاز حسین کے خیال میں۔

"علامہ اقبال کا نظریۂ ادب ان کے نظام فکر سے آزاد نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ان کے نظریۂ ادب کی وضاحت ان کے نظام فکر سے علیحدہ کر کے نہیں کی جا سکتی لیکن یہ کام تنا بڑا ہے کہ اس کی گنجائش چند صفحات میں ناممکن ہے ..... بہر حال اگر آپ

---

[1] پیش لفظ از ڈاکٹر سلیم اختر۔ فکر اقبال کے منور گوشے ص ۸

[2] اقبال کا ادبی نصب العین از سلیم اختر پیش لفظ ص ۹

مابعد الطبیعیات میں نہ پڑیں اور صرف عمل نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اقبال کو ہر وہ نغمہ اور شعر پسند تھا جو غلام قوموں کو بیدار کرتا انہیں اٹھنے اور جدوجہد کی تعلیم دیتا۔ اور انہیں ہر اس نغمے سے نفرت تھی جس سے انسانوں کو مجہول بنانے اور حیوان ثابت کرنے کی تعلیم دی جائے۔"[1]

اقبال کے نظریۂ فن سے متعلق پروفیسر میاں محمد شریف لکھتے ہیں:

"نظریہ مقصدیت کا بانی مبانی افلاطون ہے اس کا کہنا ہے کہ فن معنوی اور صوری ہر دو اعتبار سے اخلاق اور واعظانہ مقاصد پورے کرتا ہے۔ وہ تلقین کرتا ہے کہ فن کے افسوں کو لوگوں میں صرف صالح شہریت پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔ مثلاً موسیقی میں صرف انہیں راگوں اور نغموں کی اجازت ہونی چاہیے جو سامعین کو جنگ پر اُبھاریں اور ان میں شجاعت کی روح پھونک دیں اور انہیں بہادرانہ کاموں کی ترغیب دیں۔"[2]

علامہ اقبال ایک لحاظ سے افلاطون کے مخالف بھی ہیں اور ایک لحاظ سے پیرو بھی۔ جہاں تک مابعد الطبیعیات کا تعلق ہے۔ وہ مسلّم طور پر افلاطون کے مخالف ہیں لیکن جہاں تک نظریۂ فن کا تعلق ہے وہ افلاطون کے پیرو ہیں۔ دونوں مفکرین کے نزدیک فن کا مقصد یکساں ہے۔ ادب اور فن کی تاریخ میں ادب برائے فن اور ادب برائے زندگی کی بحث کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہنرمندوں کا ایک طبقہ آرٹ کو حسن، نازک خیالی، اور لطیف احساسات کے محض اظہار کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور دوسرا آرٹ کی عظیم قوتوں سے مقاصد حیات کی تکمیل کا کام لیتا ہے۔ پہلی شکل میں افادیت کا پہلو مفقود ہے۔ لیکن دوسری شکل افادیت ہی کو فن کی اساس قرار دیتی ہے۔ اپنی پہلی شکل میں فن کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ افکار انسانی کی تاریخ چنانچہ یونان کے دور عروج میں جب علوم وفنون کو عروج حاصل ہوا تو فن کا یہ قدیم ترین نظریہ قائم ہو گیا کہ فن مظاہر فطرت کی نقالی یا عکاسی ہے۔ لیکن افلاطون نے اس نظریہ کی کہ وہ خود مظاہر فطرت کو ناقص سمجھتا تھا کہ یہ حقیقت کا محض عکس ہیں، تردید کی ہے۔ اقبال نے مشرق ومغرب کے علوم وفنون اور ادبیات کا بہت غائر مطالعہ کیا تھا اور وہ یہ جانتے تھے کہ جن شاعروں نے محض حسن بیان کو شاعری قرار دیا ان کا کلام حقیقت کی روح اور زندگی کی خوشبو سے بالکل معرا کاغذی پھولوں کے رنگ برنگے گلدستوں کی طرح ہے۔ جو نہ تو زندگی کے حقائق سے

---

[1] اقبال کا نظریہ ادب از ممتاز حسین مشمولہ اقبال کا ادبی نصب العین مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر ص ۶۲ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور۔

[2] اقبال کا نظریۂ فن از پروفیسر میاں محمد شریف مشمولہ کتاب ہذا ص ۱۶۵

اورنگ زیب قاسمی

آگاہ کر سکتا ہے اور نہ مقاصد حیات کے حصول میں کوئی مدد دے سکتا ہے۔ یہ شاعری درحقیقت اقبال کے اس تصور شاعری کے برعکس تھی جسے وہ معرکۂ حیات سر کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔

شاعری سے متعلق یا زندگی اور آرٹ سے متعلق اقبال کا نظریہ بہت غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ وہ زندگی کے شاعر ہیں اور ہنر وفن اور نظریہ کو حیات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اُن کی نظر میں زندگی اصل مقصد ہے جو ہر شے پر حاوی ہے اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ آرٹ چاہے وہ ادب ہو یا مصوری اور موسیقی ہو یا معماری، زندگی کا معاون اور خدمت گار ہے۔ اقبال اس عالی نظریے کے پرستار تھے کہ کائنات میں ایک ازلی قوت اور بھی ہے۔ جو ان تینوں (حسن، حق، اور خیر) اقدار کا سرچشمہ ہے سادہ الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال خدا کے قائل اور زندگی میں حسن، حق اور خیر کے متلاشی تھے۔ جہاں تک حسن کا تعلق ہے۔ وہ شاعر تھے۔ لیکن چونکہ حق اور خیر کی تلاش بغیر فلسفہ کی مدد کے ممکن نہیں اس لئے شاعر اقبال میں فلسفی اقبال بھی داخل ہو گیا۔ اقبال کے ذوق حسن کا آغاز فطرت سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا خالق حسن کی تلاش پر ہوتی ہے۔

محمد معین نے اقبال کے نظریہ کو اس طرح پیش کیا ہے:

——— "زندگی ایک رمز اور غیر مختتم ہے۔ جو ایک الٰہی قوت کے زیر اثر اپنے اندر لامتناہی ارتقائی صلاحیتیں رکھتی ہے زندگی گویا ارتقاء کا دوسرا نام ہے (یہاں اقبال کے نظریہ کو ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کو مولانا روم کے نظریۂ ارتقاء کے پہلو بہ پہلو جانچنا چاہیے) زندگی کی ابتدا عقل سے ہوتی ہے اس کا وسط علم ہے اور انتہا عشق پر ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ عشق سے اقبال کی مراد علم وعرفان کی انتہا ہے۔

——— "انسان خواہ وہ بادشاہ ہو یا فقیر، کسان ہو، یا مزدور، سرمایہ دار ہو یا غریب، مدبر ہو یا پیغمبر، سب خدائی قوتوں کی ایک امانت ہے۔ تمام مخلوقات میں اس کا درجہ اس لئے اعلیٰ ہے کہ اس کے اندر عقلی اور روحانی ارتقاء کی لامحدود گنجائش ہے۔ اس لئے انسان کو علماً اور عملاً تمام کائنات پر حکومت کرنے کے لئے اپنی فطری صلاحیتوں کو جوشش عمل، یقین اور خود شناسی کے ساتھ ترقی دینا چاہیے۔ اقبال فلسفۂ عمل کے اعلیٰ ترین پیغامبر ہیں۔

——— "مذہب ایک سچائی ہے۔ یعنی انسان کا خدا سے کبھی بھی تعلق منقطع نہیں ہو سکتا اور یہ تعلق عقل ودل دونوں ذریعوں سے قائم رکھا جا سکتا ہے۔

—— مغرب نے حقیقت اشیاء اور ماہیت حیات کی بڑی گہری تلاش اور مغربی فلسفہ نے زندگی کے بہت سے اسرار و رموز فاش کئے۔ بیسویں صدی کے جدید انسان کے لئے مغرب کے یہ عقلی اور مادی نتائج کچھ ایسے فائدہ بخش نہیں۔

—— مشرق نے روح انسانی میں ایک شمع روشن کی تھی جس کا شعلہ اب بہت ماند پڑ گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ عقلی بیداری کے ساتھ ساتھ اس شمع روحانی کو بھی فروزاں کیا جائے۔

—— جدید تہذیب معاشرت، معیشت اور سیاست جیسے علوم ظاہری کے سطحی مسائل کے گرد گھومتی ہے۔ فنون لطیفہ کے نام سے کھوکھلا ذوق جمال پیدا کیا جاتا ہے۔ علم مدرسہ کی دیواروں میں قید ہے اور ذوق کا کوئی پتہ نہیں۔ سیاست اور حکومت اصطلاحوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔

—— بیسویں صدی کے نوجوان سوز قلب سے بیگانہ احساس شعور سے دور اور یقین و عمل کی دولت سے تہی دامن ہیں، وہ ایک مصنوعی سی زندگی بسر کر رہے ہیں کہیں ان کے اعصاب پر عورت سوار ہے کہیں نالۂ مرغ سحر سے مدہوش ہیں کہیں سیاست کے لفظی جنجال میں پھنس کر حق اور خیر کی ماہیت سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔

—— اقبال کے اعلیٰ فلسفیانہ افکار ان کے دور پختہ کاری میں اس قدر بلند ہو جاتے ہیں کہ سطحی زندگی کے پرستار اقبال کے اس عمیق فلسفہ میں کارل مارکس یا لینن کے فلسفہ کی طرح اپنی پوری ضرورت کا علاج نہیں پاتے۔ ان کی تمام تر توجہ پیدائش دولت اور صرف دولت پر مرکوز رہتی ہے۔ وہ تہذیب کے نمائشی چہرہ کو آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے فلسفہ کا آخری منشا نہایت سلیس الفاظ میں صرف اس قدر ہے کہ پیٹ بھر کر کھاؤ اور آرام کی زندگی بسر کرو۔ اقبال اس فلسفۂ شکم سیری کو عام زندگی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کو زندگی کی انتہا نہیں بلکہ صرف ابتدا سمجھتے ہیں۔"

اقبال نے اپنی نظموں اور نثر کے ذریعہ جو بھی نظریات پیش کئے۔ ان پر عمر بھر عمل بھی کیا اور وہ دنیا کی عظیم شاعری کے علاوہ زندگی کے سرمایہ میں بھی ایک گرانقدر اضافہ کر گئے۔ اُن کا نظریۂ شعر، نظریۂ ادب یا نظریۂ زندگی اور اس کے حسن، انسان اور اس کی توانائیوں، کائنات اور اس کی پہنائیوں اور انسانی فکر کی رسائیوں کا نظریہ ہے۔ اور یہی وہ نظریہ ہے جس سے منفعت بے حقوق

اور لایعنیت کے ان نظریوں کو شکست دی جا سکتی ہے جنہوں نے آج کے جدید انسان کو اپنی گرفت میں لیے اور اس سے اس کا انفرادی شرف چھیننے کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔ سلیم اختر صاحب نے درست کہا ہے کہ:

"اقبال کے افکار اور پیغام کے تناظر میں اقبال کے نظریۂ ادب و فن کا تحلیل مطالعہ کرنے اور اس موضوع پر خطوط اور نثری تحریروں کا جائزہ لینے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال ایک مقصد پسند ادیب ہی نہ تھے بلکہ ادب برائے ادب کے خوش رنگ نظریے کو کلی طور پر مسترد کرتے ہیں کہ ان کے بقول: شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا۔ واضح رہے کہ ادب برائے ادب کے نظریے کو اقبال ۱۹۱۷ء میں مسترد کر رہے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی تک ہندوستان تو کجا یورپ میں بھی ترقی پسند ادب کی تحریک کی داغ بیل نہ ڈالی گئی تھی اس سلسلے میں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ادب میں مقصدیت کا نظریہ اقبال کی اپنی مخصوص افتاد طبع کا نتیجہ تھا یا اس ضمن میں وہ کسی سے متاثر تھے۔ ؟"

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:

"اگر اقبال نے اپنے نظریۂ ادب کی تشکیل میں کسی سے استفادہ کیا ہوگا تو وہ اشتراکی ادیبوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتے کیوں کہ مارکس کی تحریروں اور اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب کے بعد ادب برائے مقصد کے نظریے پر اتنا کچھ لکھا گیا کہ اسے اچھی خاصی ایک CULT کی حیثیت دے دی گئی۔ اقبال بھی ایک زمانے میں مارکس اور لینن سے متاثر رہے ہیں۔"[1]

اقبال ممدوح عالم

اس کتاب کے عنوان ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ان ادیبوں کے مقالات اور نگارشات کو جمع کیا ہوگا جو بیرونی ادبا اور شعراء نے ان پر لکھے ہوں یا بیرون ملک جو علمی اور تحقیقی کام اقبال کے سلسلے میں ہوا ہوگا۔ اس پر روشنی ڈالی گئی ہوگی اور حقیقت بھی یہی ہے۔ انگلینڈ، امریکہ، مصر

---

[1] اقبال کا تنقیدی شعور از سلیم اختر مشمولہ اقبال کا ادبی نصب العین ص ۲۵۲

اورنگ زیب قاسمی

روس، مغربی جرمنی، بنگلا دیش اور بعض دوسرے ملکی زبانوں کے اثرات پر بھی بعض مقالے پیش کیے گئے ہیں۔ جیسے اقبال روس میں، (خالد احمد) اقبال بنگلہ میں (محمد عبداللہ) اقبال کا پہلا عرب مترجم (ڈاکٹر ظہور احمد ظہور) ڈاکٹر محمد ریاض کا مقالہ تو خاص دلچسپی اور گہرے انہماک سے پڑھا جائیگا جس میں انہوں نے افغانستان اور ایران میں اقبال پر ہونے والے علمی اور ادبی کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"افغانستان اور ایران میں مطالعہ اقبال کی ایک خاص اہمیت ہے۔ کیونکہ علامہ مرحوم کے منظوم کلام کا دو تہائی حصہ فارسی میں ہے۔ مقدم الذکر ملک کے فضلاء کے ساتھ اقبال کے ذاتی مراسم بھی خاص اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین سلجوقی اور سرور خاں گویا ان کے خاص احباب میں شامل تھے اور ان دونوں مرحومین کا سارا افغانستان ارادتمند اور معتقد ہے۔ ایران میں اقبال خوانی کی کیفیت طویل تر ہے جسے کسی حد تک خواجہ عبدالحمید عرفانی نے کوئی بیس برس قبل لکھا ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اقبال کی فارسی کتابیں پروفیسر محمد اقبال مرحوم (م۔ ۱۹۴۵ء) وغیرہ کے ذریعہ ایران کے بعض اساتذہ جیسے سعید نفیسی (م۔ ۱۹۶۶ء) اور سید محمد محیط طباطبائی (مولد ۱۹۰۶ء) کو تقریباً شائع ہوتے ہی ملتی رہیں۔" [1]

ایران کا ذکر پچھلے باب میں تفصیل سے آچکا ہے۔ اب دوسرے موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں جیسے ترکی میں اقبال کی مقبولیت وغیرہ۔ اس سلسلے میں "اقبال ممدوح عالم" میں شامل مضمون "ترکی میں مطالعۂ اقبال" میں ڈاکٹر حنیف فوق نے ترکی کے مشہور عظیم شاعر عاکف کے تعلقات کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے اس لئے کہ یورپ کے "مرد بیمار" یعنی یورپی مقبوضات بغاوت کرنے پر تلے ہوئے تھے اور عالم اسلام یورپی استحصال پسندوں کے جنگل میں گرفتار تھا۔ اس صورت حال نے سوچنے والے ذہنوں کو شدید طور پر متاثر کیا تھا اور مشرق و مغرب کی کشاکش نے دانشوروں کے لئے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں:

---

[1] افغانستان اور ایران میں اقبال پر مقالات و کتب از ڈاکٹر محمد ریاض مشمولہ اقبال ممدوح عالم مطبوعہ بزم اقبال کلب روڈ لاہور ص ۲۰۲

اورنگ زیب قاسمی

"مشرق کے مشترک ابتلا کے پیش نظر عصری فکر کے مختلف گوشوں میں مشابہت ملتی ہے۔ خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں اور ترکوں میں فکری اور تہذیبی لین دین کی تاریخی روایات کی موجودگی میں ایک ملک کے افکار دوسرے ملک پر برابر اثر انداز ہوتے رہے اور ایک ملک کے کرب و ابتلاء میں دوسرے ملک کے مسلمان اضطراری طور پر شریک رہے ہیں۔ اسلام اور مغرب کو دو متحارب قوتوں کے طور پر پیش کرنے میں جمال الدین افغانی کا بڑا حصہ ہے اور اس کے افکار سے برصغیر کے مسلمان اور ترک دونوں ہی متاثر ہوئے ہیں۔ جمال الدین افغانی کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا کے مفکروں میں سے شیخ محمد عبدہٗ، ضیا گوکلپ، امیر علی، سرسید، شبلی، ابوالکلام آزاد، سعید حلیم پاشا، طٰہٰ حسین، حالی، عبدالحق، حمید، ابراہیم تناسی، توفیق فطرت، محمد عاکف، اور علامہ اقبال بھی کسی نہ کسی عنوان سے مغربی تہذیب کا مقابلہ کرتے رہے ہیں ...... اقبال سے ترکی اور برصغیر کے فکری رشتے زیادہ مضبوط ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ بیک وقت ترکی اور برصغیر کی اسلامی روایات کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال نے اپنی کتاب "اسلام میں مذہبی خیالات کی تشکیل نو" (THE CONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT) میں سعید حلیم پاشا کی کتاب سے (جس کا ترجمہ فرانسیسی سے ترکی میں محمد عاکف نے اسلام لاشمک کے عنوان سے کیا ہے) اقتباس پیش کئے ہیں۔ 'جاوید نامہ' میں بھی سعید حلیم پاشا کی زبان سے مشرق مغرب کی کشمکش کا بیان ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے یہاں ضیا گوکلپ اور محمد عاکف کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ اقبال ترکی کے ملی مستقبل کے لئے ہمیشہ پرامید رہے ہیں اور اپنے آتشیں اشعار میں انہوں نے نہ صرف کمال اتاترک کی مدح کی ہے۔ بلکہ جگہ جگہ ترکی کے ماضی حال اور مستقبل کے لافانی نقوش ابھارے ہیں۔" [1]

تحریک خلافت نے ہندوستانی مسلمانوں کو جذباتی طور پر منسلک کر دیا ترکی سے اور یہ تحریک ہندوستان میں بھی زور وشور پر چلی۔ ترکی میں اقبال کے حیات و فن پر بھی مختلف ادیبوں

---

[1] ترکی میں مطالعہ اقبال از ڈاکٹر حنیف فوق مشمولہ اقبال ممدوح عالم مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر ناشر بزم اقبال لاہور ص ۴۰۸

نے وقتاً فوقتاً متعدد مقالات تحریر کئے اس کی ایک مختصر سی فہرست ڈاکٹر حنیف فوق نے اپنے طویل مقالے میں پیش کی ہے جو یقینی طور پر اقبال اور ترکی کے تعلقات کو سمجھنے میں معاون ہو سکتی ہے۔

مصر کے طٰہٰ حسین کا مقالہ "اقبال" بھی اس لحاظ سے قابل مطالعہ ہے جس میں انہوں نے اقبال اور ابوالعلاء المعری (۹۷۳ - ۱۰۵۷ء) کا تقابلی مطالعہ ان کے نظریات اور خیالات پر پیش کیا ہے۔ دراصل یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ جو عام قاری سے لے کر طالبعلموں اور اقبال کے معتقدوں کے لئے یکساں سودمند ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ اقبال کے عالمی مفکروں سے فلسفیانہ تعلقات کا رشتہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔ ابوالعلاء ایک نابینا فلسفی تھا۔ اقبال نے ایک نظم بھی ابوالعلاء پر لکھی۔ جس کا شعر ہے۔

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گذر اوقات

لیکن ڈاکٹر طٰہٰ حسین جو خود ایک نابینا ادیب اور مفکر تھے انہوں نے اقبال اور ابوالعلاء کا ایک دلچسپ تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے:

"اسلام میں دو ایسے شاعر گذرے ہیں۔ جنہوں نے اسلامی ادب کا پایہ آسمان تک پہنچا دیا ہے اور ان کی عظمت کا نقش جبین وقت پر ثبت کر دیا۔ ایک ہند و پاک کا شاعر اقبال اور دوسرا دنیائے عرب کا شاعر ابوالعلاء۔

یہ دو ایسے شاعر ہیں کہ جو ایک دوسرے سے انتہا درجہ کی مماثلت رکھتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے سے انتہائی مغائرت بھی رکھتے ہیں۔ دونوں بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ دونوں فلسفی ہیں اور دونوں نے فلسفے کو شعر اور شعر کو فلسفے کے تابع کر دکھایا ہے۔ حالانکہ دونوں عظیم الشان شعبوں میں مطابقت پیدا کرنا ازبس دشوار ہے۔ دونوں نے تصوف اختیار کیا تاآنکہ اس میں غایت درجے کی دسترس حاصل کی اور پھر اس کے بعد دونوں نے فرسودہ تصوف کی مقلدانہ روش کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور جادۂ تصوف پر اپنے لئے ایک خاص مسلک نکالا جس میں کوئی دوسرا شریک نہ تھا۔ دونوں نے زور و شور سے اپنی شخصیت کا اثبات کیا۔ اور انسان کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اپنی ذات کو اس طرح پہچانے جس طرح پہچاننے کا حق ہے اور اپنا نقش دنیا پر اور لوح زماں پر ثبت کر دے اور اپنی ذات کو کسی طرح بھی دوسری ذات ——— خواہ کوئی بھی ہو۔ فنا نہ ہونے دے۔ مگر اس سے آگے دونوں

اورنگ زیب قاسمی

کے درمیان شدید اختلاف و مغائرت کی خلیج حائل ہے۔

ان میں ایک یعنی ابوالعلاء ——— عمر بھر سرزمین ہندوستان کی طرف نظر جمائے رہے۔ اور وہاں کا اثر قبول کرنے اور وہاں سے اخذ و اکتساب میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ خود پر تارک الدنیا برہمنوں کی سی زندگی طاری کر لی۔

اور دوسرا اقبال ——— عربوں کی جانب نظریں لگائے رہتا تھا۔ ان کی ستائش میں رطب اللسان اور ان کا مدح گو تھا۔ اور وجود، حیات اور ارتقا کا استحقاق رکھنے والی انسانیت کا بہترین نمونہ انہی کو تصور کرتا تھا۔

یہ دونوں اپنے وجود پر ایمان رکھتے تھے اور لوگوں کو بھی یہی دعوت دیتے تھے کہ وہ خود پر ایمان لائیں۔ لیکن ان میں سے ایک یعنی — ابوالعلاء — کا خود پر ایمان ایسے انداز کا تھا کہ اسے مایوسی اور سلبی کیفیات تک لے گیا۔ جس کا نتیجہ لوگوں سے علیٰحدگی اور لاتعلقی کی صورت میں برآمد ہوا۔ حالانکہ وہ لوگوں سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس سے پہلے کسی نے نہ کی ہوگی۔

اور دوسرا بھی خود پر ایمان لایا اور اپنا آئیڈیل اپنے قریبی ماحول، یعنی ہندوستان میں تلاش کرنے کے بجائے عربوں میں تلاش کیا۔ پھر اس نے علیٰحدگی و لاتعلقی بھی اختیار نہ کی بلکہ خلوت گزینی کو ناپسند کیا اور زندگی اور لذائذ زندگی کو بھی رد نہ کیا بلکہ ان سے اپنا معقول حصہ وصول کیا۔ اس نے اپنے فطری تقاضوں پر ابوالعلاء کی طرح خط تنسیخ نہ کھینچا بلکہ تدبر سے کام لیا اور انہیں قابو میں لا کر اپنی عقل کا فیصلہ ان پر لاگو کیا۔" [1]

اقبال کی دنیا کافی وسیع تھی۔ محمد عبداللہ نے اپنے مقالہ "اقبال بنگلہ میں" میں اقبال کے کلام کا تعلق بنگلہ زبان میں کس طرح ہوا اس کی پوری جانکاری ہمیں دی ہے اور موصوف نے بنگلہ شاعری پر اقبال کے فلسفے کے اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

خود نذرالاسلام کی شاعری میں اقبال کے فلسفۂ خودی کی دمک ہے۔ نیز فرخ احمد، تعلیم حسین اور معظم الاسلام جیسے شعرا کے یہاں روح اقبال کارفرما نظر آتی ہے۔ بنگلہ زبان و ادب پر اقبال

---

[1] اقبال از ڈاکٹر طٰہٰ حسین مضمون مشمولہ اقبال ممدوح عالم ص ۲۹۲ - ۲۹۳

کی شاعری اور خیالات کے اثرات پر اس مجموعہ میں شامل ایک مقالہ "بنگلہ ادب اور اقبال" (از وقار راشدی) میں اس موضوع کی توضیح کی گئی ہے۔ اور مرد فن کاروں کے ساتھ ساتھ شاعرات نے بھی اقبال کی شاعری سے کسبِ نور کیا۔ اور یہ بڑی بات ہے کہ یہ مقام اقبال کو ملا۔

وحید قیصر ندوی (مقالہ اقبال اور بنگلہ ادب) خیال ہے کہ:

"اہلِ بنگال کو علامہ اقبال سے باضابطہ روشناس کرانے والے کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر امیہ چکرورتی کو علامہ مرحوم سے بڑی محبت تھی، اس لئے وہ بہت دنوں تک لاہور جا کر ان کی صحبت میں بھی رہے۔ اور ان سے فیض اٹھایا۔ انہوں نے کلکتہ کے انگریزی اور بنگلہ اخبارات میں علامہ اقبال پر مضامین لکھے۔" [1]

۱: ڈاکٹر اینا ماری شمل (روسی ادیب) نے اقبال اور منصور حلاج سے بحث کی ہے (ص ۱۷۱)

۲: اسپندور یزدانی نے دانتے اور اقبال کی فلسفیانہ موشگافیوں پر روشنی ڈالی ہے (ص ۱۵۲)

اس مجموعہ مقالات کو ترتیب دینے میں جو دقت ڈاکٹر سلیم اختر کو ہوئی ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ابتدائی دور میں جن یورپین مصنفین نے اقبال کے فکر و فن پر لکھا وہ تمام کے تمام مواد اس ضخیم کتاب میں موجود ہیں۔ دوسری چیز یہ کہ غیر ملکی ادیبوں کے مضامین کا سلیس اردو میں ترجمہ کر کے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ بعض ترجمے تو خود فاضل مصنف نے کئے اور کچھ اپنے دوستوں سے کروائے۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

مصنف	مترجم	عنوانات
۱: ڈاکٹر اے آر نکلسن	رئیس زیدی	اسرار خودی
۲: ڈاکٹر اے آر نکلسن	مولوی محمد عبداللہ	پیام مشرق
۳: ہربرٹ ریڈ	ڈاکٹر سلیم اختر	عظمت اقبال
۴: پروفیسر اے جے آربری	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	رموز بیخودی
۵: ای ایم فاسٹر	سید سلیمان ندوی	بلبل ہندوستان
۶: ای ایم فاسٹر	سلیم اختر	محمد اقبال
۷: پروفیسر توچی	شکور حسین یاد	اقبال اور انسانی اخوت کا پیغام
۸: ورس کلوڈ منیخ	ڈاکٹر سلیم اختر	فکر اقبال کی جہات
۹: ڈاکٹر شیلا مکڈونلف	وحید رضا بھٹی	مسجد قرطبہ ۔ کشف یا فنا
۱۰: ڈاکٹر ایل آر ایلیسن	شاہد ملک	اقبال عظیم شاعر اور فلسفی
۱۱: خالد احمد	شکور حسین یاد	اقبال روس میں
۱۲: ایل آر گورڈن پولنسکایا	وحید عشانی	اقبال کے سماجی نظریات
۱۳: ایم ٹی سٹے پنیانتین	ڈاکٹر سلیم اختر	فلسفۂ اقبال میں اخلاقیات کے مسائل
۱۴: ڈاکٹر ضیاء الدین سجادی	ڈاکٹر آفتاب اصغر	عصر جدید کا مفکر اور فلسفی: اقبال
۱۵: ڈاکٹر علی احمد رجائی	ڈاکٹر محمد ریاض	اقبال کا ایک شعر
۱۶: ڈاکٹر عبدالوہاب عزام	وقار احمد رضوی	پیام مشرق
۱۷: ڈاکٹر طٰہٰ حسین	خورشید احمد رضوی	اقبال ایک شاعر جس نے زمانے پر اپنا سکہ جمایا
۱۸: ڈاکٹر علی بنادر نارلان	خواجہ عبدالحمید یزدانی	اقبال اخلاقی شاعر اور نابغہ
۱۹: شہزادہ احمد علی خاں درانی	مجاز لکھنوی	علامہ اقبال
۲۰: پروفیسر ایس آئی فہد	ڈاکٹر محمد معروف	اقبال کا انقلابی فلسفہ
۲۱: محمد ناصر	ڈاکٹر محمد معروف	اقبال کا سیاسی فلسفہ
۲۲: نساویچے رتن	شکور حسین یاد	اقبال اسلامی احیا کا داعی

[1] اقبال اور بنگلہ ادب از وحید قیصر ندوی مشمولہ اقبال ممدوحِ عالم ص ۴۹۵

اورنگ زیب قاسمی

چوتھا باب

افسانہ، انشائیہ اور سلیم اختر

فنی مباحث سے تجزیے تک

انشائیہ کی بنیاد

انشائیہ آج کے دور کی معروف صنف ادب ہے یورپ کے اثر سے جو صنف ادب اردو میں مقبول ہوئیں ان میں مضمون نویسی ESSAY WRITING سب سے اہم ہے۔ بعض لوگ انشائیہ کی اولین شناخت مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں خاص طور سے 'نیرنگ خیال' کے مضامین سے کرتے ہیں اور مضمون نویسی میں رشید احمد کا نام لیا جاتا ہے۔ مضمون نویسی کے ذریعہ سنجیدہ موضوعات پر اظہار خیال ممکن ہو سکا۔ اس صنف کی کوکھ سے انشائیہ نے جنم لیا اس لئے ابتداء میں انشائیہ کو مضمون کا ہم معنی سمجھا گیا۔ ہمارے نقادوں نے انشائیہ کو مضمون ہی کا ایک رُخ قرار دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مضمون اپنے مزاج کی سنجیدگی، طوالت، بیان کی خشکی اور طریق استدلال کی بنا پر انشائیہ سے مختلف چیز ہے۔ اس انشائیہ کو مقالہ قرار دینا بھی نامناسب ہے۔ کیونکہ مقالہ کی فضا تحقیق اور کسی حد تک تنقیدی ہوتی ہے۔ جب کہ انشائیہ اپنے مزاج کے اعتبار سے مضمون اور مقالہ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مضمون اور مقالہ خارجی واقعات کو زیر بحث لاتے ہیں جبکہ انشائیہ داخلی جذبات و احساسات کا آئینہ ہوتا ہے۔ تحقیق و تنقید، طوالت اور استدلال انشائیہ کی خصوصیات نہیں۔ انشائیہ تخلیقی ادب ہے۔ جس طرح غزل، نظم، افسانہ وغیرہ تخلیقی اصناف ادب میں شامل ہیں۔ ان اصناف میں شاعر یا ادیب کی قوت تخیل کارفرما ہوتی ہے۔ اسی طرح انشائیہ میں بھی تخیل کی کارپردازی اور حسن آفرینی کو ہر جنبش قلم میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مضمون اور مقالہ میں معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر کیا جاتا ہے مضمون نگار بعض حقائق تک قاری کی رسائی چاہتا ہے۔ مگر اس میں آہستہ روی کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ اپنی معلومات کو ترتیب و تنظیم سے پیش کر کے اُسے قابل فہم بناتا ہے۔ انشائیہ نگار کا کام اپنی بات کو تعجب خیز بنا کر پیش کرنا نہیں ہوتا۔ وہ بات کو کسی بھی

نقطہ نظر سے شروع کر سکتا ہے اور کسی بھی نکتہ پر لا کر ختم کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب "انشائیہ کی بنیاد" میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ انشائیہ کی جڑوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ساتھ ماضی سے حال تک اس کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔

سب سے پہلی بات جو انہوں نے اس کتاب میں لکھی ہے وہ یہ ہے کہ جدید انشائیہ کا ماخذ مغربی ادب میں تلاش کیا جانا چاہئے۔ خود انہوں نے مختلف مغربی نقادوں اور انشائیہ نگاروں کی تخلیقات میں انشائیہ کے عیب و ہنر دریافت کرنے کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی ہے۔ دوسرے نقادوں کی طرح ان کے یہاں رائے دہی میں قطعیت کے ساتھ کوئی فیصلہ دینے کی روش نہیں ملتی بلکہ اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔ اس مضمون یعنی "انشائیہ ـــــ مغرب میں" کے آخر میں مغربی ادیبوں اور فنکاروں کی ایک فہرست بھی دی ہے جو فرانسس بیکن ۱۵۶۱ — ۱۶۲۶ء سے لیکر ولیم سارویاں ب ۱۹۰۸ء تک ۱۴۸ ادیبوں کے نام معہ تاریخ پیدائش اور وفات درج ہیں چند خاص خاص افراد جیسے فرانسس بیکن ۱۵۶۱—۱۶۲۶ء، جان ڈرائن ۱۶۳۱— ۱۵۷۱ء، سموئیل جانسن ۱۷۰۹—۱۷۸۴ء، جان ملٹن ۱۶۰۸—۷۴ء، ابراہم کاؤلے ۱۶۱۸—۶۷ء، بنجامن فرینکلن ۱۷۰۶—۹۰ء، ڈیوڈ ہیوم ۱۷۱۱—۷۶ء، کارلائل ۱۷۹۵—۱۸۸۱ء، تھیکرے ۱۸۱۱—۶۳ء، ڈکنس ۱۸۱۲—۷۰ء، میتھو آرنلڈ ۱۸۲۲—۸۸ء، جان گالزوردی ۱۸۶۷—۱۹۳۳ء، برٹرینڈ رسل [illegible]ء، ای ایم فاسٹر ۱۸۷۹ء، ورجینیا وولف ۱۸۸۲—۱۹۴۵ء، ڈی ایچ لارنس ۱۸۸۵—۱۹۳۰ء، جے بی پریسٹلے ۱۸۹۴ء، جوزف ایڈیسن ۱۶۷۲—۱۷۱۹ء، رچرڈ اسٹیل ۱۶۷۲—۱۷۲۹ء، رابرٹ لوئی اسٹیونسن ۱۸۵۰—۹۴ء وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

خیر الدین انصاری (پاکستانی) لکھتے ہیں:

"فن انشائیہ نگاری کا بابا آدم اگرچہ فرانس کا مونتین ہے اور انگریزی میں بیکن نے اس کو متعارف کرایا۔ لیکن جہاں تک اردو انشائیہ نگاری کا تعلق ہے یہ سراسر اجنبی شئے نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے دھندلے دھندلے خدوخال اردو زبان کی ابتدائی کتابوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ملا وجہی کی سب رس اور رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب کے مختلف صفحات پر جگہ بہ جگہ اس کے دلکش ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ اسی طرح مرزا غالب کے خطوط میں تحریر کا غیر رسمی انداز ملتا ہے اور مصنف کی ذات بھی منکشف ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ خطوط مکمل انشائیہ نہیں بن سکے۔ کیونکہ نثر پاروں میں وہ لوازم موجود نہیں تھے جو کسی نثر پارے کو انشائیہ بناتے۔ یعنی انسانی شعور کو

پرانے قالب سے نکال کر نئے قالب میں لے آنے کا عمل ویسے یہ غالب کی کوئی شعوری کوشش بھی نہ تھی۔
البتہ سر سید احمد خاں کی کوشش سوچا سمجھا اقدام تھا۔ انہوں نے اسٹیل اور ایڈیسن کے تتبع میں
"تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اس کے اجرا کا واحد مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی اور
ان کو مہذب بنانا تھا۔ انہوں نے اپنے مدعا کے اظہار کے لئے سادہ غیر رسمی اور غیر آراستہ انداز تحریر
اختیار کیا۔ نیز ان کی آزادہ مزاجی اس کی بعض تحریروں کو انشائیے کے بہت قریب لے گئی ہے۔
یہ تحریریں محض اس لئے انشائیہ بنتے بنتے رہ گئی ہیں کہ مصنف کا مقصد اصلاحی اور بیان میں منطق
استدلال آگیا ہے۔ یہی حال مہدی افادی کا ہے۔ جن کے رشحات قلم پر انگریزی انشاء کا اثر
نمایاں ہے۔ لیکن ان کے ہاں بھی وہ شے مفقود ہے جو کسی نثر پارے کو انشائیہ کا درجہ دیدیتی ہے۔
ویسے یہ لوگ اپنے مضامین کو انشائیہ کہتے بھی نہیں تھے۔ شاید وہ انشائیہ کے لفظ سے واقف بھی
نہ ہوں گے کیوں کہ انشائیہ کا لفظ سب سے پہلے ڈاکٹر اختر اورینوی نے علی اکبر قاصد کے مجموعہ
"ترنگ" کا تعارف کراتے ہوئے استعمال کیا جس کا مطالعہ مفید رہے گا لکھتے ہیں:

"دراصل انشائیہ فلسفیت اور رنگینی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایسی فلسفیت جس میں
دل جلا پن، خشونت یا وحشت خیز سنجیدگی نہ ہو یہاں فلسفہ ہوتا ہے مگر بغیر رنج ہوئے جیسے کہ
رنگینی ہوتی ہے مگر ذمہ داری کے ساتھ۔ رندی اور احتساب کا عجیب و غریب مجموعہ مضحکہ خیز نہیں
بلکہ امتزاج کامل کے نتیجے میں بڑی دلنواز شخصیت پیدا کرتا ہے ایک صوفیت جس میں مزاح کا نمک
ملا دیا جائے انشائیے میں واقعات تو ہو سکتے ہیں مگر ان کا استدلال اور برتاؤ انشائیے کے خاص
رنگ میں ہونا چاہئے۔ انشائیے میں مختصر افسانوں کی تکنیک برت لی جائے تو پھر انشائیہ نہیں
رہے گا۔ بعض ادبا انشائیہ لکھنے بیٹھتے ہیں مگر اس میں ماجرہ اتنا بالیدہ ہو جاتا ہے اور مختصر تکنیک
اتنی چھا جاتی ہے کہ نتیجے میں جو چیز پیدا ہوتی ہے کم از کم انشائیہ نہیں ہوگی۔" ۱؎

پروفیسر احتشام حسین نے انشائیہ کے سلسلے میں چند اہم باتیں لکھی ہیں ملاحظہ ہو:

"اگر میں پیش لفظ اس اعتراف سے شروع کروں کہ میرے ذہن میں انشائیہ
کا کوئی منطقی اور علمی تعریف نہیں ہے تو یقیناً مجھ پر لاعلمی اور رجعت کا الزام نہیں لگایا جائیگا کیونکہ
میں خود ان تمام مشرقی اور مغربی نقادوں کو شک کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں جنہوں نے قطعیت

۱؎ ڈاکٹر انور سدید اردو انشائیہ از ظہیر الدین انصاری شائع شدہ ماہنامہ کتاب نما دہلی دسمبر ۱۹۶۸ء

اورنگ زیب قاسمی

کے ساتھ اس کی تعریف کی ہے اور اسکو صحیح اور مناسب ترین قرار دیا ہے۔ لیکن اس کا مقصد
یہ بھی نہیں ہے کہ میرے ذہن میں انشائیہ کا کوئی تصور ہی نہیں۔ یہ تصور کسی منطقی تعریف کی شکل
میں نہیں ایک علمی تاثر کی شکل میں میری ذہنی کرہ کے افق پر جھلملاتا رہا ہے اور جب میں اسے لفظوں
میں اسیر کرنا چاہتا ہوں تو گرفت میں نہیں آتا شاید یہی فرق ایک علمی یا معلوماتی مضمون میں اور
انشائیہ میں ہوا۔" ۱؎

آگے لکھتے ہیں

"میرا خیال ہے کہ انشائیہ کی کوئی ایسی حد بندی نہیں ہونی چاہئے جو اچھے
خیال انگیز ادیبانہ اور ذہنی آسودگی بخشنے والے ادب پاروں کو صرف اس بنا پر اس صنف میں شامل
نہ ہونے دے کہ اس میں کوئی مخصوص بات جو کسی لغت یا کتاب میں انشائیہ کے بارے میں بتائی گئی ہے
نہیں ملتی۔" ۲؎

اختر اورینوی کا یہ مضمون "انشائیہ نگاری"، "مہر نیم روز کراچی کے اختر اورینوی نمبر (جلد ۲ شمارہ ۷-
۱۹۷۷ء) میں شامل ہے۔ جب کہ محمد حسنین نے "صنف انشائیہ اور انشائیے" میں دو ٹوک الفاظ میں نہ صرف
یہ کہ اختر اورینوی کی خطا کا اعتراف کیا بلکہ انہوں نے تو علی اکبر قاصد کو پہلا انشائیہ نگار بھی قرار دیا وہ لکھتے
ہیں:

"سید شاہ علی اکبر قاصد مرحوم متوطن پھلواری شریف پٹنہ اس لحاظ سے اردو کے
پہلے انشائیہ نگار ہیں کہ انہوں نے انشائیہ کے نام اور اسلوب کے واضح تصور کے پیش نظر قلم اٹھایا
یہ ۱۹۴۳ء کی بات تھی جب وہ ادبیات انگریزی میں آنرز کر رہے تھے۔ پٹنہ کالج میں پروفیسر
کلیم الدین احمد اور پروفیسر اختر اورینوی جیسے لائق معلمین نے ان کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔
"ترنگ" ان کے انشائیوں کا مختصر مجموعہ جو ۱۹۴۵ء میں پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ ترنگ
کے مقدمہ میں ڈاکٹر اختر اورینوی نے اسی نثری اسلوب کو انشائیہ سے نامزد کیا تھا۔
لفظ انشائیہ ان کی ایجاد نہیں مگر اس نوع کی تحریروں کی نامزدگی میں زبان پر اختر اورینوی
کا نام بے ساختہ آئے گا۔" ۳؎

۱؎، ۲؎ پیش لفظ از سید احتشام حسین مشمولہ صنف انشائیہ اور چند انشائیے سید محمد حسنین پٹنہ ص ۶-۷
۳؎ صنف انشائیہ اور چند انشائیے ص ۴۳-۴۴ مطبوعہ پٹنہ ۱۹۷۶ء

ڈاکٹر سلیم اختر نے انشائیہ کی افہام و تفہیم میں ہندوپاک کی بہت کی علمی اور ادبی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور بہت خوبصورتی سے اپنے اس مطالعہ کو انشائیہ کی بنیادیں میں سمیٹا ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کے بعض مصنفین نے ڈاکٹر وزیر آغا کو انشائیہ لفظ کا موجد اور پہلا انشائیہ نگار قرار دیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے اس بے غبار بات کی سختی سے تردید کی ہے اس سلسلے میں خود ان کا بیان ملاحظہ ہو :

"انشائیہ کی اصطلاح کی بحث کے بعد اب اس امر کا تعین باقی رہ جاتا ہے کہ اردو میں سب سے پہلا انشائیہ نگار کسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے کلیم CLAIM کو تو بعض صاحب نے یہ مسترد کر دیا جنہوں نے یہ فرمایا۔

"انشائیہ کی صنف ۵۰ سال پہلے بھی موجود تھی اس وقت اسے انشائے لطیف کہا جاتا تھا۔ علامہ نیاز فتحپوری، قاضی عبدالغفار اور سجاد حیدر یلدرم، انشائے لطیف لکھا کرتے تھے اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ انشائیہ کسی خاص شخص نے حال ہی میں ایجاد کیا ہے"

ہمیں اس خاص شخص ۔۔ سے دلی ہمدردی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ظالم لوگ سچ بولنے پر تلے بیٹھے ہیں ویسے پہلے انشائیہ نگار کے تعین میں بھی ناقدین کی آراء میں خاصہ اختلاف پایا جاتا ہے۔۔۔ [1]

انشائیہ کی بنیادیں، ڈاکٹر سلیم اختر نے بعض بعض جگہوں پر بڑی پُر معنی اور دلچسپ بحثیں اٹھائی ہیں۔ خاص طور سے کتاب کے اندر شامل "انشائیہ ۔ کیا نہیں"؟ تو سب سے زیادہ دلچسپ ہے اور یہ باب خاص طور سے ان کے فکری رویہ کی ترجمانی کرتا ہے ان کا یہی مضمون ماہنامہ شاعر بمبئی کے ایک خاص شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں :

"یہ جو انشائیہ کے بارے میں اتنا خلط مبحث ہے تو اس کی ایک وجہ اسی انداز کی تعریفیں بھی ہیں اور جیسا کہ ابتدا میں لکھا گیا ہے انشائیہ کی اسی نوع کی تعریفیں بالعموم انشائیہ نگاروں نے کر رکھی ہیں اور یہ بالعموم ایسی تعریفیں ہیں جو اُن کے اپنے انشائیوں کا جواز بنتی ہیں۔ اس لئے شاعرانہ اسلوب اور استعاراتی پیرایہ سے قطع نظر کرتے ہوئے سادہ سی نثر میں اگر انشائیہ کی تعریف مقصود ہو تو پھر میرے خیال میں "بیدار ذہن کے حامل تخلیقی شخصیت کی زندگی کے تنوع

---

[1] انشائیہ کی بنیاد از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۴۰ مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۷ء

اورنگ زیب قاسمی

سے زندہ دلچسپی کے بامزہ نثر میں مختصر اور لطیف اظہار کو انشائیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔۔۔

اس تعریف میں بیدار ذہن اور تخلیقی شخصیت انشائیہ نگار کی ہے۔ زندگی کا تنوع موضوعات کی کثرت کا ضامن ہے۔ زندہ دلچسپی نظر کی تازہ کاری کی مظہر ہے۔ بامزہ نثر انشائیہ کے اسلوب کا وصف خاص ہے۔ اور لطیف اظہار نزاکت بیان سے وابستہ ہے۔ اگر مزید گہرائی میں جائیے تو ذہن انشائیہ نگار کی تعلیم، مطالعہ اور استدلال سے عبارت ہے جبکہ اس کے تمام نفسیاتی کوائف کے مجموعہ کا نام شخصیت ہے اس لئے اگر ذہن بیدار ہو اور شخصیت تخلیقی ہو تو یقیناً انشائیہ کے لئے یہ مٹی بڑی زرخیز ہے۔" دیگر تعریفوں کی مانند یہ تعریف بھی جزوی صداقت کی حامل ثابت ہو۔ لیکن یہ اس بنا پر قابل توجہ ہے کہ ایک تو بات سمجھ میں آجاتی ہے اور تجربات سمجھ میں آجاتی ہے وہیں کہی گئی ہے اس لئے اس کی ایک سے زائد تشریحات یا توجیہات نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا کثرت تعبیر کی بھول بھلیاں میں معنی کی گڈری کا سرا گم نہیں ہو جاتا۔ اور پھر انشائیہ کے ضمن میں زاویہ نگاہ، اختصار، اسلوب اور حسن بیان پر بالعموم زور دیا جاتا ہے۔ تو وہ سب اس کی تعریف میں آجاتے ہیں۔ اور پھر اس تعریف کی ایک اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں نہ تو ٹانگوں میں سے جھک کر دیکھنا پڑتا ہے۔ نہ عقب میں دیکھنا پڑتا ہے۔ اور نہ ہی سر کے بل کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی کیچڑ میں لوٹ لگانی پڑے گی۔۔۔ [1]

انشائیہ نگاری پر انشائیہ نگاروں کی طرز روش پر جو قدغن لگائی جاتی ہے اس باب میں سلیم اختر لکھتے ہیں:

"انشائیہ کے ضمن میں ہدایت نامہ جاری کر دیا کہ انشائیہ میں طنز نہ ہو، مزاح نہ ہو، مقصد نہ ہو، اس کا زندگی سے تعلق نہ ہو، الغرض ! اچھا خاصہ ہدایت نامہ انشائیہ نگاری مرتب کر ڈالا۔ اب جس باغی نے اس ہدایت نامہ سے روگردانی کی اسے انشائیہ نگار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور انکار کے اس عمل کا آغاز سرسید سے شروع ہوا تو شکور حسین یاد اور نظیر صدیقی سے ہوتا ہوا صلاح الدین حیدر تک آپہنچا۔ ادھر نوآموز اور غیر تخلیقی ذہن کے حامل ادیب اوراق میں چھپنے کی خاطر ان کے فارمولوں کے مطابق انشائیہ قلم بند کرتے اور مملکت انشائیہ میں آباد ہوتے جاتے ہیں لیکن کب تک ۔۔۔؟ اگر ہدف کو توڑنا نہیں صرف گنتی مقصود ہو تو بلاشبہ انشائیہ کے میدان میں خاصی ریل پیل۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ موثر تحریریں برائے نام دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انشائیہ

---

[1] انشائیہ کی بنیاد از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۰۲ اور ماہنامہ شاعر جولائی ۱۹۷۸ء ص ۴۰ بمبئی

میں اعتراف ذات بہت اچھی چیز ہے۔ مگر اس کے لئے چارلس لیمب جیسی حساس شخصیت بھی ہونی چاہئے۔ لہٰذا ان حالات میں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ عمومی فروغ کے باوجود انشائیہ فن اور وژن کے لحاظ سے کمتر ہوتا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو یہ خدشہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کہیں یہ مصنوعی رونق اور چال چمک دمک مریض کا سنبھالا تو نہیں اور کہیں انشائیہ اس مقام پر تو نہیں پہنچا جس کے لیے چرچل نے بہت خوبصورت بات کہہ رکھی ہے

"BEGINNING OF THE END" -

انشائیہ نگاری کے مستقبل پاکستانی ماحول، حالات اور تناظر کے پیش نظر دیکھتے ہیں۔

"یوں دیکھیں تو انشائیہ کی مقصدیت دیگر اصناف کی مقصدیت کی مانند کمٹمنٹ کا مسئلہ بن جاتی ہے اور بے مقصد انشائیہ نویس حضرات کو یہ منظور نہیں کیونکہ ہر نقطہ نظر کسی نہ کسی مرحلہ پر کوئی نہ کوئی قربانی ضرور طلب کرتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر وزیر آغا معاشرے کے جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس کے لئے جبلی طور پر ادب برائے زندگی اور اس کے مضمرات ناقابل قبول ہیں۔ یہ طبقاتی تضاد کی بات ہے۔ اس لئے انہیں قابل معافی بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے ذاتی تصورات کی روشنی میں انکی کی مرتبہ فہرست کو تمام صنف پر لاگو کر کے اس کے خدوخال کیسے مسخ کئے جاسکتے ہیں اور کیوں کوئی بھی صنف ادب کیوں نہ ہو اس کے پاؤں ہمیشہ زمین پر ہوتے ہیں اور سانس اپنی دھرتی کی فضا میں لیتی ہے۔ اس سے وہ اپنے عصر کی سمت نما قرار پاتی ہے تخلیق کار اپنے تخیل کی امداد سے سات افلاک کی کیوں نہ سیر کر آئے۔ مگر جس طرح ان دیکھی فضاؤں میں اڑنے کے باوجود پنچھی سر شام اپنے آشیانہ کی طرف محو پرواز ہوتا ہے۔ اسی طرح تخلیق کار بھی اپنی دھرتی اور زمانے سے ماوراء نہیں رہ سکتا کہ اس کی کمٹمنٹ اس کا آشیانہ ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انشائیہ کسی سیاسی جماعت کے منشور کے تابع ہو اور اس سے حفظان صحت کے اصولوں کا پرچار اور اخلاق عامہ کے سدھار کا کام لیا جائے کہ تخلیق کو مقصدیت کی اس سطح پر لانا اس کے حسن کو غارت کر دینے کے مترادف ہوگا۔ لیکن منشور یا رہنما اصولوں کے بغیر لکھنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تخلیق روح عصر سے اس قدر بیگانہ ہو جائے کہ وہ اپنے وطن کے جغرافیہ اور تاریخ دونوں سے بے نیاز ہو کر کسی ایسی فضا میں معلق نظر آئے جو سرے سے فضا ہی نہیں۔۔۔۔۔ اس ربع صدی میں انشائیہ کے ضمن میں

۱؎ انشائیہ کی بنیاد از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۳۰

اورنگ زیب قاسمی

تخلیق اور تنقیدی سطح پر خاصہ کام ہوا ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ یہ انشائیے پاکستانی قوم کے تشخص کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان انشائیوں کے آئینہ میں پاکستانی قوم کے مزاج، سوچ، انداز اور اطوار کے نقوش نظر نہیں آتے۔ جب کہ انگریزی انشائیے کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا کہ ہزار تنوع کے باوجود وہ ایک انگریز کی سوچ محسوس ہوتا ہے۔ ادھر اس کے برعکس اپنا یہ حال ہے کہ آج پاکستان میں لکھا جانے والا انشائیہ۔ پاکستان کے علاوہ بھارت، سری لنکا، بنگلہ دیش، سکم اور بھوٹان الغرض کسی بھی دھرتی کا قرار دیا جاسکتا ہے کہ آج کا انشائیہ پاکستانیت کی خوشبو سے معرا محض کاغذ کا پھول بن کر رہ گیا ہے۔" ۱؎

ڈاکٹر سلیم اختر نے انشائیہ کے فن اور تکنیک، اس کے ماضی، حال، مستقبل، کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ اور خاص طور سے پاکستان کے اندر لکھے جانے والے انشائیہ سے کافی مایوس نظر آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس ملک کا ادیب جس صنف میں طبع آزمائی کر رہا ہو اس ملک کی مٹی کی خوشبو اس کی تخلیقات میں پائی جانی چاہئے۔ لیکن پاکستان ایسا ملک ہے جہاں کا انشائیہ اپنی دھرتی اور ملک و آب و ہوا سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس ملک کے انشائیہ نگار اپنی تخلیقات میں کس طرح کی اصلاح لاتے ہیں جو ہر خاص و عام کے لئے قابل قبول ہو۔ لیکن میرے خیال میں کسی فن کار سے کسی خاص چیز کا مطالبہ کرنا درست نہیں۔ اس سے فن کار کی تخلیقی صلاحیتوں کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہے۔

افسانہ حقیقت سے علامت تک

ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ کتاب بھی اردو فکشن کو سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ فکشن سے متعلق تمام مباحث کو اس کے اندر سمیٹ لیا گیا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر لکھے گئے فکشن سے متعلق مضامین کا مجموعہ ہے۔ لیکن ترتیب ایسی رکھی گئی ہے کہ اس کے مطالعہ سے اردو فکشن کی ایک تجزیاتی تاریخ سامنے آجاتی ہے خود انہیں کے لفظوں میں:

"باغ و بہار سے لیکر راجندر سنگھ بیدی کے افسانے "متھن" تک۔ یہ اس مجموعہ کے پہلے اور آخری مضمون کے عنوانات ہی نہیں بلکہ داستان سے مختصر افسانہ کے سانچے

۱؎ انشائیہ کی بنیاد از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۳۲۵-۳۲۶

میں سما جانے تک اردو نثر نے گزشتہ پونے دو سو سال میں جو جو کروٹیں بدلیں ان کی کہانی بھی ہے، داستان، ناول، ناولٹ، طویل مختصر افسانہ، مختصر افسانہ اور مختصر مختصر افسانہ یعنی یہ کہانی کہنے کے فن کے مختلف طریقے نظر آتے ہیں۔ لیکن ذرا ژرف نگاہی سے دیکھنے پر سب کے پس پردہ ایک ہی جذبہ محرک نظر آتا ہے۔

کہانی کیسے موثر ہو؟ یہ وہی جذبہ ہے جس نے الاؤ کے گرد رات گئے تک سامعین کے حلقے میں داستان گو کو جادو بیان بنائے رکھا۔ یہ جذبہ جبلت کی مانند سب میں ہے۔ فرق صرف اظہار کے لیے اپنائے گئے طریقوں کا ہے۔ رات دیر سے گھر آنے پر بیوی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہانی گڑھی جائے یا پوتوں پوتیوں کو کہانی سنا کر سلایا جائے — بنیادی جذبہ ایک ہی ہے۔ پہلے "ایک تھا بادشاہ" کہہ کر شروع کرتے تھے۔ اب "ایک بے انسان" کہتے ہیں۔ کبھی شہزادے شہزادی کی کہانی دلچسپ لگتی تھی۔ اب مرد و عورت کی۔ پہلے ہیرو شمشیر بکف خارجی دنیا کے طلسمات فتح کرتا تھا اب ہیرو اپنی ذات کے حجرۂ ہفت بلا میں مقید ہے۔

کہانی کہنے والے کے پاس بات کہنے کا جادو ہے یہی وہ اسم اعظم ہے جس کے ذریعہ وہ تکنیک کا جن مسخر کرتا ہے۔ یہ اسم اعظم ہر ایک کو نہیں ملتا نہ گھر دیر سے آنے والے شوہر کو نہ سبق یاد کرنے والے نالائق طالب علم کو، نہ نانی اماں کو، اور نہ جھوٹی محبوبہ کو! اسی لئے تو کہانی سننے والوں کے مقابلہ میں کہانی کہنے والوں کی ہمیشہ قلت رہی ہے۔" [1]

"باغ و بہار ایک مطالعہ" کے تحت انہوں نے باغ و بہار کے ابتدائی ماخذات سے بحث کرتے ہوئے اس کتاب کی فنی اور تکنیکی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اور اس کتاب کے عیب و ہنر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ "اردو کا پہلا جنسی افسانہ" کے تحت انہوں نے نیاز فتحپوری اور سجاد حیدر یلدرم کے بعض افسانوں کا ذکر کیا ہے۔ جیسے یلدرم کے "خیالستان" کے بعض افسانوں پر بحث کی گئی ہے۔ افسانوی ادب کی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ کے تحت لکھتے ہیں:

"افسانوی ادب کی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ کرنے سے پہلے اس اساسی امر کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ نفسیاتی مطالعہ ادب پارے کی تکمیل کے بعد سے نہیں بلکہ اس کی تخلیق سے پہلے شروع ہوتا ہے۔" [2]

---

[1] پیش لفظ: افسانہ — حقیقت سے علامت تک از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۰-۹ مطبوعہ اردو رائٹرز گلڈ، الہ آباد ۱۹۸۰ء

[2] افسانہ حقیقت سے علامت تک از ڈاکٹر سلیم اختر

اورنگ زیب قاسمی

موصوف اس ضمن میں پلاٹ، نقطۂ عروج اور نقطۂ اختتام پر بھی بھرپور روشنی ڈال کر اسے نفسیاتی پیمانے پر پرکھتے ہیں۔ کرداروں کا بھی جائزہ اسی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ "افسانہ — حقیقت سے علامت تک" موصوف کا ایک دلچسپ اور سرفہرست مقالہ ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں:

"داستان اور ناول کے برعکس اردو افسانہ کا آغاز ہی حقیقت نگاری سے ہوتا ہے۔ داستان نگار ہمیشہ تخیل کی پُراسرار بھول بھلیوں اور مافوق الفطرت میں مگن رہے جبکہ ناول نذیر احمد کے وعظوں، عبدالحلیم شرر کی تاریخی مہمات (جنہیں وہ خود بھی لائٹ لٹریچر قرار دیتے تھے) اور رتن ناتھ سرشار کے طویل ترین فسانہ، کے مراحل طے کرنے کے بعد کہیں مرزا رسوا کی "امراؤ جان ادا" کی صورت میں حقیقت نگاری کی طرف آتا ہے۔ لیکن پریم چند نے اپنے پہلے افسانہ "دنیا کا انمول رتن" سے لے کر آخری عمر کے مشہور ترین افسانہ "کفن" تک حقیقت نگاری کو اپنے فن کی اساس قرار دیا۔ یوں ان کے زیر اثر اردو افسانہ آغاز سے ہی اس منزل پر تھا جہاں تک ناول کو پہنچنے کے لئے خاصی مدت لگی اور شاید اسی لئے حقیقت نگاری (اور بعد ازاں واقعیت نگاری) کے لحاظ سے آج بھی افسانہ ناول کے مقابلے میں کئی منازل آگے نظر آتا ہے۔ بلکہ آج کا ناول تو "رومانی معاشرتی" کی دلدل میں پھنسا نظر آتا ہے۔

پریم چند، ترقی پسندوں کے لئے AVANTE GARDE ہی نہ تھے بلکہ اپنے فن میں ترقی پسندی کے جملہ خواص بھی رکھتے تھے اسی لئے ان کے افسانوں میں وہ تمام خاصیتیں مل جاتی ہیں۔ جنہیں ترقی پسند افسانہ کی اساس قرار دیا جاتا ہے موضوع کی تدبیر کاری میں انہوں نے جس حقیقت نگاری پر زور دیا وہ آنے والوں کے لئے ایک اچھی مثال ثابت ہوئی۔" [1]

ڈاکٹر سلیم اختر کا یہ کہنا درست ہے کہ اردو کہانیاں ناولوں سے آج بھی دو قدم آگے ہیں اور اردو میں حقیقت نگاری کا شعور صحیح معنوں میں پریم چند کی تخلیقات کے بعد سے آیا۔ ان کے دیگر معاصرین کے یہاں کسی نہ کسی طرح سے یہی رویہ ملتا ہے لیکن ان کے دیگر معاصرین کا ذہن اتنا تجزیاتی اور منطقی نہیں تھا جتنا پریم چند کا تھا۔

علامتی افسانہ اور تجریدی افسانہ دونوں بالکل جداگانہ ہیں اور ہر دو کے تکنیکی تقاضے الگ الگ ہیں۔ لیکن بالعموم دونوں کو ایک ہی سانس میں ایک دوسرے کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ علامتی افسانہ کی بنیاد اساطیر یا کتھا تاریخی داستانوں میں ہوتی ہے اور پھر یہ کسی مذہبی قصہ کو داستان کی منزل سے اتار کر افسانہ کی منزل تک لایا جاتا ہے۔

---

[1] افسانہ حقیقت سے علامت تک ڈاکٹر سلیم اختر ص ۹۶

اور اس طرح لوگ ماضی کے پردے پر حال کی تصویر دیکھتے ہیں یا ماضی کے دھندلکے میں حال کی روشنی تلاش کرتے ہیں۔ علامتی افسانہ میں کسی خاص واقعہ کو بنیاد بنا کر اسے افسانوی رنگ میں ڈھالا جاتا ہے۔ لیکن علامتی کہانیوں میں جو جھول ہے کمی ہے اور خرابی ہے۔ وہ یہ کہ علامتی کہانیوں کے قاری، کہانیوں میں وہ سب کچھ نہیں پاتے جس کی توقع وہ علامتی انداز سے ہٹ کر لکھی ہوئی کہانیوں سے رکھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ علامتوں کی روح میں اتر گئے تو انہیں اس میں بڑا لطف آئے گا۔ اس طرح افسانہ نگار اور اس کا قاری دونوں ایسی کہانیوں میں اپنی دلچسپی کا سامان پاتے ہیں۔

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم جدید سائنس کے دور میں ROBOT کو بھی ایک علامت مان کر کوئی سائنسی جن یا دیو کی کہانی گڑھ سکتے ہیں اور قاری کی دلچسپی کا سامان فراہم کر سکتے ہیں۔ آج کے یُگ میں روبوٹ بھی وہی کام انجام دے رہا ہے۔ جو کسی زمانے میں علاؤالدین کے چراغ کا جن دیا کرتا تھا۔

تجریدی افسانہ میں انتشار کی تصویر انتشار کی صورت میں نظر آتی ہے۔ گرچہ تجریدی افسانہ بھی واقعیت نگاری کی صف میں آتا ہے۔ لیکن تجریدی افسانہ انسان کو متنوع اور بعض اوقات باہم متصادم نفسی کیفیات کے روپ میں دکھاتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تجریدی افسانہ کا تعلق آزاد نظم یا تجریدی آرٹ سے ہے۔

اب ڈاکٹر سلیم اختر کے پسندیدہ موضوع کی طرف لوٹیں۔ یعنی کہانیوں میں نفسیاتی رنگ و آہنگ کا پایا جانا۔ وہ لکھتے ہیں:

"نفسیاتی افسانہ نگار کو کردار کے مطالعہ اور نفسی جزئیات نگاری کے ضمن میں بہت محتاط رہنا چاہئے۔ اگر افسانہ کو شعوری کاوش اور غیر ضروری طور سے نفسیاتی بنا دیا جائے تو افسانہ افسانہ نہ رہے گا۔ بلکہ کیس ہسٹری میں تبدیل ہو جائیگا شاید اسی لئے نفسیات کی کتابوں میں درج 'کیس ہسٹریز' میں انداز نگارش کے ادبی حسن سے قطع نظر بھی لطافت افسانویت پائی جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اچھے افسانے محض نفسی جزئیات نگاری کے فقدان کے باعث کامیاب نفسیاتی افسانے نہ بن سکے۔

افسانہ میں نفسی محرکات کا تجزیہ عموماً دو طرح سے ہو سکتا ہے ایک تو سماجی سطح پر فرد کا فرد اور فرد کا معاشرے سے تعلق ہوتا ہے۔ اور یوں باہمی اثر پذیری اور عمل رد عمل کی بنا پر مختلف حالات اور واقعات سائیکی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے رہتے ہیں اور وہ اپنے اصل روپ میں سامنے آتا ہے یوں فرد کے تجزیے کے ساتھ ساتھ معاشرے کا بھی نفسی مطالعہ ہوتا رہتا ہے۔ منٹو کے بیشتر افسانے اور عصمت کے ابتدائی دور کے بعض افسانے اس انداز کی کامیاب ترین مثالیں ہیں۔

اورنگ زیب قاسمی

دوسرا طریقہ محض فرد کی ذات تک محدود ہے۔ افسانہ نگار ذہنی الجھنوں نفسی کجرویوں اور بحرانات سے جنم لینے والی کرداری پیچیدگیوں اور ان سے وابستہ علامات یعنی اساس پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔" ۱؎

یوں تو ڈاکٹر سلیم اختر نے افسانہ سے متعلق تمام بحثوں کو اس کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بعض مقالات انتہائی مفید اور کار آمد ہیں ان میں کچھ کا اوپر ذکر آچکا ہے اور جس میں "ناول" "ناولٹ" اور طویل مختصر افسانہ بھی شامل ہے۔ اس مطالعہ میں تینوں اصناف کے فرق کو واضح طور پر دکھایا گیا ہے۔ پچھلے باب میں انہوں نے حقیقت نگاری اور واقعیت نگاری، علامت اور تجرید کے فرق کو نہایت عام فہم اور دلچسپ انداز میں بتایا ہے۔

"افسانہ اور ناول میں امتیاز دشوار نہیں اور قارئین کی اکثریت تکنیکی مباحث سے عدم واقفیت کے باوجود بھی ان دونوں کو اختصار اور طوالت کی بنا پر امتیاز کر سکتی ہے۔ لیکن ناولٹ کو محض اختصار ہی نہیں سمجھا جا سکتا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ افسانوی اصناف برتن نہیں کہ چھوٹے اور بڑے برتنوں کے الگ الگ نام دیکر ان کا مصرف متعین کیا جائے بلکہ غور کرنے پر دیگ اور دیگچی کا حجم بے معنی ثابت ہوگا کیوں کہ ان کی شناخت مصرف کی مرہون منت ہے نہ کہ صرف ساخت کا۔ افسانوی تخلیق خیالات و واقعات کی کھچڑی ہی لیکن یہ دیگچی میں پکنے والی کھچڑی نہیں ۔۔۔۔۔۔ گرامر کی رو سے ناولٹ ناول کی کی تصغیر ہی لیکن اسے مرد کی مشابہت پر بچہ نہیں سمجھا جا سکتا اس سے کم از کم یہ تو واضح ہو ہی جاتا ہے کہ نہ تو ناول کی طوالت عیب ہے اور نہ ہی ناولٹ کا اختصار موقع بے موقع کام لائی جانے والی سونٹھ کی گانٹھ۔" ۲؎

مختصر افسانہ اور ناولٹ کے عناصر ترکیبی ایک جیسے ہی ہیں۔ لیکن پھر بھی دونوں میں تاثر کے اساسی فرق پیدا ہوتا ہے۔ مختصر افسانہ کے لئے (تجریدی افسانہ کو چھوڑ کر) وحدت تاثر ضروری ہے۔ مختصر افسانہ میں پلاٹ، کرداروں اور مکالموں وغیرہ سے وحدت تاثر جنم نہیں لیتی۔ بلکہ وحدت تاثر ان سب کو مخصوص صورت عطا کرتی ہے اس لحاظ سے مختصر مختصر افسانہ سے لیکر طویل مختصر افسانہ تک افسانوں

۱؎ افسانہ حقیقت سے علامت تک ص ۱۲۷

۲؎ 〃 〃 〃 ص ۱۱۲ از ڈاکٹر سلیم اختر

کے تمام انداز وحدت تاثر کی خصوصیت کے حامل ملتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں تو یہ ایک فنی خامی سمجھنی چاہیئے۔

ہاں ! یہ اور بات ہوگی کہ افسانہ نگار کا مقصد ہی انتشار تاثر ہو یا ایک موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے وہ مختلف النوع تاثرات کے ابلاغ ہی کو اپنا مقصود قرار دے لے۔ اس کے برعکس ناول کے لئے وحدت تاثر ضروری نہیں۔ اس میں دو پلاٹوں سے دو طرح کے تاثرات پیش کئے جا سکتے ہیں (شکست۔ کرشن چندر)، مقصدیت کے تحت خشک بنایا جا سکتا ہے (نذیر احمد کے ناول) ایک کردار سے معاشرہ کی تصویر کشی کی جا سکتی ہے (رسوا ـــ امراؤ جان) ناول میں مختلف تصویر (سرشار ـــ فسانۂ آزاد) تاریخی اور مذہبی حالات پیش کرنا (صادق حسین سردھنوی، نسیم حجازی، اور عبدالحلیم شرر کے ناول) صدیوں کا تسلسل ناولوں میں پایا جانا (قرۃ العین حیدر ـــ آگ کا دریا) ایک سے زیادہ سسپنس (SUSPENCE) عبدالحلیم شرر کے ناول گویا یہ بات واضح ہوگئی کہ وحدت تاثر کا معیار صرف کہانیوں (افسانوں) میں تلاش کیا جائے۔ ناولوں اور ناولٹ میں نہیں۔ ☆

اورنگ زیب قاسمی

پانچواں باب

سلیم اختر کا نقطۂ نظر

(الف) ادب اور کلچر
(ب) عورت اور مرد کے رشتے
(ج) دیگر موضوعات

ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ تازہ ترین تصنیف ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر سلیم اختر صاحب کے طبع زاد علمی مقالے شامل ہیں۔ سلیم اختر ایک کثیر المطالعہ ادیب اور نقاد ہیں اور ادب کے مختلف کوچوں کی سیر کر چکے ہیں ادب اور کلچر کے موضوعات بھی مختلف النوع ہیں۔ انہوں نے قارئین کی آسانی کی خاطر چند عنوانات یا ابواب قائم کئے ہیں۔ مثلاً ادب، شخصیات، تخلیقی رویے، مباحث، کلچر۔

(الف) ادب کے زیر عنوان، مندرجہ ذیل مقالے شامل ہیں :

مسدس حالی (عوامل، مقاصد، نتائج)

اردو میں نوکلاسیکل تنقید کا احیا

انارکلی ـــ ایک جائزہ

بچے ادب اور بڑے

قومی ادب

جنگ اور ادب

(ب) شخصیات کے تحت مندرجہ ذیل مقالے شامل ہیں :

معتدل گرمیٔ گفتار کا غزل گو ـــ فیض

اردو ادب کا جوگی ـــ ابن انشاء

"حیات جاوید" کا تنقیدی مطالعہ

کیا اکبر الٰہ آبادی لفظ فروش ہے ؟

نثار عارفی خطوط کے آئینہ میں

(ج) تخلیقی رویے کے تحت حسب ذیل مضامین درج ہیں :

غزل اور رومانی طرزِ احساس

سفرنامہ اور مسافر ادیب

موضوع اور تخلیقی رویے

نثری نظم کیوں ؟

ناول کیوں نہیں ؟

(د) مباحث کے ضمن میں شامل مقالے :

ترقی پسندی کیا نہیں ہے ؟

جدیدیت ایک مطالعہ

لفظ کا سومنات

عصری تقاضے اور ادیب

(ہ) کلچر میں حسب ذیل موضوعات ہیں :

پاکستانی کلچر کا مسئلہ

کلچر کی لہریں

قوم زبان اور کلچر

ڈگڈگی اور چنگیز

یہاں ان مختلف العنوان مقالات کا مختصر مطالعہ پیش کیا جاتا ہے ۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں :

"سیاسی انتشار، لاقانونیت، عدم مرکزیت بلکہ معاشی بدحالی سے قوموں کی نفسیات پر مخصوص نوعیت کے اثرات ہوا کرتے ہیں ان کی بنا پر فرد میں عدم تحفظ کا جو احساس جنم لیتا ہے، وہ ہلکے اثر والے زہر کی مانند قوم کی رگ و پے میں غیر محسوس طور پر سرایت کرتا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں قومی سطح پر جو عوارض ظہور پذیر ہوتے ہیں انہیں مسدود بینی (INTRO-VERSION) اور اپنی ذات میں سکڑنا اور سمٹنا یعنی

اورنگ زیب قاسمی

نفسی مراجعت (REGRESSION) جیسی اصطلاحات سے واضح کیا جا سکتا ہے دروں بینی اور نفسی مراجعت کا مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم میں اگر ایک طرف زندگی اور اس کے تقاضوں سے فرار کا رجحان قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے تو دوسری طرف مکمل فرار نہ ہونے کی بنا پر پژمردگی، مایوسی، قنوطیت اور یاس پسندی جنم لیتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس فرار کی تکمیل کے لئے نشاط کوشی کا سستا فلسفہ جنم لے لیتا ہے لیکن اس کی اساس کیونکہ لذتیت پر استوار ہوتی ہے اس لئے یہ بھی بالآخر سراب ہی ثابت ہوتا ہے۔"[1]

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس مضمون میں عربی فارسی شاعری کے حوالوں سے حالی کی شاعری خاص طور سے "مسدس حالی" کو جانچنے کی کوشش کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ :

"مسدس کی تشریح و توضیح کے ضمن میں خاصا لکھا گیا ہے لیکن اب تک کسی نے اس نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ نہیں کیا کہ حالی نے بعض امور میں اقبال کو ANTICIPATE کیا ہے جبکہ میں یہ نہیں کہتا کہ حالی کے احترام کے باوجود اقبال ان سے بطور خاص متاثر تھے یا ان کے مقلد تھے اسی لئے میں نے لفظ ANTICIPATION استعمال کیا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ بعض امور میں دونوں کی سوچ کا رخ ایک ہی سمت میں تھا دونوں کو اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کا شدید احساس تھا، دونوں قوم کی حالت پر ماتم کناں رہے۔ دونوں نے مسلمانوں کی بہبود کے خواب دیکھے۔ ۔ ۔ ۔ حالی کے مقابلے میں اقبال کی وژن (VISION) بہت وسیع تھی بالخصوص اور پھر اپنے قاری سے ایک سوال کا جواب چاہتے ہیں وہ کیا اقبال کی صورت میں حالی کے مسدس مدوجزر اسلام کی تکمیل نہیں ہو جاتی ؟"[2]

"اردو میں نوکلاسیکی تنقید کا احیاء" میں ڈاکٹر سلیم اختر نے مشہور ادیب عابد علی عابد کے فن اور شخصیت کا ایک عمومی جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"اس ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ وہ کسی ایک صنف ادب کی زلف گرہ گیر ہی کے اسیر نہ رہے بلکہ ان کی تنوع پسند طبیعت، تخلیقی اپج اور خلاقانہ ذہانت نے ادب کی ہر صنف میں دائمی اہمیت کے نقوش چھوڑے ایسے نقوش جو ادبی تاریخ میں

---

[1] + [2] مسدس حالی از سلیم اختر مشمولہ ادب اور کلچر مکتبہ عالیہ لاہور ص ۹۰ ، ۹۵

روشن مینار اور آنے والوں کے لئے چراغِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ عابد علی عابد نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش فکر شاعر، ناول نگار، افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار بھی تھے اور ان پر مستزاد ان کے کامیاب تراجم۔ ایک سے زائد اصناف میں جوہر دکھانے والوں کے بارے میں بالعموم ایک نزاعی سوال پیدا ہوا کرتا ہے کہ کس صنف کی تخلیق کو بقیہ پر فوقیت دی جا سکتی ہے؟ اور یہی بحث تخلیق کار عابد اور ناقد عابد کے بارے میں بھی چھڑ سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ عابد کی شاعری دیگر تخلیقی کاوشوں پر بھاری ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر پلڑے میں اُن کی جملہ تصانیف ڈال دی جائیں تو تنقید کا پلڑا بھاری رہے گا اور تنقید میں بھی "اصول انتقاد ادبیات" اور "شعر اقبال" باقی تنقیدی کتب کے مقابلے میں بہت بلند ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اردو تنقید میں بھی اب ان کی اہمیت مسلّم ہے" [1]

"انار کلی" اردو کا ایک نیم تاریخی اور نیم رومانی ڈرامہ ہے جسے امتیاز علی تاج نے لکھا ہے اور یہ ڈراما اتنا مقبول ہوا کہ اسے سینکڑوں بار اسٹیج کیا گیا اور بارہا اس پر ادبی بحثیں چھڑیں۔ ہندو پاک دونوں جگہوں پر اردو ادب کے عالموں نے اس پر خیال آرائی کی ہے۔ سلیم اختر صاحب اس ڈرامہ کو اسٹیج کیے جانے کے قابل نہیں سمجھتے ہیں، اس لئے انہوں نے اس کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ یاد دلانے کی کوشش کی ہے کہ اس ڈراما کی تاریخی اہمیت مشتبہ ہے۔ اس کے باوجود موصوف "انار کلی" کو ایک عمدہ ڈرامہ تسلیم کرتے ہیں۔

بچے قوم کے معمار ہوتے ہیں، اس کا مطلب ہوا کہ بچوں کی ذہنی سطح کو اوپر اٹھانے کے لئے بچوں کے ادب کو بہتر طور پر پیش کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے لئے وہ ضروری نہیں سمجھتے کہ بچوں کے ادب کی تخلیق میں بالکل بچہ بن جانا چاہئے۔ تخلیق ادب ایسا فعل ہے۔ جسے محض بالغانہ یا بچکانہ ایسے الفاظ سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ "جنگ اور ادب" سلیم اختر کا ایک دلچسپ موضوع ہے وہ لکھتے ہیں:

"جنگ ہتھیاروں کی ہو یا اعصاب کی، سرد ہو یا جوہری، علاقائی ہو یا عالمی، اس میں ایک خصوصیت ہمیشہ مشترک رہی ہے کہ عوام کا بالعموم اس سے بلاواسطہ تعلق نہیں ہوتا۔ جتنا کہ برسر اقتدار فرد یا افراد کی انا، ہوس یا بوالعجبیوں کا ہوتا ہے۔۔

۔۔۔۔ آج کی دنیا کو دیکھیں تو ایک طرف سائنس ہمیں اس مقام پر لے آئی کہ

---

[1] اردو میں نو کلاسیکی تنقید کا احیا، مشمولہ ادب اور کلچر از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۳۰

اورنگ زیب قاسمی

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

لیکن دوسری طرف انسان آج بھی اتنا ہی ناآسودہ، دکھی اور پریشان ہے جتنا کہ اس کے قدیم آباؤ اجداد۔ اس پر مستزاد سرد جنگ کا اعصابی تناؤ، نفرت کی مہم اور خوفزدہ کرنے کے لئے میزائیلوں کی تصویریں۔" [1]

سلیم اختر صاحب کا خیال ہے کہ قیام امن کے لئے ادیبوں کا بھی بہت بڑا رول ہوتا ہے اور وہ اپنے قلم کے ذریعہ حالات کا رُخ بدل سکتا ہے اور قیام امن کے مطالبے کو زیادہ مستحکم اور پائیدار بنا سکتا ہے۔

"معتدل گرمیٔ گفتار کا غزل گو ـــــ فیض" سلیم اختر صاحب کی فیض کی شاعری پر ایک نظر ہے۔

"حالی کے بعد سے عاشقانہ روش کے ساتھ ساتھ اردو غزل ایک نئے راستے کی طرف گامزن نظر آتی ہے۔ ایک راستہ اقبال کا تھا جس پر وہ یقیناً گامزن نظر آتا ہے تو دوسرا ترقی پسند ادب کی تحریک کا۔ اساسی لحاظ سے دونوں میں فرق نہ تھا کہ دونوں صورتوں میں غزل مقصد خاص کے ابلاغ کا وسیلہ بنتی ہے۔ گو نقطہ نظر کے فرق سے بعض اوقات اقبال کی غزل اور ترقی پسندانہ غزل جداگانہ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ فروعی ہے اصل بات یہ ہے کہ دونوں کے ہاں غزل پرانی کینچلی اتار کر بے معنی عشق کی گراں خوابی سے بیدار ہوتی نظر آتی ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں یہ وہ تناظر ہے جس میں فیض کی غزل کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ فیض نے زمانہ طالب علمی ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔" [2]

فیض کے مطالعہ کے بعد اُن کی غزلوں سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

"فیض کی غزل کی اساسی صفت اُن کا انقلابی نعرہ نہیں بلکہ وہ شاعرانہ لہجہ ہے جس سے وہ انقلابی نعرہ کو کیموفلاج کرتے ہیں اور تغزل کا وہ آہنگ ہے جس سے وہ تلخ حقائق کی "کرختگی" کو ملائم کرتے ہیں۔ عشق کی طرح انقلاب بھی ایک بخار بلکہ بعض صورتوں میں تو ایک ایسا متعدی بخار ہوتا ہے کہ یہ اظہار نہ پائے تو فرد اندر

---

[1] جنگ اور ادب مشمولہ ادب اور کلچر از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۷۹

[2] معتدل گرمیٔ گفتار کا غزل گو ـــ فیض مشمولہ ادب اور کلچر از سلیم اختر ص ۸۶-۸۵

ہی اندر سلگتا ہے لیکن اظہار پانے پر، ہر نوع کے پیرایۂ اظہار اپنانے پر بھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ یہ احساس زیادہ شدید ہو تو اعصاب کے جنون پر منتج ہوتا ہے۔ اسی سے عام صلاحیتوں اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں والے فن کار میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ عام شاعر جذبے کے اس سیلاب میں بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔ اعلیٰ شاعر اپنے تخلیقی شعور سے اس بپھرے جذبے کو گویا پابہ زنجیر کر دیتا ہے۔ اسے یوں سمجھئے گویا بند باندھ کر وافر پانی کا ذخیرہ کر لیا اور پھر حسب منشا اس سے کام لیتے رہے۔ اس کے نتیجے میں اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل فن کار میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی اور اس کے ہنگاموں سے منقطع بھی نہیں ہوتا لیکن یہ اس کی تخلیقی شخصیت کا اعجاز ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے بھنور میں ہونے کے باوجود بھی "طوفان کی آنکھ" کی مانند اپنے گرد سکون کا ایک دائرہ بنائے رکھتا ہے۔ سکون کا یہ دائرہ اس کے فن سے تشکیل پاتا ہے اور اس کے نتیجے میں مصافِ زیست میں شامل ہونے کے ساتھ وہ خود کو اس پیکار سے بلند تر محسوس کرتے ہوئے جس تجربے سے خود گزر رہا ہوتا ہے اپنی بلند سطح سے "دوسرے آدمی" کی طرح اسی کا ادراک اور پھر تجزیہ بھی کرتا جاتا ہے۔ فیض کی غزل میں یہی خوبی نظر آتی ہے اور طوفان بداماں ہونے کے باوجود بھی ان میں "طوفان کی آنکھ" ایسا سکون پایا جاتا ہے"۔ [1]

"اردو ادب کا جوگی ــــ ابن انشاء" یوگ کو ابن انشاء کی شعری تخلیقات کا بنیادی پتھر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہی اس کا بنیادی رنگ اور پوری شعری کائنات ہے۔ ابن انشاء نے عام لوگوں کی طرح زندگی بسر کی لیکن صحیح معنوں میں وہ اندر والا جوگی تھا باہر والا نہیں بقول خود:

سیدھے من کو آن دبوچیں: میٹھی باتیں سندر بول
میر، نظیر، کبیر، اور انشا سارا ایک گھرانا ہو

سلیم اختر نے اپنے پڑھنے والوں سے سوال کیا ہے کہ "کیا ابن انشا نے انسانوں کے جنگل، شور کے جنگل، اور کھوکھلے پن کے جنگل میں اپنا من شانت کیا؟" اور اس کا جواب بھی سلیم اختر خود دیتے

---

[1] معتدل گرمی گفتار کا غزل گو فیض مشمولہ ادب اور کلچر از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۹۳

اورنگ زیب قاسمی

ہیں۔ "میرے خیال میں نہیں" اس لئے کہ ہر رنگ پر دنیا کے دھوکے اور ریا کا احساس کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ شاید اسی لئے اس نے ایسے خیالات کا اظہار کیا "اے جوگی اے درویش، کیوں عمر گنوائے رہتا ہے کہ دنیا میں دل نہ لگانا" ابن انشاء کی طرح کے لوگ بڑے واسطہ رکھتے تھے۔ شاعر، مترجم، مزاح نگار، سفرنامہ نگار، کالم نگار اور اس پر مستزاد یہ کہ اچھا انسان "ابن انشاء نے بڑی ریاضت کے بعد شعر و ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔

"حیات جاوید، کا تنقیدی مطالعہ" میں سلیم اختر نے مولانا الطاف حسین حالی کی تالیف "حیات جاوید" کا ایک تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ "حیات جاوید" سر سید احمد خاں کی سوانح عمری ہے جسے حالی نے لکھا ہے۔ سلیم اختر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

"حالی الفاظ سے پردہ پوشی تو بہت کرتے ہیں۔ لیکن یہ پردہ بہت مہین ثابت ہوتا ہے۔ خود حالی کے ذہن میں سر سید کے ان افعال کے بارے میں کشمکش ہوگی (واضح رہے کہ نظریاتی مخالفت کے باوجود حالی نے ترکِ وضعداری نہ کی) اس سے ان کا انداز جوش سے عاری اور معذرتی ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں ہیرو اور گریٹ مین تو سمجھتے ہیں لیکن اپنے دیوتا کو آفاقی رنگوں میں چمکتے دیکھ کر جہاں خوش ہوتے ہیں وہاں مٹی کے پاؤں دیکھ کر گھبرا بھی جاتے ہیں اس سے معذرت خواہی پر اتر آتے ہیں۔ اس انداز کو مزید تقویت اس امر سے پہنچتی ہے کہ سر سید کی ملکی خدمات اور ان کے نتائج پر تفصیلی بحث میں بھی انداز سر سید کو ابھارنے کا ہے۔ چنانچہ "کام سیکھنے کا شوق" "حسن خدمت" "آزادی، بے تعصبی اور انصاف" "وفاداری (گورنمنٹ کی)" ایسے عنوانات تلے ان کی خدمات گنوائی گئی ہیں "سر سید کی کامیابی اور اس کے اسباب" والے باب کا بھی یہی حال ہے۔

الغرض بحیثیت مجموعی یہ سر سید کا کامیاب "دفاع" ہے"۔ [1]

"کیا اکبر الہ آبادی فرسودہ ہے؟" کے تحت ڈاکٹر سلیم اختر نے آج کے تناظر میں اُن کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ:

"آج زمانے نے جو رنگ اختیار کیا اور ہم عصر زندگی نے جو روپ دھارا ہے۔ اس کے تناظر میں اکبر کی شاعری کا مطالعہ کریں تو انجن، ڈبل روٹی اور نل کے پانی

---

[1] حیات جاوید کا تنقیدی مطالعہ مشمولہ ادب اور کلچر از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۱۶

ایسے اشعار پڑھ کر طنز کے کھوکھلے پن پر ہنسی آتی ہے — اکبر، سرسید تحریک کے خلاف ردِ عمل کی علامت تو ہیں۔ لیکن زیادہ دور تک دیکھنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ اسی لئے زندہ علامت نہ بن سکے۔ آج اکبر کے اشعار (افکار؟) کی تاریخی اہمیت تو ہو سکتی ہے مگر عصری نہیں! اس لئے اگر آغاز کے سوال کو دہرایا جائے کہ کیا واقعی اکبر الٰہ آبادی ضروری تھا تو اس کا جواب غیر مشروط "ہاں" میں نہ دیا جاسکے گا۔" ۱

"شاد عارفی خطوط کے آئینہ میں" میں ڈاکٹر سلیم اختر نے شاد عارفی کی شخصیت کا جائزہ نفسیات کی روشنی میں لیا ہے۔ اور ان کی شاعری کو پرکھنے کے لئے ان کے اندرون میں بھی جھانکنے کی کوشش کی ہے بہت کم ایسے شعراء ہوں گے۔ جنہوں نے شاد کی انتہا تک پہنچتے ہوئے کلام کو سوانح بنا دیا ہو۔ شاید اسی لئے ان کے خیالات تحریروں اور کلام میں تضاد تو بہت بڑی بات ہے۔ معمولی سا بُعد بھی نہیں ملتا۔ الغرض طنز و مزاح کے دو کناروں کے درمیان شاد عارفی کی شخصیت کسی طوفانی ندی کی طرح ہے۔ راہ کے سنگریزوں اور پتھروں کو ہٹاتی بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکراتی، کف اڑاتی اور موجیں مارتی رواں دواں ملتی ہے۔

"غزل اور رومانی طرزِ احساس" میں وہ غزل میں رومانیت کے حامی ہیں اور فرماتے ہیں:

"آج فضا میں وہ تناؤ اور عصر میں وہ گھٹن موجود ہے جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ادب میں گھٹن کے خاتمہ کے لئے رومانی طرزِ احساس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اسی سے شاعر میں معلوم سے نامعلوم کی طرف جست لگانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے۔ ہم نگاہیں اٹھائے آسمان کو تک رہے ہیں مگر باہر سے کچھ نہ ملے گا۔ اس کے لئے تو خود ہمیں اپنے اندر جھانکنا ہوگا۔" ۲

سلیم اختر نے اس موضوع کا جائزہ خوبصورت انداز میں لیا ہے۔

"سفرنامہ اور مسافر ادب" میں سلیم اختر نے کہا ہے کہ جب فلموں، ٹی وی، باتصویر رسالوں اور ڈاکومنٹری کے ذریعہ دوسرے ممالک کے بارے میں حصولِ معلومات اس قدر آسان ہے تو پھر سفرنامے لکھنے کا اور پڑھنے کا کیا جواز؟ اور اس کا جواب وہ مضمون کے آخر میں فراہم کرتے ہیں کہ سفر کے تجربے نے تخلیق کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے اور اس سے سیاحت نامے یا سفرنامے کو ایک نئی جہت ملی ہے۔ یہ جہت تخلیق بھی ہے اور تخلیق اور تج کی حامل بھی! آج کے قاری کی سیاحت نامے میں دلچسپی بھی اسی تخلیقی صلاحیت

---

۱ کیا اکبر الٰہ آبادی ضروری ہے؟ مشمولہ ادب اور کلچر از سلیم اختر ص ۱۳۱

۲ غزل اور رومانی طرزِ احساس، مشمولہ ادب اور کلچر از سلیم اختر ص ۱۵۶

اورنگ زیب قاسمی

کی بنا پر ہے۔ ڈاکومنٹری فلم خوش رنگ مناظر تو دکھا سکتی ہے۔ مگر افراد کو زندہ روپ میں پیش نہیں کر سکتی جب کہ سیاحت نامہ اسی بنا پر بازی لے جاتا ہے کہ وہ چند افراد اور واقعات کی امداد سے اس علاقہ کو زندہ کرتا ہے۔ اب اس مقصد کے لئے کون کیا انداز اپناتا ہے۔ تو انداز کے اسی تنوع میں سیاحت ناموں کے تنوع کا جواز اور قارئین کی دلچسپی کا راز مضمر ہے۔

"نثری نظم کیوں؟" کے اندر بھی سلیم اختر نے خیال ظاہر کیا ہے

"نثری نظم بھی اجتماعی شعور سے منقطع ہونے کی غماز ہے۔ اس کا شاعر ان سماجی ذمہ داریوں سے اجتناب برتتا ہے جن کے تقاضے اسے ایسی فریکوئنسی استعمال کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ تخلیق قاری کے ذہن میں وصول ہو سکے۔

خود اس اصطلاح میں اجتماعِ ضدین اس امر کا غماز ہے کہ شاعر نے شعوری طور سے اس تضاد کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ دوسروں کو بھی اسے تسلیم کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔" ۱

ڈاکٹر وہاب اشرفی نثری نظم کو باقاعدہ ایک شعری صنف تسلیم کرتے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ نثری نظم شاعری کی ایک باضابطہ صنف ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے نام سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نثر کے قبیل کی کوئی چیز ہے۔ پھر بھی چونکہ پروز پوئم کا لغوی ترجمہ ہے۔ اس لئے اسے اپنائے رکھنے میں کوئی نقصان نہیں۔ ہمارے ہاں نثر و نظم کی کئی مغربی صنفیں نام کی حد تک یا تو ترجمہ کر لی گئی ہیں یا ان کے اصل نام اپنائے گئے ہیں، نثر لطیف، وغیرہ نام تو اور بھی الجھن پیدا کریں گے۔" ۲

ڈاکٹر سلیم اختر ناول اور اس کے فن سے خاصے مایوس نظر آتے ہیں اور "ناول کیوں نہیں؟" میں انہیں شبہات کا اظہار کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ناول پریم چند یا ایسے ہی کسی ادیب سے شروع ہوتا تو آج اس کا ماضی ویران، حال تباہ اور مستقبل تاریک نظر نہ آتا۔

"ترقی پسندی کیا نہیں ہے" میں لکھتے ہیں:

"آج ادبی منظرنامہ کا جائزہ لینے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اس وقت

---

۱ نثری نظم کیوں؟ مشمولہ ادب اور کلچر از سلیم اختر ص ۷۲

۲ نثری نظم کیوں؟ مشمولہ معنی کی تلاش از ڈاکٹر وہاب اشرفی مطبوعہ تعلیمی مرکز پٹنہ ۱۹۷۰ء ص ۴۷

یہاں کوئی بھی ادبی تحریک موجود نہیں، ادب برائے ادب، ادب برائے اسلام، پاکستانی ادب، علامت نگاری، تجریدیت وغیرہ نے نعروں کی صورت اختیار کی، لیکن کچھ دیر کے لئے ....
ترقی پسندی کو ایک تحریک کے روپ میں نہیں بلکہ ایک زاویۂ نگاہ کی صورت میں زندہ رکھنا ہوگا۔ مخالفوں کے گزشتہ بیس برس بھی اسی وجہ سے گزر گئے تھے کہ جن لوگوں نے اسے سوچ کا ایک زاویہ سمجھا، انہوں نے بدلے حالات کے باوجود بھی اس زاویہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ کی وہ لوگ اب بھی موجود ہیں اور پہلے کی طرح اب بھی نئے اذہان کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" [1]

دراصل یہ مضمون "ترقی پسندی" کی حمایت میں ایک اچھی دستاویز ہے اور بعض بعض جگہ انہوں نے ترقی پسندی کی وضاحت بھی کی ہے۔

"ترقی پسندوں پر اب تک ایک الزام یہ بھی لگتا رہا ہے کہ انہوں نے اسلوب کو مواد پر ترجیح نہ دی اور لفظ کی اہمیت کو نہ جانا! تحریک کے ابتدائی ایام میں انتہا پسندی، غلو اور مخالفوں کے جواب میں جارحیت کی بنا پر تو ایسا ہوا ہے۔ لیکن بعد ازاں سبھی تخلیقی فن کاروں نے مواد کے ساتھ ساتھ اسلوب کی اہمیت کو تسلیم ہی نہ کیا، بلکہ اسلوب اور تکنیک کے جو تجربات اس تحریک کے زیر اثر ہوئے وہ ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں اور ان کی اہمیت کو کسی طرح سے بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہر عصر کے اپنے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں جن کی ہمنوائی میں ادب کے موضوعات جب تبدیل ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ نیا اسلوب نئے الفاظ، نئی علامات، اور نئے استعارات بھی لاتے ہیں۔ قدیم ذہن انہیں قبول نہ کرے تو اور بات ہے۔ لیکن ان کی ضرورت ہی ان کے وجود کی ضامن ہوتی ہے۔ کچھ یہی حال عریانی، فحاشی اور جنس نگاری کے الزامات کا ہے۔ معانی کے قطعی تعین کے فقدان کی بنا پر بہ لحاظ مفہوم یہ اصطلاحات گریز پا ہیں۔ میں انہیں احتجاج کا ایک انداز اور جھنجھوڑنے کا ایک طریقہ سمجھتا ہوں۔ چند افسانوں پر مقدمات چلنے کا یہ مطلب نہیں کہ سبھی ترقی پسند عریانی پسند تھے۔ بلکہ خالص مارکسی ذہن رکھنے والوں نے تو جنس پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کو کبھی بھی پسند نہ کیا تھا۔" [2]

---

[1] ترقی پسندی کیا نہیں؟ ...... مشمولہ ادب اور کلچر از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۸۱
[2] " " " ؟ .... مشمولہ مضمون ادب اور کلچر ص ۱۸۳-۱۸۲ از سلیم اختر

اورنگ زیب قاسمی

جدیدیت پر آج کل بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ اور ہر صنف ادب کو جدیدیت کے سانچے میں ڈھالنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

"ہمارے ہاں جدیدیت کو بالعموم اظہار کی جدتوں اور تکنیک کے تجربات کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ جدیدیت کا یہ بہت سطحی سا اظہار ہے۔ جدیدیت دراصل خیالات و افکار سے عبارت ہے۔ تکنیک اور اظہار کے سانچے تو دیگر ادبیات سے مستعار لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن تصورات و تاثرات کے لئے دامن نہ پھیلانا چاہئے۔ زاویہ صرف اپنی ہی نظر کا ہونا چاہئے۔ اس کے غلط یا صحیح ہونے سے اتنا فرق نہیں پڑتا ..... جدیدیت کا اظہار جدید طرز احساس سے ہوتا ہے۔ میں جدید طرز احساس سے ادیب کا وہ ذہنی رویہ مراد لیتا ہوں جس کے باعث اس کی سوچ حال کی تحلیل ہی نہیں کرتی بلکہ مستقبل کے لئے اشاریہ بھی بنتی ہے۔ اس مقصد کے لئے حال کا درست تناظر میں تجزیاتی مطالعہ اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہی سب سے مشکل کام ثابت ہوتا ہے۔ اور ہمارے ملک میں تو ناممکنات میں سے نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ اس تجزیاتی مطالعہ کے لئے ایسی نگاہ درکار ہوتی ہے۔ جو بیک وقت محدب شیشہ اور ایکس ریز کا کام کر سکے۔ ماضی کی مردہ روایات، سوچ کے کہنہ اسالیب اور سماجی تحریمات (TABOOS) کے نام پر انحطاط پذیر اداروں کے طلسم سے آزاد ہونا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اور پھر ان پر مستزاد مذہب کی قدغن، سیاست کا جبر اور مصلحت کے سبز باغ۔ جب تک تخلیق کار اپنے تخلیقی وجدان کی رہنمائی میں ان سب سے آزاد نہیں ہو جاتا اس وقت تک نہ تو اس کا طرز احساس جدید قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کی تشریح تصورات و افکار کی جدیدیت کا منشور بن سکتے ہیں۔" [1]

سلیم اختر کا خیال ہے کہ ادیب کو ادب پیش کرنے کے لئے بہت سی چیزوں سے ہٹ کر اور بہت چیزوں سے بچ کر چلنا ہوگا۔ مصلحت، اقربا پروری وغیرہ سے نجات حاصل کرنا ہوگا۔ تب جا کر صحیح ادب اور جدید ادب پیدا کر سکتے ہیں۔

---

[1] جدیدیت ایک مطالعہ مشمولہ ادب اور کلچر از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ مکتبہ عالیہ ایبک روڈ لاہور ص ۱۸۸

"لفظ کا سومنات" میں لکھتے ہیں :

"بعض حضرات کی تحریروں سے یہ محسوس ہوتا ہے گویا انگریزی الفاظ بُت
بن چکے ہیں اور اگر یہ لات و منات نہ توڑے گئے تو ادب کا کعبہ پاک نہ رہ سکے گا۔ لیکن
صرف انگریزی الفاظ ہی کی تخصیص کیوں؟" ۱؎

گذشتہ دہائی میں الفاظ سے وابستہ تعصبات کو ختم کرنے کے رجحان نے بہت تقویت دی اور اردو میں
دوسری زبانوں کے الفاظ بھی مستعمل ہونے لگے جیسے ہندی کے الفاظ فراق گورکھپوری کی شاعری میں یہ عصری تقاضے
اور ادیب "، ادیبوں کی ذمہ داریوں کی طرف سے اشارہ کرتا ہے۔ "پاکستانی کلچر کا مسئلہ" ہنوز لاینحل ہے۔
اور اس کلچر کی تلاش جاری ہے۔ جسے پاکستانی کلچر کا نام دیا جاسکے۔ اس مجموعہ مقالات میں "پاکستانی کلچر کا مسئلہ"
"کلچر کی لہریں" اور "قوم، زبان اور کلچر" شامل ہیں ان تینوں مقالات میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ہندوستانی
کلچر کے ساتھ اس کے مسلکات اور زبان، اور قوم سے بھی بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔ "قوم، زبان اور کلچر" میں
تحریر فرماتے ہیں :

"فرد کی مانند قوم کی بھی مخصوص نفسیات ہے۔ جس سے اس کی نفسی شخصیت
کے خدوخال متعین کئے جاسکتے ہیں۔ اور فرد ہی کی مانند قوم بھی نفسی عوارض میں مبتلا ہو سکتی
ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو "ماس ہسٹریا" ایسے وقوعات اور اصطلاحات نہ ہوتیں۔ کسی مجمع یا
گروہ کے برعکس قوم کیونکہ منظم ہوتی ہے۔ اس لئے قومی نفسیات کو انبوہ کی نفسیات سے ممیز
کرنا بھی لازم ہے جس میں وقتی اشتعال اور اس کی فوری تسکین اساسی کردار ادا کرتی ہے۔۔
۔۔۔ زبان اور کلچر ترازو کے دو پلڑے ہیں جو قومی اقدار کی میزان بنتے ہیں اور وہ
پیمانے جن سے قوم منزل مراد کا سفر جاری رکھتی ہے۔۔۔۔ قوم کے لئے قومی زبان کی وہی
حیثیت ہوتی ہے جو بچہ کے لئے آغوش مادر کی۔ جس طرح شفقت اور محبت سے محروم بچے
کی شخصیت مریضانہ رجحانات کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح قومی زبان کے بغیر قوم
بھی بن ماں کا بچہ ہوتی ہے۔ وہ آسودگی کے اس گہرے احساس سے محروم رہتی ہے — جو
انفرادیت اور تشخص پر مبنی ہوتا ہے۔ قومی زبان اگر ماں ہے تو قومی کلچر میں باپ کا روپ نظر
آتا ہے" ۲؎

۱؎ لفظ کا سومنات مشمولہ ادب اور کلچر از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ مکتبہ عالیہ ایبک روڈ لاہور ص ۱۹۰
۲؎ قوم، زبان اور کلچر مشمولہ ادب اور کلچر از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ مکتبہ عالیہ ایبک روڈ لاہور ص ۲۱۵

اورنگ زیب قاسمی

"ڈگڈگی اور چنگیز" بھی قوم، زبان اور کلچر سے بحث کرتا ہے۔ لکھتے ہیں :

"غریب کی جورو والی مثال شاید پسند نہ آئے۔ البتہ بندر اور ڈگڈگی
سے بات بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ملک میں کلچر، بندر کا تماشہ بن چکا ہے۔ ذرا ڈگڈگی
بجی اور کلچر کا ناچ شروع ہوگیا۔ لطیفہ (یا المیہ) یہ ہے کہ ہاتھ بدلنے کے ساتھ ساتھ ڈگڈگی
کی تال بدلتی ہے اور اس کے ساتھ ہی قلابازی کا انداز بھی۔ جب سے پاکستان بنا ہے، اس
وقت سے لیکر اب تک ڈگڈگی کا فیصلہ تو ہوتا رہا لیکن بے چارے بندر اور اس کے حسب و نسب
کے بارے میں کچھ طے نہ ہو سکا۔ شاید یہ بات ہی غلط ہے، دراصل چیز تو تماشہ ہے نہ کہ تماشہ
کرنے والا بندر، ویسے بھی ہم لوگ طبعاً تماش بین ہیں اور سیلاب کی تباہ کاریوں سے لے کر
سیاسی تشدد تک ہر نوع کے اچھے بُرے واقعات و حوادث سے بقدر ظرف سامان تفریح بہم
پہنچاتے رہتے ہیں۔ بات بقدر ظرف کی ہوئی ہے تو یہاں ایسے ایسے باظرف حضرات بھی موجود
ہیں جو تماشے اور تماش بینی کے ضمن میں —— ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!
کے موٹو پر عمل پیرا نظر آتے ہیں" ۱؎

"حیات جاوید" سر سید احمد خاں کی سوانح عمری ہے۔ جسے مولانا الطاف حسین حالی نے
تحریر کیا ہے۔ اور جس کی تلخیص ڈاکٹر سلیم اختر نے بہت ہی موثر انداز میں پیش کی ہے۔ جس سے تشنہ
کامی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ لکھتے ہیں :

"سر سید احمد خاں اپنے تعلیمی نظریات اور مذہبی تصورات کی بنا پر
اپنی صدی کی اہم ترین اور متنازعہ فیہ شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ماضی کے ہیرو
بھی تھے اور "حیات جاوید" اس قومی ہیرو کے حالات زندگی، تحریک اور اس سے جنم
لینے والے نزاعات پر پہلی مستند مفصل اور جامع تصنیف ہے حالی کے لئے یہ محض ایک نئی
کتاب کی ترتیب و تدوین کا معاملہ نہ تھا۔ بلکہ وہ اسے ایک "قومی فرض" سمجھتے تھے۔
حالی نے "حیات جاوید" کے دیباچہ طبع اول میں لکھا تھا۔
"اگرچہ سر سید نے اپنی زندگی عام بھلائی کے کاموں میں مدت سے

۱؎ ڈگڈگی اور چنگیز مشمولہ ادب اور کلچر از سلیم اختر ص ۲۲۱

وقف کر رکھی تھی مگر ابھی تک ان کا حال پہلی رات کے چاند کا سا تھا کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہ دیکھا لیکن مدرسۃ العلوم اور تہذیب الاخلاق نے ان کی کوششوں کو چودھویں رات کے چاند کی طرح سب پر روشن کر دیا۔"

"اور 'حیات جاوید' اس چاند کی کرنوں کو دور دور تک پہنچانے کی ایک سعی قرار دی جا سکتی ہے۔

حالی نے سرسید کے علاوہ شیخ سعدی (حیات سعدی) اور اسد اللہ غالب (یادگار غالب) کی بھی سوانح حیات قلم بند کیں۔ سعدی سے ان کا تہذیبی تعلق تھا۔ اس میں روایتی انداز کار فرما ہے۔ غالب سے ذہنی تعلق تھا کہ وہ ان کے لئے بیک وقت استاد اور دوست کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ حالی نے اسے "حیوان ظریف" کا خطاب دے کر غالب کی شخصیت کی بوقلمونی کو اجاگر کرتے ہوئے خطوط اور شاعری پر مفصل تبصرہ بھی کیا۔ لیکن سرسید کا معاملہ ان دونوں سے جداگانہ تھا۔ حالی کا ان سے قلبی تعلق تھا۔ اور ان کی تحریک سے عقلی لگاؤ اور اس پر مستزاد ان کا یہ عقیدہ۔

"سرسید کی مثال ہمارے لئے ایک ایسی مثال ہے جس کی پیروی سے ممکن ہے کہ ہماری قوم کی کٹھن منزل جو تنگنائے دنیا میں ظاہرا اس کی سب سے آخری منزل ہے، آسانی کے ساتھ طے ہو جائے۔ اس بزرگ کی لائف ہم کو نصیحت کرتی ہے کہ زمانے کی مخالفت سمجھ کر اس کے ساتھ موافقت پیدا کرو، تاکہ دنیا میں آرام سے رہو اور عزت سے زندگی بسر کرو......"

سرسید نے سماجی، تعلیمی، ادبی، تمدنی اور سب سے بڑھ کر جن مذہبی نزاعات کو جنم دیا آج ایک صدی بعد بھی ان کی بازگشت کسی نہ کسی طور سے سنی جا سکتی ہے۔ حالی ان کے رفقائے کار میں سے تھے۔ یہی نہیں بلکہ سرسید سے ایسی محبت اور عقیدت رکھتے تھے کہ ان کے جذبات کو اپنے جذبات ان کے دکھ کو اپنا دکھ ان کے خوابوں کو اپنا خواب سمجھتے تھے۔ وہ سرسید کو ہم عصر ہندوستان کی سب سے اہم شخصیت بھی سمجھتے تھے۔ اسی لئے تو حالی نے حیات جاوید میں سرسید کی (ARCERTHAN LIFE) تصویر بنائی ہے۔

حالی نے سرسید کی عظمت کے سامنے بحیثیت ایک سوانح نگار اپنے عجز کا اظہار یوں کیا:

"..... جو شخص سرسید کی لائف ایک آدھ جلد میں ختم کرنی چاہتا ہے۔ اس کو کیسا مشکل کام کرنا ہے۔ اس سے بھی زیادہ سخت مشکل کام جو بائیوگرافی کے مضمون سے علاقہ رکھتا ہے یہ ہے کہ سرسید کی ذات میں اس قدر مختلف الجہتی حیثیتیں جمع تھیں کہ ہر ایک حیثیت پر اس کی شان اور اس کے درجہ کے موافق گفتگو کرنا ایک ایسا کام ہے جس کا پورا پورا حق وہی مصنف ادا کر سکتا ہے جو خود بھی سرسید کے برابر جامع حیثیات ہو، مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم، لٹریچر، پبلک سپیکنگ، انجینئرنگ، آرکیولوجی، وغیرہ۔ کس کس بات کو بیان کیا جائے؟ اور کس کس حیثیت پر گفتگو کی جائے؟ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم نے کام کی مشکلات دیکھ کر جی نہیں چھوڑا اور....... سرسید کی لائف پوری یا ادھوری جیسی کہ ہم سے بن آئی قوم کے لئے مرتب کر دی ہے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آئندہ مصنفوں کے لئے کم از کم ایک داغ بیل ضرور ڈالدی ہے جس کی حدود میں وہ ایک وسیع اور عالی شان عمارت آسانی سے تیار کر سکتے ہیں۔"

"حالی نے آخری سطریں کسر نفسی سے لکھی ہیں۔ کیونکہ "حیات جاوید" ایسی مفصل اور جامع کتاب ثابت ہوئی کہ اب تک اس پر کوئی اضافہ نہ کیا جا سکا۔ بلکہ یہ سرسید کی حیات اور تحریک کے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

'حیات جاوید' کا مطالعہ کرتے وقت یہ امر ملحوظ رہنا چاہئے کہ حالی کا مخاطب ہم عصر قارئین سے تھا۔ وہ قارئین جو سرسید کی ذات کو شک اور ان کی تحریک کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لئے ان پر سرسید کی عظمت واضح کرنے کے لئے حالی نے وافر مواد کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ہر نوع کے طرز استدلال کا بھی سہارا لیا اس لئے جب اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جلد ہی بک گیا تو حالی کو تعجب ہوا کیونکہ ان کے بقول:

"خاص کر اس کتاب کا اس قدر بک جانا توقع کے بالکل خلاف ہے"

"حیات جاوید" چونکہ ایک متنازعہ فیہ شخصیت پر تھی اس لئے نزاعات کا باعث بھی بنی اس عہد کے قارئین نے سرسید کے سابق رفیق مولانا شبلی نعمانی کی طرح... ... اپنے مخصوص تعصبات اور ذہنی ترجیحات کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا۔ یوں آرا میں افراط و تفریط پیدا ہو گئی۔ آج جبکہ سرسید سے وابستہ نزاعات کے طوفان تھم چکے ہیں اور کفر کے فتوے کی گرد کے بادل چھٹ چکے ہیں۔ "حیات جاوید" کا گرمئ جذبات سے بچ کر غیر

جانبدارانہ تنقیدی جائزہ ناممکن نہیں رہا۔ سو کتاب کے اختتام میں مضمون "سرسید احمد خاں کا کامیاب دفاع" صرف اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ "حیات جاوید" کی افہام و تفہیم میں آسانی ہو۔[1]

ڈاکٹر سلیم اختر نے کافی محنت اور تفصیل کے ساتھ مولانا الطاف حسین حالی کی تصنیف "حیات جاوید" کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سعدی یا غالب کے مقابلے میں (حالی کے الفاظ میں) سرسید کی "معزز لائف" لکھنا کہیں مشکل کام تھا۔ سعدی پر "حیات سعدی" سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا تھا اور حالی نے اس میں کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہ کی تھی۔ غالب کو حالی سے جو قربت اور تعلق تھا، اس کی بنا پر باغ و بہار شخصیت کو لطائف وغیرہ کی امداد سے اجاگر کرنا مشکل نہ تھا۔ لیکن سرسید کا معاملہ کچھ اور تھا۔ سرسید بقید حیات ہی نہ تھے (گو سرسید کی زندگی میں "حیات جاوید" پر کام ہو چکا تھا لیکن اس کی اشاعت نہ دیکھ سکے) بلکہ ان کی ہمہ گیر شخصیت نے مذہبی عقائد، تعلیمی مقاصد، تمدنی اقدار، ادبی معائر، مجلسی آداب اور تاریخی نظریات وغیرہ کے لحاظ سے ملک بھر میں افکار نو کی جو آگ روشن کی تھی اس سے جہاں قوم کے تن مردہ میں حیات بخش حرارت پیدا ہوئی وہاں اس نے متعصب اذہان کو جلایا اور کڑھایا بھی۔ اس لئے سرسید اور ان کے رفقائے کار کی مسلسل اور قلمی جہاد کے باوجود ۱۸۹۸ء تک جب کہ سوانح عمری پر کام کا آغاز کیا گیا ان کی مخالفت میں کمی نہ آئی تھی اور یقیناً "حیات جاوید" لکھتے وقت یہ تمام احوال ان کے ذہن میں ہوں گے اسی لئے تو اس طویل اور جامع سوانح عمری میں حالی نے محض حالات زندگی پر اکتفا کرتے ہوئے تمام عصری اثرات کے پس منظر میں سرسید اور ان کی تحریک کو سمجھنے ہی کی کوشش نہ کی بلکہ اس تحریک کے اسباب، علل اور نتائج سے بھی بحث کی۔

ہمارے ہاں گو ابھی بزرگوں کی خطا پکڑنے کو خطا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سرسید کے معاملے میں یہ بات نہ تھی۔ کیوں کہ ان کی معاصرانہ حیثیت انہیں ابھی تک بزرگ تو کیا مسلمان بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ جس عہد میں "اودھ پنچ" ایسے متعصب اخبار اور اکبر الہ آبادی ایسے ذہین حضرات نے مخالفت کا باقاعدہ متحدہ محاذ قائم کر رکھا تھا۔ وہاں سرسید کی حیات کو "حیات جاوید" قرار دینا بہت مشکل کام تھا۔ شاید اسی لئے جب پہلا ایڈیشن سال رواں کے اختتام سے پہلے ہی فروخت ہو گیا تو کتاب کا اس قدر مقبول ہونا حالی کی توقعات کے بالکل خلاف ثابت ہوا"۔[2]

۱؎ + ۲؎ حیات جاوید، تلخیص پروفیسر سلیم اختر، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۸ء ص ۳۔ ص ۲۰۹

اورنگ زیب قاسمی

الغرض بحیثیت مجموعی یہ سرسید کی ناکام "کریٹیکل بایوگرافی" مگر کامیاب "دفاع" ہے۔

روزانہ چوبیس (۲۴) گھنٹے کیسے زندہ رہا جائے[1]

انگریزی زبان میں، زبان و ادب سے بھی ہٹ کر بہت سارے موضوعات یا عنوانات ہیں جن پر بیشمار کتابیں دستیاب ہیں۔ اس سلسلے میں ڈیل کارنیگی، آرنلڈ بینیٹ وغیرہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ان لوگوں کی کتابوں اور مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔ مجھے کی اہمیت، پریشان ہونا چھوڑیئے، گفتگو اور تقریر کا فن، مائیں نہ بنیں، وغیرہ۔ گویا زندگی گزارنے کے فن سے متعلق بہت ساری مطبوعات موجود ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی ترجمے کے ذریعہ مستند ادیبوں کی کتابوں کو اردو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

"روزانہ چوبیس گھنٹے کیسے زندہ رہا جائے" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

آرنلڈ بینیٹ نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

"زیادہ سونے والوں کی اکثریت احمق ہے۔ اگر زیادہ سونے کی عادت کو ترک کر دیا جائے تو دس میں سے نو افراد زیادہ صحت مند، پر لطف، خوشگوار و ہنستی مسکراتی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔"[1]

سلیم اختر صاحب نے اس کتاب کے سلسلے میں لکھا ہے:

"آرنلڈ بینیٹ کا انگریزی کے صاحب طرز ادیبوں میں شمار ہوتا ہے اس کی یہ مختصر سی کتاب انگریزی ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ یورپ و امریکہ میں زندگی آموز اور زندگی آمیز کتابوں کا جو سلسلہ ہے اس کتاب کو ان میں نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل ہے۔ شاید اسی لئے ڈیل کارنیگی نے آرنلڈ بینیٹ کو اپنا استاد مانا تھا۔

ترجمہ اور وہ بھی کسی مخصوص اسلوب والی کتاب کا ترجمہ آسان نہیں ہوتا اس کے لئے پابند اور لفظی ترجمہ کے بجائے آزاد ترجمے سے کام لیتے ہوئے اسے ماحول کے مطابق اپنا کر اصل متن میں بعض ضروری تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں وہ اس لئے کہ ایسی کتابوں کا آدھا اثر تو محض ماحول اور فضا کی اجنبیت سے ہی ضائع ہو جاتا ہے۔ اور تمام تبصرہ نگاروں نے بھی میرے انداز نظر کی

۱؎ "روزانہ چوبیس گھنٹے کیسے زندہ رہا جائے" مصنف آرنلڈ بینیٹ مترجم سلیم اختر مطبوعہ میری لائبریری لاہور ص ۱۸

توثیق کرتے ہوئے ترجمہ کو سراہا۔

یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی اور قلیل عرصہ میں پہلا ایڈیشن نکل گیا۔ [1]

ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی اس کتاب کے حوالہ سے چند اچھی باتیں اپنے پڑھنے والوں کو دی ہیں۔

"یہ کتاب کیونکہ مغربی ماحول سے تعلق رکھتی ہے اس لئے ترجمہ کرتے وقت اصول اور واقعات کو اپنے ماحول سے بدلنا پڑا اور یہ ناگزیر بھی تھا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اصل کتاب کی روح میں کوئی فرق نہیں پڑا۔"

دوسری چیز یہ کہ یہ کتاب آرنلڈ بینٹ نے مغربی ماحول کے لئے لکھی تھی۔ اس لئے اس نے وہاں کے دفتری اوقات کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کا وقت لیا تھا۔ وہاں سارا سال ایک ہی وقت رہتا ہے مگر ہمارے ہاں صورت حال مختلف ہے۔ یہاں سردیوں گرمیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ نظام اوقات مقرر ہیں۔ موسم سرما کے لئے تو آپکو اپنے لائحہ عمل مرتب کرتے وقت اتنی دقت نہ ہوگی۔ اور آپ تقریباً بینٹ کے وضع کردہ خطوط پر چل سکتے ہیں۔

آپ کا دفتر ساڑھے سات سے ڈیڑھ بجے تک ہوتا ہے۔ بظاہر تو آپکے پاس کافی سے زیادہ وقت نظر آتا ہے۔ مگر بات وہی بینٹ والی ہے ـــــ کہ یہ کافی سے زیادہ وقت بھی چوبیس گھنٹوں اور سردیوں کا بظاہر تنگ اور "سکڑا" ہوا وقت بھی چوبیس گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس لئے آپ نے کچھ کرنا ہے تو وہ بھی اسی وقت میں ہوگا اور اگر اسے ضائع کرنا ہے تو وہ بھی اسی وقت میں ہوگا۔

آپ رات کو سیکنڈ شو دیکھنے گئے تھے۔ اس لئے آپ صبح افراتفری میں اٹھتے ہیں اور بھاگم بھاگ دفتر پہنچتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کاروبار کرتے ہیں یا دکان کھول رکھی ہے تو پھر آپ ایسی جلدی سے کام نہیں لیتے بلکہ اطمینان سے اٹھ کر اور بڑے سکون سے غسل خانے کی طرف بڑھتے ہیں اور ناشتہ کرنے کے بعد نو اور دس کے درمیان دکان پر جلوہ افروز ہوں گے۔ ویسے بھی سیکنڈ شو دیکھے بغیر بھی لاہور کے اکثر دکاندار نو سے پہلے دکان نہیں کھولتے ہیں۔

آپ شام کی تفریح مت بند کریں۔ لیکن کم از کم تمام دوپہر خواب خرگوش میں بھی تو مت گزاریں۔ رات کو پوری نیند کے بعد تمام دوپہر سونے میں کوئی مصلحت نہیں ہے۔

---

[1] روزانہ چوبیس گھنٹے کیسے زندہ رہا جائے۔ مصنف آرنلڈ بینٹ مترجم سلیم اختر مطبوعہ میری لائبریری لاہور ص ۲۰ طبع دوم ۱۹۷۱ء

اورنگ زیب قاسمی

آپ کہتے ہیں کھانا کھاتے ہی غنودگی سی چھا جاتی ہے۔ مگر مجھے اس کا یقین نہیں ـــــ غنودگی کھانے کے باعث نہیں بلکہ زیادہ کھا جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ واقعی کھانے کے بعد غنودگی محسوس کرتے ہیں تو پھر تھوڑا سا آرام کر لیں ـــــ لیکن سونا نہیں ہے۔ آپ آنکھیں بند کرکے چت لیٹ جائیں۔ اس سے تمام جسم میں دوران خون ایک سا ہو جانے سے نہ صرف اعصاب ہی کو سکون ملے گا بلکہ تھکے ہوئے اعضاء بھی آرام پائیں گے۔ نرم بستر پر لیٹنے کی بجائے فرش پر دری بچھا کر لیٹنے سے آپ زیادہ جلد تازہ دم ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس طرح سے فرش کی سختی اور ٹھنڈک آپ کے لئے ایک قوی تنبیہ کا کام کرتے ہوئے مضمحل اعصاب کو توانائی بخشے گی۔ لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں ـــــ مگر سونے کے لئے نہیں ـــــ بلکہ جلتی دوپہر کی لُو سے جھلسے ہوئے پپوٹوں اور ان سے متعلقہ عضلات کو سکون پہنچانے کے لئے۔ پھر انہیں کھول دیں ـــــ اس کے بعد دھیرے دھیرے پتلی کو چاروں طرف گھمائیں ـــــ پھر انہیں بند کر لیں اور پھر کھولیں ـــــ یہ آنکھوں کی ورزش ہے اور دس منٹ سے بھی کم مدت میں آپ کی آنکھوں کی تھکن دور ہو جائے گی۔ اس مقصد کے لئے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے بھی بہت سودمند ثابت ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی ورزش سے ملتی جلتی "ورزش" آپ عضلات اور پٹھوں کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اعضاء کی ورزش نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو کسی قسم کی بھاگ دوڑ یا کود پھاند کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ بلکہ آپ کو ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلانے پڑیں گے۔ آپ سانس روک کر تمام جسم کو اکڑا لیں۔ اس کے بعد سانس چھوڑ کر تمام جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ کچھ دیر تک عام سانس لیتے رہیں اس کے بعد بھی اس عمل کا اعادہ کریں ـــــ آپ کو جلد ہی احساس ہو جائے گا کہ نہ تو یہ ورزش اتنی آسان ہے اور نہ ہی اسے آپ زیادہ دیر تک کر سکیں گے ـــــ اور یہ زیادہ دیر کے لئے ہے بھی نہیں۔

اگر آپ نے ایمانداری سے اس عمل کو دہرایا اور اپنایا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دوپہر کو کام نہ کر سکیں۔ آپ ڈیڑھ بجے دفتر سے نکلے تھے ـــــ راستے سفر گھر آکر غسل کھانا اور اس کے بعد آرام کے لئے آپکو دو گھنٹے دیے دیتا ہوں۔ ساڑھے تین بجے آپ اپنے ڈیڑھ گھنٹے والے کام کو شروع کر سکتے ہیں۔ پھر کیوں کہ آپ نے ہفتہ میں تین دوپہروں میں کام کرنا ہے اس لئے باقی تین دوپہروں کے تو آپ ہی مالک ہیں۔ جیسے چاہیں انہیں گزاریں۔ لیکن نیند آنے کا اعتراف مت کریں یہ آپ نے کیسے فرض کر لیا کہ گرمیوں کی طویل دوپہر میں نیند کا آنا لازمی ہے۔ جب آپ کسی نئی فلم کے میٹنی شو میں جاتے ہیں تو ٹکٹ کھلنے سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے قطار میں

کھٹے چلے رہنے اور دھکم پیل کے بعد جب آپ سینما ہال میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں کے فرحت بخش سرد ماحول، پنکھوں اور آرام دہ کرسیوں کی وجہ سے تو آپ کو کبھی نیند نہ آتی اس وقت آپ کا سر بھی تھکن سے بوجھل نہیں معلوم ہوتا اور نہ ہی آپ کو پٹھے اکڑے معلوم ہوتے ہیں ۔ بلکہ آپ بڑے اطمینان سے جوتے اتار کر سامنے والی سیٹ کے پچھلے حصے پر پاؤں ٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں اور فلم شروع ہونے کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں ۔[1]

سستائیے اور زندگی بڑھائیے

ہر دم تازہ دم رہنے کے لئے سستائیے اور زندگی بڑھائیے اس کتاب کے مصنف جوزف اے کینڈی ہیں ۔ اور سلیم اختر نے اس کا آزاد ترجمہ کیا ہے ۔ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں لکھا ہے :

"یہ کتاب آپ کے لئے لکھی گئی ہے بشرطیکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آپ زندگی بسر کرنے کے فن کو بے تکان سیکھنے کے متمنی ہوں ۔

آپ زندگی کے تقاضوں سے دباؤ، پریشانی اور جلد بازی کے احساس کے بغیر عہدہ برآ ہونا چاہتے ہوں ۔

آپ مسلسل تکان محسوس کرتے ہوں اور اس کی وجہ معلوم نہ کر سکتے ہوں ۔

آپ رات کو چین کی نیند سو نہ سکتے ہوں ۔

آپ میں زندگی کی امنگ باقی نہ رہی ہو ۔

آپ کے دل میں خیال جاگزیں ہو چکا ہو کہ آپ اپنے جسمانی، ذہنی یا اخلاقی طور پر خود سے متمتع نہیں ہو پا رہے ہیں ۔

آپ سے یہ کہا گیا ہو کہ آپ پریشان نہ ہوا کریں اور سستانے کی کوشش کیا کریں لیکن آپ کو یہ نہ معلوم ہو سکا ہو کہ سستایا کیسے جاتا ہے ۔ یا آپ محسوس کرتے ہوں کہ آپ کے حالات اس کی اجازت نہ دیں گے ۔

غرض یہ کتاب آپ کے لئے ہے بشرطیکہ آپ زندگی سے زیادہ فائدہ حاصل

---

[1] روزانہ چوبیس گھنٹے کیسے زندہ رہا جائے ۔ مترجم سلیم اختر مطبوعہ میری لائبریری ۱۹۷۱ء ص ۱۴۳، ۱۴۴

اورنگ زیب قاسمی

کرنے کی تمنا رکھتے ہوں ۔

"ورزش، کھیلوں اور جسمانی تربیت کے کام کی نگرانی کے دوران میں مجھے یہ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ جسمانی تربیت کے عمومی منصوبوں میں کسی عنصر کی کمی ہے جس سے یہ تو معلوم تھا کہ انسان کے عضلات اور پٹھوں کو کیسے نشوونما دی جا سکتی ہے ۔ اس طرح ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کن قوانین اور ضوابط کی پابندیوں سے بعض کھیلوں میں مہارت پیدا کی جا سکتی ہے ۔ لیکن میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ قوی ترین جسم کا فرد اچھا کھلاڑی نہیں بن سکتا اور بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ مشاق سے مشاق کھلاڑی کی مہارت جواب دے جاتی ہے

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نوجوان اپنے انداز و اطوار اور شکل و صورت سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ اور تو سب کچھ بن سکتا ہے لیکن اچھا کھلاڑی کبھی نہیں بن سکے گا اور آپ اسے نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن جب آپ اسے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک پیدائشی اور فطری کھلاڑی کی تمام خوبیاں موجود ہیں ۔

فطری کھلاڑی کی خوشنما اصطلاح سے یہ مطلب ہے کہ ایسے کھلاڑی کی تمام حرکات میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ان میں ایک ایسی برجستگی ہوتی ہے کہ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کا دماغ نہیں بلکہ جسم سوچتا ہے ۔ یعنی تمام اشغال و افعال ضرورت کے تحت اس موزوں انداز سے کام کرتے ہیں گویا یہ تمام عمل خود بخود ہو رہا ہے ۔

فطری کھلاڑی کو اس قسم کی مہارت حاصل کرنے کے لئے کسی سعی یا قوت ارادی کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ تمام نامور اور ممتاز کھلاڑیوں کے فن کی کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ کھیلتے وقت مختلف حرکات کے لئے اپنے جسم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالتے بلکہ اسے فطری طریقے سے کام کرنے دیتے ہیں ۔ ان کا طرز عمل نہ صرف اچھے کھیل کے لئے بلکہ طمانیت بخش زندگی بسر کرنے کے لئے بھی ایک زریں اصول کی حیثیت رکھتا ہے ۔"

جوزف اے کینڈی نے آگے لکھا ہے :

میں امریکی بحریہ کے محکمہ فزیکل ایجوکیشن کے طبی شعبہ میں کام کرتا رہا ہوں اور میں نے بحری جہاز کے نگراں ڈاکٹر کے معتمد کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے میں [illegible] میں ڈیپارٹمنٹ آف ری ہیبلی ٹیشن فلائٹ اسکول (DEPARTMENT OF RE HABILITATION AT THE PREFLIGHT SCHOOL) کا ناظم بھی رہا ہوں ۔ نیویارک میں جل فارم میں جسمانی تربیت کے لیے جو ادارہ قائم کیا تھا اس کا منتظم

کے دوران میں کئی تاجروں کے لیے بھی کام کر چکا ہوں۔ ٹیکساس میں میں نے بچوں کے جسمانی تربیت کے انسٹرکٹر کا کام کیا ہے۔ اور یہ کتاب لکھتے وقت اٹلانٹا (جارجیا) میں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں جسمانی تربیت کے شعبہ کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوں۔

میں نے ان مختلف اداروں میں استانے کے اصولوں کو ہر طرح کے لوگوں پر آزمایا ہے اور انہیں مفید پایا ہے۔

جہاں تک ہوا بازوں کا تعلق ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ تھکا دینے والی پرواز کے بعد بیس منٹ بے حرکت ستانے سے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ جن ہوا بازوں کو باتسلسل اور بے حرکت ستانے کی تربیت دی گئی انہوں نے بڑی آسانی سے پرواز سے قبل ہونے والی اس بے چینی پر قابو پا لیا جس سے بعض ہوا باز دوچار ہوا کرتے ہیں۔ ہوا بازوں نے بعد میں بتایا کہ انہوں نے دوران پرواز میں خطرات اور نازک مراحل کو نہ صرف بآسانی پہچان لیا بلکہ خوف زدہ یا غیر معمولی طور پر پریشان ہوئے بغیر ان مواقع پر اپنی قوت فیصلہ سے پوری طرح کام لیا۔ اسی طرح طلبا نے بیان کیا کہ ستانے کے ان طریقوں پر کاربند ہونے سے انہیں عسکری زندگی سے مطابقت پیدا کرنے میں نہ صرف آسانی رہی بلکہ بعد کی زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں بھی دشواریاں پیش نہ آئیں۔

آگے اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

میرا طریق کار کسی نقش سلیمانی کا مرہون منت نہیں بلکہ تین سیدھے سادے اصولوں پر مبنی ہے۔ تین ایسے اصول جن کی اگر پیروی کی جائے تو یہ آپ کے جسم کو فطری طور سے کام کرنے کی عادت ڈال دیں گے۔ انسانی جسم کے لئے ستانا ایک فطری ضرورت ہے۔ جبکہ کھنچاؤ غیر مانوس اجنبی اور غیر فطری ہے اس لئے کھنچاؤ کی حالت میں آپ کا جسم بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ آپ اپنے آپ سے عاجز آ جاتے ہیں۔ یہ کھنچاؤ اعصابی بے چینی پیدا کر کے آپ کو بے قرار اور مضطرب کر دیتا ہے۔ لیکن ستانے کے بعد تمام جسم آسودہ ہو جاتا ہے۔ آپ کا جسم ستانے کا متمنی ہوتا ہے اور جب کبھی آپ ستانے کا موقع دیں گے تو وہ خود ستانے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اگر آپ نے ستانے کی سعی کی ہے اور وہ لاحاصل ثابت ہو چکی ہے یا اگر خود کو ان اصحاب کے زمرہ میں شامل کرتے ہوں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ستا نہیں سکتے تو آپ سے استدعا ہے کہ میرے طریق کار کو اپنا کر خود ہی نتائج کا فرق محسوس کر لیں۔

میرا طریقہ سہل ہے۔ لیکن اس کی سادگی سے دھوکہ نہ کھائیے ستانے کا عمل آسان ہی ہونا چاہیے آپ اسے مشکل بنانے کی کوشش نہ کریں۔

اس طریقہ کار کا خلاصہ

میرا طریقہ تین مدارج پر مشتمل ہے۔

(۱) بے حرکت ستانے کا فارمولا: جو ان تین جسمانی حرکتوں پر مشتمل ہے، جو بجلی کے سوئچ کے مانند جسم میں ستانے کی رو دوڑا دیتی ہیں۔

(۲) باتسلسل ستانے کی تعلیم:۔ اس کے ذریعے آپ روزمرہ کے کاموں کے دوران میں بھی ستا سکتے ہیں۔

(۳) ستانے کی تشریح:۔ اس کے عمل کی وضاحت اور اسے سیکھنے کے فوائد۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ آپ ستانے کے عمل کو نفسیاتی لحاظ سے قبول کریں۔ تاکہ یہ جسم کے ساتھ ذہن کو بھی متاثر کر سکے۔

میں نے فارمولے کے بیان کے ساتھ ساتھ مثالوں سے اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جہاں تک زبان اور انداز تحریر کا تعلق ہے۔ اسے ادبی رنگ دینے کی بجائے اسے تربیت کے تقاضوں کے مطابق رکھا گیا ہے۔ یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب عضلات پر تکان حملہ آور ہو تو اس کی پہچان کیسے کی جائے اور اس پر کیسے غالب آیا جائے۔ یہ امر صرف بے حرکت ستانے کے لئے ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی عام زندگی کے لئے بھی ضروری ہے۔ اس امر کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ آپ اپنے ماحول اور گرد و پیش میں کھنچاؤ پیدا کرنے والے عوامل کو پہچان کر ان کا سد باب کیونکر کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ کو اس کتاب میں مکمل ہدایات ملیں گی کہ کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے!

ہر وہ بات جو اس کتاب میں درج ہے آزمودہ ہے۔ میں لوگوں کو گذشتہ بیس سال سے ستانے کے فن کی تعلیم دیتا آ رہا ہوں۔ یہ کتاب میرے تجربات کا نچوڑ ہے۔ ۱؎

مرد جنس کے آئینے میں

روشن کتابوں کے سلسلہ ۲۵ کے تحت سلیم اختر "مرد جنس کے آئینے میں" ایک کتابچہ انگریزی سے اردو میں

۱؎ ستایئے اور زندگی بڑھایئے مترجم سلیم اختر مطبوعہ میری لائبریری لاہور ص ۴

ترجمہ کیا ہے۔ جنس ہمارے ادب میں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے اگر اس کا استعمال ادیبوں نے اپنی تخلیقات
میں کیا تو فوراً اس پر فحاشی اور بیہودگی کا الزام عائد ہو جاتا ہے۔ لیکن سلیم اختر نے جنسی مطالعہ
ادب سے ہٹ کر بھی کیا ہے۔ اور وہ اس کتاب میں پیش کرتے ہیں۔

علامہ نیاز فتحپوری نے جب "ترغیبات جنسی" لکھا تو اس زمانے میں اس کتاب پر
بہت لے دے ہوئی۔

سلیم اختر کی اس کتاب میں ان ادیبوں کے گرانقدر مقالات کا ترجمہ شامل ہے جنہوں نے جنسیات کے موضوع
پر اہم مقالے قلم بند کئے ہیں۔ ان میں ہولاک ایلس (بچہ اور جنس) سگمنڈ فرائڈ (مرد کا جنسی سفر) کارل اے مینجر
(جنسی خوف کی علامت نامردی) ارنسٹ آر گرووز (کنواروں کی جنسی زندگی) تھریسے بینڈک (باپ کی نفسیات)
ایف۔ ایچ۔ اے۔ مارشل (جنسی اعضا کی کہانی) کینتھ واکر (جنسی کارکردگی میں مہارت) گرگیوریو مارنن (جنسی انحطاط)
اسوالڈ شوارز (طوائف کے خریدار) ایڈورڈ لیٹر مارک (ہم جنس باہم جنس پرستی)

"بچہ اور جنس" میں کہا گیا ہے کہ:

کسی زمانہ میں یہ عقیدہ تھا کہ بچپن میں جنسی تحریک کا کوئی وجود نہیں ہوتا لیکن یہ
عقیدہ عام نہیں تھا۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے فرض کر رکھا ہے۔ اگر ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اوائل عمری
میں جنسی تحریک کا نارمل وجود نہیں ہوتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس دور میں وقوع پذیر ہونے
والے تمام جنسی "مظاہر" کو کجروی قرار دینا پڑے گا۔ حتیٰ کہ خود فرائیڈ جو کہ طفلانہ جنسیت کو نارمل سمجھتا
ہے وہ بھی اسے "کجروی" بناتا ہے۔ اس نے اس کے لئے "کثیر الشکل کجروی" کی اصطلاح وضع کی
اس لئے اس موضوع پر بحث ـــــ خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو سب سے پہلے اس الجھن کا [illegible]
کرنا اشد ضروری بن جاتا ہے۔"[1]

مصنف نے مردوں کے اندر جنسی ارتقا کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔ "مرد کا جنسی سفر"
در اصل سیکس یا جنس کی تاریخ ہے جو قدیم زمانے سے مختلف روپ دھارے رہی ہے۔

"جب جنس کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کے معانی کے بارے میں
کسی کو بھی کوئی غلط فہمی نہ ہوگی یقیناً اس کا سب سے پہلا اور اولیں مفہوم تو "نامناسب" ہے۔
یہ وہ لفظ ہے جسے زبان پر لانا ہی معیوب ہے مجھے ایک مشہور نفسی معالج کے بارے میں ایک

[1] بچہ اور جنس، مشمولہ "مرد جنس کے آئینے میں" مترجم سلیم اختر مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور ص ۱

اورنگ زیب قاسمی

دلچسپ واقعہ سنایا گیا تھا اس کے چند شاگردوں نے اس امر پر زور دیا کہ اختناق الرحم کی مریضاؤں
کی حرکات عموماً جنسی رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے وہ اسے
ایک مریضہ کے پاس لے گئے جو دورہ میں بچہ کی پیدائش سے وابستہ تمام افعال و حرکات کر رہی
تھی۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ بچے کی پیدائش تو سراسر ایک غیر جنسی فعل ہے۔ واضح رہے
کہ بچہ کو جنم دینا بھی ہمیشہ نامناسب نہیں ہے!

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے اتنے اہم اور سنجیدہ معاملے کے بارے میں آپ میرے
اس مزاحیہ رویہ کو پسند نہیں کر رہے، لیکن یہ کوئی لطیفہ نہیں کیونکہ جنس کی مکمل اور جامع
قسم کی تعریف کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر ہم یوں کہیں کہ ہر وہ چیز جو دونوں صنفوں میں وجہ امتیاز
بنتی ہے۔ وہ جنس ہے تو ہم ایک حد تک سچائی کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔"[1]

ہم نے جنسیت کے معانی میں صرف اس قدر اضافہ کیا ہے کہ اس میں اب کجروی جنسی مظاہر اور طفلانہ جنسی حرکات
کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم نے اس کے صحیح معانی کی حدود متعین کر دی ہیں تحلیل نفسی کے دائرے سے باہر جسے
جنسیت سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ جنسی زندگی کے محدود پہلو کی غماز ہے جو تولیدی وظائف کے ذیل میں آتی ہے۔ اور
جسے نارمل کہتے ہیں۔ "جنسی خوف کی علامت نامردی" میں کہا گیا ہے کہ:

"جب لاشعوری ذہنی زندگی کی علمی انداز سے چھان پھٹک کی گئی تو اس کا ایک
نتیجہ یہ بھی نکلا کہ فرائڈ نے اس کی جنسی زندگی اور تناسلی اعضاء کی عدم کارکردگی کی اہمیت کو تسلیم
کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کسی وحشی انسان، جانور یا بھولے بھالے [illegible]
اور فطری انسان کو اس کے بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ آج ہمیں اس پر بڑا تعجب ہے کہ فرائڈ کو اس
حقیقت کی طرف اشارہ کرنا پڑا اور تہذیب نے کیسے حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس کی مخالفت کی۔
فرائڈ کے خلاف ہر طرف سے دشنام طرازی کا ایک سیلاب سا امڈ آیا۔۔۔ ان دشنام طرازوں نے اپنے رویہ
سے خود کو لاعلم، پر تصنع، یا نیوراتی ثابت کیا گیا۔ گو اب حالات ایک حد تک بدل چکے ہیں لیکن پھر
بھی معاملات جنس میں شرم و اخفا کا رجحان قطعی مفقود نہیں ہے۔"[2]

"کنواروں کی جنسی زندگی" میں مصنف کا خیال ہے:

"اگر کسی مسئلہ کو نظر انداز کر کے ختم کیا جا سکے تو شادی سے پہلے کوئی جنسی

[1] مرد کا جنسی سفر، مشمولہ "مرد جنس کے آئینے میں" مترجم سلیم اختر مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور ص ۸
[2] جنسی خوف کی علامت نامردی، مشمولہ مرد جنس کے آئینے میں مترجم سلیم اختر ص ۱۴۲

زندگی نہیں ہے۔ یہ بڑا قدامت پسند نظریہ ہے کہ جنس ایک ایسی تحریک ہے۔ جس کی تربیت کرتے ہوئے اسے سماجی ضوابط کے تابع کیا جا سکتا ہے۔ اس کا صرف اس وقت ظہور ہوتا ہے جب مرد اور عورت شادی کی زنجیروں میں جکڑ جائیں۔ اس لئے شادی سے پہلے جنسی خواہشات کا اظہار "غیر فطری" قابل مذمت اور خراب کردار کا مظہر ہے۔ اس نظریہ کے حامل افراد یہ توقع کرتے ہیں کہ ایک لڑکا یا لڑکی بلوغت کے ضمن میں وقوع پذیر ہونے والی تمام جسمانی تبدیلیوں کے باوجود بھی ان کے جنسی مفہوم سے ناآشنا ہے۔ اس چشم پوشی اور مصنوعی شرم کی وجہ سے مجرد افراد کی جنسی زندگی کو ایسے بھاری لبادوں تلے چھپا کر رکھا گیا کہ "شریف" لوگوں کے بارے میں کبھی کچھ معلوم ہی نہ ہو سکا۔ ہاں! دوسرے کے لئے دردسر بنے ہوئے لوگوں کے جنسی تجربات سے لوگ وقت بے وقت آشنا ہوتے رہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت اور اس کے دائرہ اثر کی وسعت کا اس کے بارے میں معاشرہ کی خاموشی اور چشم پوشی سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حالیہ نفسیاتی تحقیقات نے ان لبادوں کو چاک کر دیا ہے۔ یہ معصوم نظریہ کہ جنس اور اس کے مظاہر کو زمانۂ تجرد میں شادی تک کے لئے دبایا جا سکتا ہے۔ اب ختم ہو رہا ہے۔ جب کہنہ تعصبات کے جالے ہٹا کر علمی انداز سے اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو ہم ہوش اڑا دینے والے حقائق سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسے حقائق جو اپنی ہستی ہم سے منواتے ہیں۔ " [1]

"باپ کی نفسیات" میں تھریسے بنیڈک نے لکھا ہے کہ:

"ولدیت محض حیاتیاتی وظائف کی ادائیگی کا نام نہیں، صرف بچہ پیدا کرنا اسے پال پوس کر بڑا کرنا ہی فریضۂ والدین نہیں بلکہ یہ بالغ افراد کے اہم ترین سماجی فرائض میں سے ہے حیاتیات میں اس کردار کی تعریف کر دی گئی ہے جو زرع اور افزائش نسل کے ضمن میں نر یا مادہ ادا کرتے ہیں۔ مرد اور عورت کا ایک دوسرے کی احتیاج محسوس کرنا صرف انفرادی معاملہ نہیں۔ بلکہ وہ اس وظیفہ کی تکمیل کا ذریعہ بھی ہے۔ اور اس لئے تمام سماجی اداروں کے لئے سنگ اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ نوزائیدہ بچے غذا اور تحفظ کے لئے اپنی ماں کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ محتاجی حیاتیاتی نوعیت کی ہے۔ اس کی وجہ سے

[1] کنواروں کی جنسی زندگی "مشمولہ مرد جنس کے آئینے میں" مترجم سلیم اختر ص ۱۸

اورنگ زیب قاسمی

ماں اس مرد کی حفاظت اور امداد کی متمنی ہوتی ہے جو اس کے بچہ یا بچوں کا باپ ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک سیدھی سادی حیاتیاتی حقیقت نظر آتی ہے۔ لیکن یہ ایک اولین سماجی ادارہ یعنی کنبہ کی بنیاد بنتی ہے۔ کنبہ بچہ کی جسمانی پرورش اور نشوونما کا ضامن بنتا ہے اور یہ اس کا اہم ترین فریضہ ہے۔" [1]

"جنسی اعضاء کی کہانی" کے باب میں ایف۔ ایچ۔ اے مارشل لکھتے ہیں:

"اعضائے تولید "عضویات" علم کی اس شاخ کا نام ہے جو زندہ اشیاء کے وظائف سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ دراصل حیاتیات کا شعبہ ہے جو تمام علم حیات پر محیط ہے عضویات ساخت اور بناوٹ کی بجائے وظائف سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ وہ علم ہے جو بالخصوص ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بحیثیت مجموعی جسم اور اس کے اعضاء اپنی کارکردگی کیسے سرانجام دیتے ہیں اور یہ کارکردگی کن اصولوں اور قوانین کی تابع ہے۔ یہ واقفیت ہمیں جسمانی کارکردگی کو منضبط کرنے ہی میں مدد نہ دے گی۔ بلکہ جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ جسمانی کارکردگی کا عمومی انداز کیا ہے تو ہم میں وہ استعداد پیدا ہو جائے گی جس سے جسمانی کارکردگی میں خامی کی صورت میں ہم اسے ٹھیک کرنے پر قادر ہو جائیں گے۔" [2]

"جنسی کارکردگی میں مہارت" میں کہا گیا ہے کہ:

"ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو کبھی بھی یہ تسلیم نہ کریں گے کہ محبت یا الفت ایک فن ہے۔ وہ یہ کہیں گے کہ محبت ایک جبلی جذبہ ہے اور کارالفت کو مرد یا عورت کی جبلی تحریک کی راہنمائی کے لئے چھوڑ دینا ہے۔ بھلا کسی کو کیا پڑی کہ وہ ہمیں یہ سمجھائے کہ فطری وظیفہ کیا ہے۔ جس طرح خورد و نوش کی راہبرانہ کتابوں کی ضرورت نہیں اسی طرح ہمیں یہ سمجھانے کے لئے بھی کتابوں کی کوئی ضرورت نہیں کہ کارالفت کی تکمیل کس طرح ہونی چاہیے!

ایسے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ انسان کی گھٹی میں پڑا ہے کہ وہ ایک فطری تحریک کو اس کی اولین صورت میں ہی نہیں قبول کر لیتا بلکہ اسے ایک فن کا درجہ دے کر اسے لطافتوں اور نزاکتوں کے نقطۂ عروج تک پہنچا دیتا ہے۔" [3]

[1] باپ کی نفسیات، مشمولہ "مرد جنس کے آئینے میں" مترجم سلیم اختر مطبوعہ شیخ غلام علی چوک انارکلی لاہور ص ۲۲

[2] جنسی اعضاء کی کہانی مشمولہ . . . . ص ۲۵

[3] جنسی کارکردگی میں مہارت . . . . ص ۵۶

فاضل مصنف کا خیال ہے کہ جنسی کارکردگی میں مہارت کی خاطر اس کے علم سے واقفیت ہونی چاہیے۔ طوائف کو فیلڈ" میں لکھا گیا ہے!

"جسم فروشی نہ تو خصوصیت سے کوئی اخلاقی اور نہ ہی خالص سماجی اور اقتصادی مسئلہ ہے دراصل ہمیں یہ ہماری زندگی کے ان پہلوؤں کے ساتھ ساتھ بعض دیگر پہلوؤں پر بھی محیط ہے۔ اس حقیقت کے بارے میں کم واقفیت حاصل ہوئی یا کم از کم اتنا تو طے ہے کہ بہت دیر بعد تسلیم کیا گیا کہ جب سے انسان نے مل جل کر ایک معاشرتی صورت میں رہنا شروع کیا اسی وقت سے یہ طوائفیں بھی ہیں۔ [1]

"ہم جنس باہم جنس پرواز" ہم جنس مباشرت کے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں قدیم عہد سے لیکر تاحال ہم جنس مباشرت، اغلام بازی اور اس طرح کے دوسرے تعلقات پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ بعض مذہبی اور قانونی آرا کا بھی اظہار کیا گیا۔

عورت جنس کے آئینے میں

جنسی موضوعات پر مغرب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اردو میں اس قبیل کے مضامین کم ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی بساط بھر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

"عورت جنس کے آئینے میں" چند انگریزی مضامین کا مجموعہ ہے جو جنس سے متعلق ہیں۔ خاص طور سے نسوانیت سے اسے انہوں نے بڑے خوبصورت ڈھنگ سے اپنے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کیا ہے۔

"عورت شباب کی دہلیز پر" ہیلن ڈوئچ کا مضمون ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ:

"فرائڈ نے اپنی کتاب (THREE CONTRIBUTIONS TO THE THEORY OF SEX) میں سب سے پہلے تحلیل نفسی کے بنیادی اصولوں کو پیش کیا تھا اس نے طویل عرصہ تک بالغ نیوراتیوں کے علاج کے دوران میں مفصل اور دور رس نتائج اور مشاہدات سے بچہ میں جنسی نشوونما کے قواعد متخرج کئے۔ بعد میں جب دوسرے ممالک میں بچوں کا بلاواسطہ مشاہدہ کیا گیا، تو اس سے نہ صرف فرائڈ کے نظریات ہی کی توثیق ہوگئی بلکہ یوں بچوں کی نفسیات کے بارے میں جو بصیرت حاصل ہوئی، وہ فرائڈ کے اصل کام کے دائرہ سے بڑھ کر ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

موجودہ تحقیقات کی روشنی میں اب فرائڈ کے اس نظریہ میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جنسی نشوونما کا پہلا دور جسے وہ قبل تناسل سے تعبیر کرتا ہے۔ لڑکے اور لڑکی میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ قبل تناسل میں "ذہنی اور میزری" ادوار گئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر دو ادوار میں دونوں جنسوں سے تعلق رکھنے والے بچے تسکین حاصل کرتے ہیں ان جبلتوں کے عضوی ماخذات اور جبلی تسکین والے گرد و پیش کا مرکز بھی لڑکے اور لڑکی کے لئے ایک ہی یعنی ماں ہوتی ہے" [1]

گویا عورتوں کی جنسی اور نفسیاتی زندگی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ "مرد اور عورت ترازو کے دو پلڑے" میں فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ:

"انسانی کنبہ کی بقا کا ان سماجی اختراعات پر انحصار ہے جن کے زیر اثر ہر دور اور ہر نسل کے مرد اپنی عورتوں اور پیدا ہونے والے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کرتے چلے ہیں۔ یہ اختراعات اپنے وجود کے لئے جنسیت پر مبنی ان جسمانی تعلقات کی مرہون منت ہیں۔ جن کی بنیاد حیاتیات پر استوار ہے۔ انسان حیوانوں کی مانند جنسی ملاپ کے لئے کسی مخصوص موسم کا تابع نہیں۔ اس لئے عورت میں حیوانی مادہ بظاہر قبولیت کے باوجود بھی انسانی جنس پر مبنی مستقل نوعیت کے تعلقات استوار کرسکتا ہے" [2]

آشولڈ شوارز کا خیال ہے کہ:

"محبت کے بارے میں (شاید اسی کا نام محبت ہے) استفسار پر بہت سے لوگ اسے ایک ہیجان سے تعبیر کریں گے لیکن دوبارہ غور کرنے پر کچھ لوگ اس جواب میں اس بنا پر کچھ ہچکچاہٹ محسوس کریں گے کہ یہ کس نوع کا ہیجان ہوسکتا ہے؟ قبول عامہ کے باوجود بھی یہ عقیدہ صحیح نہیں۔ یہ درست ہے کہ محبت میں ہیجان کا خاصہ عمل دخل ہے۔ اور اسے مشتعل، اتفاقاً ہوگا۔ لیکن ہیجان اس وسیع کل کا محض ایک جزو ہے اور یہ جز بھی اساسی اہمیت کا حامل نہیں۔ جبلت کی مانند ہیجانات اطلاع دہندہ ہیں یہ وجود کی گہرائیوں میں وقوع پذیر ہونے والے تغیرات سے ہمیں آشنا کراتے ہیں۔

---

[1] عورت شباب کی دہلیز پر۔ مشمولہ "عورت جنس کے آئینے میں" مترجم ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۰ مطبوعہ علی چوک انارکلی لاہور

[2] "مرد اور عورت ترازو کے دو پلڑے" " " " " ص ۹

فرق صرف اتنا ہے کہ جبلتوں کا عمل حیاتیاتی دائرہ تک محدود ہے۔ جب کہ ہیجانات کا ذات سے تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً طمانیت ہمارے شعور کو اس امر کی اطلاع دیتی ہے کہ کام مکمل ہو چکا ہے۔ وہ برا بھلا جیسا بھی ہوا ہو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ فرض یا کام کی تکمیل میں محسوس کئے جانے والے تناؤ سے چھٹکارا مل چکا ہے۔

اسی طرح خلط محبت اور خلط تعریفات کا شکار ہیجان خوشی میں بھی ہمارے تمام وجود پر چھا جانے والی طمانیت کی ایک اعلیٰ اور ارفع صورت ہے۔ یہ اس حقیقت کی مظہر ہے کہ ہم اپنے مادی انسانی اور روحانی ماحول سے ہم آہنگ ہیں۔"[1]

ہیولاک ایلس (عورت، جنس اور محبت) میں لکھتے ہیں:

"شادی کا کئی طرح سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ تہذیبی اثرات سے اس میں زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اب یہ ہر ملک میں مروج اخلاق (یہاں اخلاق رواج کے معنی میں ہے) کے تابع کر دی جاتی ہے۔ یا پھر میکس ہرشیمین کے الفاظ میں اسے ایک معاہدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسا معاہدہ جس میں جنسی تعلقات ہی نہیں بلکہ صحیح قسم کی معاشرتی زندگی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس معاشرتی زندگی کی اساس، اقتصادی اور نفسی قدروں اور اخلاقی (یہاں اخلاق سے سماجی مراد ہے) تقاضوں پر استوار ہوتی ہے۔ مگر سرسری نگاہی سے جائزہ لینے پر ایک دوسرے کے موزوں دو ایسے افراد کا آزادانہ انتخاب ہے جن کا مقصد محبت کے متنوع مظاہر کی بلا مزاحمت تسکین ہوتا ہے۔ کڑوی گولی پر شکر چڑھانے کے طور پر جنسی تحریک کے ہر مظاہرہ کے لئے بالعموم "محبت" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بالکل غلط ہے ہمیں شہوت یا عضویاتی جنسی تحریک کے تعلق میں تفریق کرنی چاہئے۔

عبارت آرائی سے ہٹ کر اگر بات کی جائے تو محبت کو شہوت اور دوستی کا مرکب کہا جا سکتا ہے۔ عضویاتی لحاظ سے اس مسئلہ کو دیکھا جائے تو فورل کی ہم نوائی میں دماغی مراکز سے جنسی جبلت کے اظہار کو محبت کا نام دیا جا سکتا ہے۔"[2]

سہیلیوں سے ہم جنس محبت کے سلسلہ میں کلارا تھامپسن نے "سہیلیوں سے جنسی لگاؤ" کا مسئلہ اٹھایا ہے۔

---

[1] شادی کا نام محبت ہے۔ مشمولہ "عورت جنس کے آئینے میں" مترجم سلیم اختر مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور ص ۱۶

[2] عورت جنس اور محبت۔ مشمولہ "عورت جنس کے آئینے میں" مترجم سلیم اختر " " " ص ۴۴

اورنگ زیب قاسمی

لکھتی ہیں:

"تحلیل نفسی میں اب تو "ہم جنس پرستی" کی اصطلاح کچھ ردی کی ٹوکری ایسی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جس میں اپنی جنس سے وابستہ ہر نوعیت کے تعلقات اٹھا پھینکے جاتے ہیں۔ ہم جنسیت پر مبنی کارکردگی، طرز عمل، احساسات، خیالات، "اور دباؤ" سبھی اسی ایک لفظ کی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ المختصر اپنی جنس کے افراد سے دوستانہ یا معاندانہ کیسے ہی تعلقات کیوں نہ ہوں ان سب پر ہم جنس پرستی کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ اس مسئلہ کے بارے میں خیالات و نظریات میں بڑا الجھن ملتی ہے۔ اس کے باعث میں نے اس موضوع پر تمام پہلوؤں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی۔ میں نے ہم جنسیت پر تحلیل نفسی کے تمام نظریات کا جائزہ لے کر موجودہ دور کے نظریہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ فرائڈ نے اپنے لبیڈو کا جائزہ لے کر موجودہ دور کے نظریہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ فرائڈ نے لاشعوری ہم جنسیت کو بنیادی قرار دیتے ہوئے اعصابی خلل کا ایک باعث قرار دیا۔ جب کہ موجودہ تحقیقات کی رو سے یہ شخصیت کے عمومی مسائل کی ایک علامت ہے۔"[1]

"جنسی ابال، دباؤ اور ارتفاع" میں ہیولاک ایلس کا خیال ہے کہ:

"اپنے تمدن کے لحاظ سے ہمیں یہ معلوم ہے کہ سماجی زندگی کے عام حالات کے تحت جنسی تحریک کی توانائی کا رخ ان تینوں راستوں کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔

۱۔ اس کے واضح اظہار کی تمام صورتوں کو دبا کر اس توانائی کو بے لگام چھوڑ دیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں عضویت نارمل یا ابنارمل صورتوں میں اس کی تسکین کرتی ہے۔

۲۔ عارضی یا برائے نام جنسی تعلقات کو ذریعہ تسکین بنایا جاتا ہے۔ طوائف بازی اس کی ایک مثال ہے۔

۳۔ شادی کر لی جاتی ہے۔ یعنی جنسی تعلقات کا وہ سلسلہ جسے اگر حالات اجازت دیں تو دائمی بنانے کا ارادہ ہوتا ہے۔ اس میں جنس کے علاوہ دیگر مقاصد بھی شامل ہوتے ہیں۔

اس امر کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ تیسرا طریقہ بہتر ہے۔

---

[1] "سہیلیوں سے جنسی لگاؤ" عورت جنس کے آئینے میں مترجم سلیم اختر ص ۲۲

اور بچوں کی عدم موجودگی کے باوجود بھی شادی شدہ زندگی کا ایک گمبھیر اور لطیف تجربہ ثابت ہوتی ہے۔
یہ ایسی حقیقت ہے جسے ہر نظام اخلاق اور مذہب کے پیرو بلکہ لا مذہب بھی بآسانی تسلیم کر سکتے
ہیں۔ شادی بہترین راستہ ہی مگر مشکلات کے خارزار سے بھرا ہوا ہے۔ بلکہ یوں کہیں کہ جنسی کارگزاری
کا راستہ مشکلات کے ہفت خواں سے بھرا ہوتا ہے۔ اس میں اعصابی خلل کے مریض یا نارمل اور صحت مند
فرد کی تخصیص نہیں ہے۔" [1]

شادی، جنس اور جذبات

"میری شادی میں کیا خامی ہے؟" کے عنوان کے تحت مصنفہ نے شوہروں کا ایک جائزہ پیش کیا ہے کہ:

"جب ایک مرد اور ایک عورت رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں تو
عموماً اس کا یہی مطلب لیا جاتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بے حد مسحور کن پاتے ہوئے
اتصال کے اس طریقہ کو خوشی اپناتے ہیں، جسے قانون اور سماجی اقدار ہی نہیں بلکہ ان کی
اپنی خواہشات بھی ایک مخصوص نوعیت عطا کرتی ہیں۔ فریقین کے ارادے نیک ہوتے ہیں۔
دونوں ہی اس اتصال کو دائمی ہم آہنگ اور آسودگی بخش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ایک ایسی
صحت مندانہ فضا کی توقع بندھ جاتی ہے کہ اگر اتصال کے نتیجے میں بچے پیدا ہوں یا کسی کو متبنیٰ بنایا
جائے تو پرورش کے لئے ماحول موزوں رہے۔ مرد اور عورت کا یہ معاہدہ ایسا ہے کہ اگر وہ
اسے باہمی رضامندی کے بعد ختم کرنا بھی چاہیں پھر بھی وہ کم از کم سماجی امراض کی فہرست میں
ایک عدد کا اضافہ تو ضرور ہی کر دیتے ہیں۔ ان کی شادی کا والدین بن جانے کے بعد علیحدگی
یا طلاق پر منتج ہو جانے کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے مردم شناسی میں جو غلطی کی تھی، اس
کا اعتراف کر لیا۔ بلکہ اولاد کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو وہ ایک غیر فطری اور تکلیف
دہ صورت حالات پیدا کرنے کے موجب بنتے ہیں۔ یہ حیاتیاتی گناہ ہے۔ معاشرتی قواعد یا حکومت
کے قوانین کی خلاف ورزی ہی گناہ نہیں بلکہ بعض حالات میں تو یہ وصف بن جاتی ہے۔ لیکن ذہنی
اور جسمانی صحت کے مسلّمہ اصولوں کو پاؤں تلے روندنا کوئی وصف نہیں ——— ہاں! ان حالات میں

---

[1] جنسی ابال، دباؤ اور ارتقاء مشمولہ "عورت جنس کے آئینے میں" مترجم سلیم اختر مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور ص ۲۰۷

اورنگ زیب قاسمی

اسے وصف سمجھا جا سکتا ہے، جب فرد سوچ سمجھ کر دوسروں کی بہبود پر خود کو قربان کر دے جبکہ
طلاق میں وہ اپنی خاطر دوسروں ——— بچوں کی ——— بہبود قربان کرتا ہے۔ ازدواج کی مانند
طلاق میں بھی یہ عقلی اصول کارفرما ہونا چاہئے کہ دونوں اگر اکٹھی زندگی بسر کریں تو اس سے
فریقین اور بچوں کے لئے ہم آہنگیوں اور آسودگیوں کے مقابلے میں چپقلشوں اور پژمردگیوں
کا کیا توازن رہتا ہے۔" [1]

"انسانی زندگی اور جنس کی بدلتی اقدار" مارگریٹ میڈ نے ایک خاص اور
اہم مسئلہ کو اٹھایا ہے۔ بعض اوقات لوگ جنسی مسئلہ کو اس طرح اٹھاتے ہیں جیسے وہ مُسلفت
کا ذکر کرتے ہوں۔ گویا یہ بھی ایک قسم کی وبال جان اور ناگوار چیز ہو جسے عہد جدید کی فیکٹریوں
نے پیدا کیا ہو۔ ان کی گفتگو کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دادا پردادا کے زمانے میں یا قدیم عہد
میں اس مسئلہ کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس وقت ہر انسان کی نشوونما اور مباشرت معاشرہ اور
اس کے ضوابط کی تابع ہوتی تھی۔ اس کے برعکس جدید انسان کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ گویا
اس پر جنس ایک پیر تسمہ پا کی طرح مسلط ہے۔ اسے صحیح وقت صحیح تعداد اور صحیح جنسی رفیق کے
انتخاب کا شعور نہیں۔ جب وہ لڑکپن میں تھا تو اس کی توجہ ان خواہشات کی طرف منعطف ہوتی
رہی جن کی نوعیت کو کوئی نہ سمجھتا تھا۔ ابھی آغاز شباب ہی تھا کہ وہ شادی کے بندھن میں
جکڑا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ یا تو ٹھنڈا گوشت بن جاتا ہے اور یا پھر
نامکمل اور ناکام قسم کی جنسی بے وفائیوں کو شعار بنا لیتا ہے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ جنس
اپنے صحیح مقام پر ہی اچھی لگتی ہے۔ جبکہ یہ ہمیشہ ہی غلط مقام پر دیکھی اور پائی جاتی
ہے۔ واضح رہے کہ ان عیب جو نقادوں کے نزدیک جنس سے ناقص جنسی فعل مراد ہے۔
اسی لئے تو امریکہ میں ہم لوگ مباشرت کے انداز کے بارے میں تفصیلات کو "حقائق زیست"
کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہم یہ فراموش کر بیٹھے ہیں کہ انسانی جنسی طرز عمل کی
بنیادیں کتنی گہری اور اس کی حدود کس قدر وسعت رکھتی ہیں۔ حالانکہ انسانی زندگی ——
مہد سے لحد تک اسی رنگ میں رنگی نظر آتی ہے۔ مکانات کا طرز تعمیر، سکولوں کے
لئے ٹیکسوں کی شرح، نظام افواج اور عبادت گاہوں کے سلسلے ——— سبھی کچھ اس زمرہ میں

---

[1] "میری شادی میں کیا خامی ہے" مشمولہ "شادی جنس اور جذبات" از سلیم اختر ص ۱ مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور

آجاتے ہیں۔ یہ دراصل وہ حیاتیاتی ترکیب ہے جس کے ذریعہ اعلیٰ درجے کے تمام حیوانی اجسام
میں بوقلمونی پیدا کرتے ہوئے زندگی کو خوشگوار بنایا ہے۔

"جنسی کردار کی صد رنگی" میں رابرٹ لاٹوڈ ڈکنسن نے اپنے مضمون میں چند
دلچسپ سوالات اپنے پڑھنے والوں سے کئے ہیں۔ اگر انسانی زندگی میں فطری مناسبت رکھنے
والے پیشے اور کامیاب شادی کو گہری آسودگیوں کا باعث مان لیں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔
سب سے زیادہ عدم آسودگیاں بھی غلط کام اور پیشے اور ناپسندیدہ مباشرت ہی کی
پیدا کردہ ہوں گی۔ آخری حصہ تو فطرت کی عظیم ترین حیاتیاتی غلطیوں کی مرہون منت ہے۔
ماضی بعید میں فطرت نے اس سیارہ کو انسانی وجود سے معمور کرنا تھا۔ اس لئے اس نے زرخیزی
میں اعلیٰ ترین معیار کی برقراری کے لئے انسانوں کو جنس سے وابستہ ہر نوع کے جذبات واحساسات
اور انگیخت بخش دی۔ اب ہم اسی کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ سماجی اجازت نامے کے حصول سے
برسوں قبل ہی لازمی اور شدید قسم کے وظائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وہ وظائف
ہیں جن کے اظہار کی متنوع صورتوں پر فطرت کے خلاف جرم کا قانونی لیبل چسپاں کیا جاتا ہے۔ اگر
ہم گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو ہم میں سے نوے فیصد ان "جرائم" کے ارتکاب کی پاداش
میں قابل تعزیر ٹھہرتے ہیں۔

اس لئے اگر مسئلہ جنس، خوف، انکار اور اخفاء کے دائرہ میں محبوس
رکھا جاتا ہے، تو یہ امر تعجب خیز نہ ہونا چاہئے۔ اس بنا پر بآسانی یہ پیشین گوئی کی جا سکتی
ہے کہ جنس کے بارے میں اختیار کردہ خاموشی اور اخفاء کا بہ بانگ دہل پردہ چاک کرنے
پر عوامی ردعمل اچھا خاصا طوفانی ہو گا۔" [1]

اس مضمون میں دوسرے کئی سوالات پر روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً مختلف طریقہ ہائے تسکین کا استعمال
کیسے ہو۔

"جنسی کارگزاری کی پیمائش" بھی خوب مضمون ہے۔ اس میں جنسی
کارگزاری کی پیمائش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دراصل یہ تین انگریزی ادیب "کنزے،
پومرے اور مارٹن" کی ترتیب دی ہوئی ہے۔ یہ کتاب جنسی کارگزاری پر بحث کرتی

[1] جنسی کردار کی صد رنگی، مشمولہ "شادی جنس اور جذبات" مترجم سلیم اختر مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور ص ۲۷

اورنگ زیب قاسمی

ہے۔ اس کتاب میں ایسے نقشے دیئے گئے ہیں جن کے ذریعہ ہر انسان جنسی قوت کے بارے میں اپنا ٹسٹ لے
سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے ٹسٹوں میں بازی وہی جیتتا ہے جو جنسی کارکردگی میں سب سے زیادہ
نمبر لے یعنی سب سے زیادہ مجامعت کرتا ہو۔ لیکن علم انسان سے معمولی سی واقفیت بھی اسے باطل
کر سکتی ہے۔ غیر متمدن اور وحشی معاشروں کے بارے میں ہمارے پاس اتنی معقول معلومات ہیں
جن سے بظاہر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ محبت کو تسلیم کئے بغیر یا جنس میں کسی قسم کی دلچسپی لئے
بغیر زیادہ تعداد میں مجامعت کرتے رہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ دوسری بات ـــــ جو قدروں
کی بے قدری کے باوجود بھی نمایاں ملتی ہے وہ یہ کہ لوگ اس اعلیٰ پایہ کے جنسی تسکین کے خواہاں
نظر آتے ہیں، جو عموماً میسر نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر کنزے کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شادی
سے قبل، بعد یا وقتاً فوقتاً لوگ ہم جنسیت پر مبنی تعلقات استوار کرتے رہتے ہیں۔ شاید یہ بھی
اعلیٰ پایہ کی جنسی تسکین کی خاطر ہو ـــــ ویسے بعض اوقات شراب پی کر تفنن طبع کے لئے بھی
ایسا کیا جاتا ہے۔ یا عنفوان شباب میں نت نئے تجربات کا شوق بھی ایسا کراتا ہے۔ لیکن ایسا
معلوم ہوتا ہے جیسے اکثریت کسی ناقابل حصول مثالی تصور کی خاطر ہم جنسیت اپناتی ہو۔" [1]

"عورت کی جنسی زندگی" میں جن خیالات کا اظہار ملتا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

"صدیوں سے عورتوں کی زندگیاں ان کے جنسی کردار کے گرد گردش
کناں رہی ہیں۔ کم عمر بچیوں کو بہت جلد یہ سکھا دیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ دلہنیں بنیں گی
اس کے تھوڑی دیر بعد مائیں اور گردش ایام نے اجازت دی تو دادی اماں بھی!
اس لئے لڑکیوں کے تمام کام بلکہ کارنامے ـــــ چرخا کاتنا، کڑھائی، بنائی، امور خانہ داری
اور رقص و موسیقی ـــــ غرضیکہ اس تمام ہنرمندی کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ
بیوی اور ماں کی صورت میں تمام زندگی اپنے پیشہ میں کامیاب رہ سکیں۔ مرد کے لئے اصل
جنسی کارکردگی ـــــ خواہ وہ اس کی شعوری توجہ پر مسلسل دخل اندازی کیوں نہ کرتی ہو ـــــ
محض چند لمحات کا معاملہ ہوتا ہے۔ جب کہ عورت کے لئے یہ چند لمحات ـــــ پہلے اور بعد ـــــ
ہر دو صورتوں میں قول و قرار کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ مرد کے لئے پدری خواہشات
اکتسابی ہیں لیکن عورت کے جسم کا ایک ایک خلیہ پکار پکار کر اسے ماں بننے کی یاد دہانی

[1] جنسی کارگزاری کی پیمائش، مشمولہ شادی جنس اور جذبات از سلیم اختر ص ۴۲

کرتا ہے۔ اور عورت بھی فطرت کی اس للکار پر پوری توجہ اور انہماک سے اپنی تمام زندگی وقف کر دیتی ہے۔[1]

اس لئے جنس میں اب کسی حد تک تنوع ملتا ہے اور سوالات ابھرتے ہیں۔ میں کیا ہوں؟ عورت کیا ہے؟ ہم دونوں ایک دوسرے کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے جذبات کا سمجھداری سے کیسے جواب دیا جا سکتا ہے؟ اور شادی کے نام پر جو پیمان وفا باندھا ہے اسے کیسے زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔

عورت جنس اور جذبات

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب کی ابتداء حضور اکرمؐ کے اس قول سے کی ہے۔

"عورت پسلی کی طرح ٹیڑھی ہے۔ اس سے اگر کچھ کام لینا ہے تو اس کے اس ٹیڑھے پن ہی کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو یہ ٹوٹ جائے گی"

(حضرت محمدؐ)

"قرآن مجید میں عورت کو "کھیتی" سے تشبیہ دیتے ہوئے ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اس "کھیتی" کی فصل کا محض ہل اور ہل چلانے والے کی طاقت یا مہارت ہی پر انحصار نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ زمین کی ساخت موسموں کی تبدیلی اور ہواؤں کی بدلتی کیفیات کی پہچان بھی لازم ہے۔ وہ کسان جو اپنی زمین کے مزاج سے بے خبر ہے وہ کبھی اس سے سونا نہیں اگلوا سکتا۔ عورت جو کارزار حیات میں مرد کی شریک کار ہے جو مرد کی نصف بہتر بنتی ہے اور جو اس کے لئے بعض اوقات زندگی کا سب سے بڑا محرک ثابت ہوتی ہے" اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ جہاں مرد کی بہت سی خوشیاں اس کی مرہون منت ہیں وہاں اس کی بہت سی پریشانیاں بھی عورت کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔

---

[1] عورت کی جنسی زندگی" مشمولہ شادی جنسی اور جذبات از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۲

ہماری قوم اس وقت ایک عبوری دور سے گذر رہی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے معاشرے کا انداز ایک حد تک بدل چکا ہے۔ ہماری زندگیاں آج سے ربع صدی قبل کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ ہو چکی ہیں۔ اس پیچیدگی سے عورتیں کافی متاثر ہوئی ہیں آج سے نصف صدی قبل کی عورت کا سب سے اہم مسئلہ اپنے خاوند کو "بس" میں رکھنا تھا اور پھر امور خانہ داری سے وابستہ مسائل تھے مگر اب معاشرتی حالات اس نہج پر ہیں کہ وہ چاہتے ہوئے بھی "چراغ خانہ" بن کر نہیں رہ سکتی"[1]

متوسط طبقے کی لڑکیاں اب زندگی کی دوڑ میں شامل ہو چکی ہیں۔ جس کے نتیجے میں بحیثیت مجموعی اب ان میں پہلے کی نسبت زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی ہے۔ لیکن کئی طرح کی آزادیوں سے آج کی لڑکی کو کئی طرح کے فوائد حاصل ہیں، وہاں اس کی ذہنی پریشانیوں میں بھی خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے ذہنی اعتبار سے مرد بھی ابھی تک عورتوں کی آزادی کے ساتھ میل پیدا نہیں کر سکے۔ لڑکیوں کے مجمع میں راتیں اندر بن کر بیٹھنے والے مرد کو یہ گوارا نہیں کہ گھر کی مستورات بھی پردے سے باہر آئیں۔ مرد جب عورتوں کی آزادی کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان میں اکثریت کی مراد غیر عورتوں سے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زیادہ تعداد تعلیم یافتہ لڑکیوں سے گھبراتی ہے۔ وہ ان پڑھ لڑکیوں سے یوں بھاگتے ہیں کہ یہ ذہنی لحاظ سے ان کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں سے یوں ڈرتے ہیں کہ یہ ان سے دبیں گی نہیں اس سے جہاں نوجوانوں کی موجودہ نسل عام طور پر مردگی (جنسی اور جذباتی دونوں لحاظ سے) کا شکار ہے۔ وہاں اس کے رد عمل سے لڑکیاں بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ لڑکی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے لیکن برادری میں کوئی موزوں رشتہ نہیں ملتا۔ برادری سے باہر رشتہ ڈھونڈا جاتا ہے۔ لیکن وہاں اچھے رشتے نہیں ملتے۔ آزاد لڑکی سے فلرٹ کرنے والے تو بیشمار ہیں۔ لیکن شادی کے بارے میں سوچنے والے کم نکلیں گے۔ ان حالات میں لڑکیاں پڑھ لکھ کر گزیٹڈ افسر تو بن جاتی ہیں۔ لیکن ہر قسم کی مادی آسائشیں حاصل کر لینے کے باوجود وہ جنسی اور جذباتی آسودگی سے عموماً محروم رہتی ہیں۔ اس لئے یونیورسٹیوں اور کالجوں کی لڑکیوں کی حالت زیادہ دشوار کن ہے۔ وہ اس کشتی کی مانند ہیں جو پانی نہیں ملنے کے باعث ساحل پر کھڑی رہتی ہیں۔

میں نے لڑکیوں سے سوالات کئے تھے۔ ان میں ۶۳ فیصد لڑکیاں شادی نہ کرنے کا عہد کر بیٹھی

---

[1] عورت جنس اور جذبات از سلیم اختر ص ۲ مطبوعہ سیرا اکیڈمی لاہور

اورنگ زیب قاسمی

ہیں۔ نفسیات انسان کا مطالعہ اشرف المخلوقات سمجھ کر نہیں کرتی کیونکہ اسے انسان ہی کا مطالعہ کرنا ہے اس لئے یہ اس ضمن میں کوئی رو رعایت روا نہیں رکھتی۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے۔ ہمارے یہاں یا تو اسے شاعرانہ نگاہ سے یا پھر بزرگوں کے اقوال کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے۔ مگر یہ انداز نظر انتہا پسندانہ ہونے کی وجہ سے ذرا ادھورا ہے۔ اگر اول الذکر کے نزدیک عورت محض محبوبۂ دلنواز اور تصویر کائنات کا رنگ ہے تو موخر الذکر کے نزدیک اس کا وجود جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔ عورت محض پیکر رنگ و بو ہی نہیں بلکہ گوشت پوست کے جسم کی بھی مالک ہے۔ وہ مونالیزا بن کر مصور کے تخیل کے لئے محرک کا کام بھی کر سکتی ہے۔ وہ بیٹریس بن کر شاعر سے لازوال نغمات تخلیق کروا سکتی ہے۔ وہ اختر شیرانی کی سلمیٰ بن کر گیت لکھوا سکتی ہے۔ وہ شاعروں کی محبوبہ بن سکتی ہے۔ دوسری طرف وہ ایک عورت بھی رکھتی ہے جس میں ایک نظام عصبی ہے جس کا ایک ذہن ہے اور جس کے خصوص قسم کے تقاضے ہیں۔ اور وہ اپنے آنچل سے پرچم بنانے کی بھی سوچتی ہے۔

اب تک عورت کا بحیثیت بیوی یا محبوبہ جو تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس سے آپ کے ذہن میں کم از کم بنیادی نوعیت کے دو سوالات تو فوراً ابھریں گے کہ عورتوں کے ساتھ کونسا رویہ اپنایا جائے۔ عورت کی شادی سے پہلے اسے سماج میں کونسا مقام دیں اور شادی کے بعد اسے کس مقام پر رکھیں۔ عورت کو بیوی بنانے کا اگر کوئی فائدہ نہ بھی ہو (جو کہ غلط ہے) تو کم از کم اتنا تو ضرور ہے کہ شادی کی صورت ہی میں جنسی زندگی بسر کرنے کا ذریعہ ملتا ہے۔ ایسا ذریعہ جس پر مذہب، معاشرہ اور قانون کسی طرح کا بھی اعتراض نہیں کرتے۔ جنس سے یہاں محض جنسی اختلاط مراد نہیں ہے۔ بلکہ جنس کو اس کے وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ وہ جنس جو انسانی تمدن کی اساس اور جمالیاتی تجربات کی کثرت میں وحدت پیدا کرتے ہوئے فرد کو اس کی گہری آسودگی سے روشناس کراتی ہے۔ جس سے وہ اخلاقی اور روحانی بلندیوں کو پالینے کے قابل ہوتا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

چھٹا باب

ڈاکٹر سلیم اختر کا اسلوب

قبل اس کے کہ میں سلیم اختر کے اسلوب نگارش کا تنقیدی جائزہ لوں ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلوب یا اسٹائل سے مراد کیا ہے، واضح کر دوں CUDDON نے اسٹائل کی تعریف یوں کی ہے۔

"The characteristic manner of expression in prose or verse; how a particular writer says things. The analysis and assessment of style involves examination of a writer's choice words, his figures of speech, the devices (rhetorical and otherwise), the shape of his sentences (whether they be loose or periodic), the shape of his paragraphs-indeed, of every conceivable aspect of his language and the way in which he uses its style defines complete analysis of definition (Remy de Gourmont put the matter tersely when said that defining style was like trying to put a sack of flour in a thimble), because it is the tone and 'Voice' of the writer himself as peculiar to him as his laugh; his walk; his handwriting and the expressions on face. The style, as Buffon puts it, is the man"

A Dictionary of literary terms by J.A cuddon page no 647

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں CUDDON کے تصورِ اسلوب کو ذیل کے نکات پر محیط کیا جا سکتا ہے۔

الف :- ادیب یا شاعر نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔

ب :- اس کے یہاں بلاغت کی صورت کیا ہے۔

ج : جملوں کی ساخت کا کیا عالم ہے۔

د : پیراگراف کا کوئی نظام ہے یا نہیں۔

ہ : مجموعی اعتبار سے ادیب یا شاعر کا لہجہ اور آواز اسلوب کی تشکیل کرتی ہے۔

گویا جس طرح کوئی شخص جیتا ہے چلتا ہے اس کے خد و خال مخصوص شکل کے ہوتے ہیں اور چہرے کی لکیریں الگ الگ ہوتی ہیں! اسی طرح کسی ادیب کا اسلوب بھی کسی دوسرے ادیب سے مختلف ہے یا ہونا چاہئے۔ اسی لئے BUFFON نے کہا تھا کہ اسلوب ہی شخص ہے۔ کڈن کی مندرجہ بالا آراء سے اختلاف کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فن کار اپنی انفرادیت سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی کا چہرہ دوسرے سے ملتا نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ انگلی کی لکیریں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ چنانچہ اگر فن کار اپنے لفظیات میں اپنے نظام بلاغت میں اپنے جملوں کی ساخت میں دوسرے سے الگ نہ ہو تو پھر یہ کیسے کہا جائیگا کہ وہ کسی اسلوب کا مالک ہے۔ ظاہر ہے یہاں تتبع اور نقل کا مسئلہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن جس طرح مکھوٹا لگا کر کوئی شخص بدل نہیں سکتا اسی طرح نقل اور تتبع اپنے ذہن کی افتاد پر روک نہیں لگائی جا سکتی ان سے کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ بلکہ نقل کی پہچان ہو جائے گی اور اسلوب رسوا ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر سلیم اختر ایک باشعور نقاد ہیں جن کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور سوچ بھی گہری! ایسے میں ان کا اسلوب لازمی طور پر منفرد ہونا چاہئے اور کسی حد تک ممتاز بھی۔ لیکن قبل اس کے کہ ان کے اسلوب کا کوئی تذکرہ کیا جائے دیکھ لینا چاہئے کہ ان کی نثر مختلف کتابوں میں کس طرح ابھری ہے۔ میں بلا انتخاب ان کی چند کتابوں سے اقتباسات درج کر رہا ہوں جن کے جائزے کے بعد ہی نتائج کے استخراج میں آسانی ہوگی۔

"غالب کے ادبی شعور نے جب آنکھیں کھولیں تو گو میر تقی میر ابھی زندہ! عظیم تھے مگر چرچا لکھنوی شعراء کی لفظی تراش خراش کا تھا۔ مشکل بحریں، انمل قوافی، طویل ردیفیں، لفظ کو خوبصورت کھلونا سمجھ کر اس سے نئے نئے طریقوں سے کھیلنا ـــ یہ سب کچھ دیگر شعراء کی مانند کم عمر غالب کے لئے بھی اچنبھے کا تماشہ ہوگا۔ غالب کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ فارسی گوئی میں اہل ہند میں سے کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اسے اپنی فارسی دانی اور فارسی گوئی پر ناز بھی تھا اور اس حد تک کہ وہ اپنے اردو کلام کو "بے رنگ"

اورنگ زیب قاسمی

قرار دیتا ہے۔ ان امور کو پیش نگاہ رکھیں تو بعینہٖ بیدل کی وجہ سمجھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ جہاں تک شعر میں الفاظ کے مصنوع اور پرپیچ استعمال کا تعلق ہے تو بیدل لکھنوی شعراء سے بڑھ کر لکھنوی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ لکھنوی شعراء کی مانند محض [illegible] تھا بلکہ بیدل نے لفظ برائے لفظ کی بجائے لفظ کا تخلیقی استعمال کیا ہے۔ یوں اس نے ایک طرف تو الفاظ میں معانی کی نئی جہات دریافت کیں اور دوسری طرف مفہوم کی تہہ داری سے گنجینۂ معانی کا طلسم کدہ تعمیر کیا ـــ اس لئے فارسی پرست غالب کے لئے بیدل سے بڑھ کر اور کون آئیڈیل ہو سکتا تھا' اور اگر اس نے صحرائے سخن میں خامۂ بیدل کو عصائے خضر قرار دیتے ہوئے آہنگ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل کا اعتراف کیا تو کچھ غلط نہ تھا۔۔۔ [1]

" ادب کے کسی بھی مسئلہ پر قارئین کو فراموش کر کے بحث نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے عریانی، جنس نگاری یا فحاشی جہاں موضوع اور اسلوب کے مسائل ہیں وہاں یہ قارئین کے بھی ہیں۔ کتاب لکھتے اور چھاپتے وقت تخلیق کار اور ناشر نے یہ نہیں طے کیا ہوتا کہ اسے کس عمر، ذہنی سطح اور طبقاتی حیثیت کے قاری خریدیں اور پڑھیں گے جس طرح ریڈیو اسٹیشن سے پروگرام نشر کر دیا جاتا ہے اور اسے سننے کے لئے اسی مخصوص فریکونسی کے مطابق ہی اپنے ریڈیو کو سیٹ کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح تخلیقات کا معاملہ ہے۔ لکھنے والا، وقت تخلیق، ذہنی کیفیات اور نفسی واردات کے جو ہفت خواں طے کرتا ہے ان کا درست ابلاغ اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب قاری کا ذہن تعصبات، تحریمات، امر و نہی اور اسی قسم کے منفی عناصر سے پاک ہو کیونکہ تحسین ادب میں یہ منفی عناصر ہی سب سے بڑی رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انہی کی بنا پر غلط بحث سے مسائل الجھتے ہیں۔ ادب کا مخاطب انسان ہوتا ہے نہ کہ کوئی عقیدہ، قاعدہ یا نظریہ! " [2]

" انسانی زندگی کی اساس ہی ہیجانات اور پھر ان سے جنم لینے والے جن جذبات و احساسات پر استوار ہے، ان میں شدت اور پھر اثرات کی ہمہ گیری کے لحاظ سے غم یقیناً بے حد اہم قرار پاتا ہے، اور غم بھی وہ جو پیاروں کی موت کا ہو! اس لئے مرثیہ موت سے مشروط ہو کر رہ

---

[1] شعور اور لاشعور کا شاعر ـــ غالب از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ فیروز اینڈ سنز لاہور ص ۱۴۱-۱۴۲

[2] ادب اور لاشعور از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ مکتبہ عالیہ لاہور ص ۱۰۱

گیا ہے۔ اُدھر موت زندگی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے چلتی ہے۔ اس لئے اگر یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا مرثیہ ہابیل کی موت پر حضرت آدمؑ نے کہا تو مرثیے کی رمز سمجھ میں آجاتی ہے۔ اسی لئے انسانی زندگی کے ہر رنگ میں اور تہذیبی ارتقاء کے ہر دور میں محبوب شخصیات کی موت پر مرثیے کہے جاتے رہے ہیں۔“ [1]

”ان اشعار میں فیض نے خارجی زندگی کی تلخیوں کی شدت کو تغزل سے کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے لئے اپنے بعض ہم عصروں کی مانند فیض نے بھی غزل کے مخصوص علائم سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ قدیم اردو غزل نے آج کے جدید غزل گو کو اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو اتنا ضرور ہے کہ گل و بلبل، کنج و قفس، مجنوں و صحرا اور رقیب و محتسب وغیرہ ایسے الفاظ اور ان سے وابستہ تلازمات کے جو سلسلے ملتے ہیں ان کی بنا پر ان الفاظ کے استعمال سے ہر نوع کے معانی کی جہات کے در وا کئے جا سکتے ہیں۔ فیض نے بھی غزل میں اظہار کی اسی صورت سے ہر ممکن طریقے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ فیض اور بعض دیگر غزل گو ترقی پسند شعراء کی غزلوں سے یہ نکتہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ جہاں اپنے پیغام کی ترسیل اور ابلاغ مقاصد کے لئے نظموں میں نئی علامات اور اشارات وضع کئے گئے وہاں غزل میں پرانی علامات اور مقبول اشارات سے بھی کام چلایا۔ چنانچہ فیض نے ایام اسیری کی غزلیات میں غزل کے اس مخصوص اظہار سے وابستہ سہولتوں سے ہر ممکن طریقے سے فائدہ اٹھایا۔ اور فیض کے لئے یہ مشکل بھی نہ تھا کہ ان کا فنی شعور غزل کی کلاسیکی روایات میں یوں رنگا ہے کہ اظہار کی ہر منزل ان کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔“ [2]

”سودا کی پرگوئی اور قادر الکلامی کی یہ دلیل ہے کہ غزل سے وابستہ مخصوص طرز احساس سے عاری ہونے کے باوجود بھی غزل گوئی میں اپنے وقت کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ میر نے انہیں پورا شاعر تسلیم کیا تھا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ مخصوص طرز احساس کے فقدان کی بنا پر کوئی انفرادی رنگ سخن نہیں ملتا۔ دراصل حوادث کا پیدا کردہ الم یا تصوف گداز قلب کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن ان دونوں سے عاری سودا ایک امیر اور خوش فکر کے انداز نے شعراء کی محفل میں آکر اپنے پرجوش الفاظ سے سب کو مبہوت کر کے چلا جاتا ہے۔ بات

[1] جوش کا نفسیاتی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ فیروز سنز لاہور ص ۹۰

[2] ادب اور کلچر ، ، ، مطبوعہ مکتبہ عالیہ لاہور ص ۹۲

اورنگ زیب قاسمی

دل کو نہ لگے مگر کانوں میں گونج ضرور رہتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے ان کے بارے میں درست ہی کہا تھا ”ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا ہے اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز!“ [1]

پہلا اقتباس اس بحث پر مبنی ہے کہ غالب نے طرز بیدل میں ریختہ کہنے کی کوشش کیوں کی؟ اس کے جواب میں سلیم اختر کے پاس جواز موجود تھا۔ تحلیل و تجزیے کی قوت بھی تھی۔ ان تمام امور کا مظاہرہ صاف ستھرے الفاظ میں ہوا ہے۔ کہیں کوئی بات کھٹکتی نہیں، لیکن اس ایک اقتباس میں دو صورتیں ملتی ہیں پہلی صورت تو CLARITY کے ساتھ مسائل کو حل کرنے کی ہے تو دوسری صورت کچھ شگفتہ مزاجی کا بھی مظاہرہ مقصود ہے۔ چنانچہ آخری سطروں میں سلیم اختر نے دو مصرعوں ——

ع عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

اور

ع آہنگ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل

کو نثری قالب پر ڈھال دینے میں ہی لطف محسوس کیا ہے، لیکن اچانک اسلوب بدل جاتا ہے۔ اور نثری سے شاعرانہ بن جاتا ہے۔ چونکہ مسئلہ بیدل اور غالب کا ہے اس لئے اسلوب کا یہ مدوجزر کھلتا نہیں ہے۔ عام قاری یہ سوال کر سکتا ہے کہ ان امور کو سلیم اختر اپنے لفظوں میں بیان کر سکتے تھے لیکن میرے خیال میں یہ مطالبہ غیر ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ دونوں مصرعوں کے پیوند کو PROSE ORDER سے ابہام کی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی تفہیم معنی میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے۔ میں نے پہلے ہی لکھا ہے کہ دلائل کو پیش کرنے میں ڈاکٹر سلیم اختر زیادہ الفاظ صرف نہیں کرتے۔ تواتر سے ایک دلیل کے ساتھ دوسری رکھتے جاتے ہیں اور وہ بھی سامنے کے الفاظ کے۔ ایسی صورت میں اس اقتباس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلیم اختر کو اظہار معنی مقصود ہے نہ کہ اظہار تمکنت علم۔

دوسرا اقتباس یقینی پہلے اقتباس کے مقابلے میں زیادہ صاف اور زیادہ رواں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مسئلہ کسی شاعر کی تحسین یا اس کے موقف کے تجزیے یا کسی فن کار کی ذہنی پیچیدگی کے مطالعے کا نہیں ہے بلکہ خالق اور قاری کے رشتے کا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو بجا طور پر احساس ہے کہ عریانی، جنس نگاری، یا فحاشی جہاں موضوع اور اسلوب کا مسئلہ ہے وہاں قارئین کا بھی۔ ان امور کی وضاحت کے لئے انہوں نے بعض انگریزی

[1] اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ص ۱۰۷

کے الفاظ استعمال کئے ہیں مثلاً ریڈیو اسٹیشن، فریکونسی، پروگرام، ریڈیو، اور سیٹ یہ الفاظ اسلوب کو ناہموار نہیں بناتے بلکہ ضرورت کے عین مطابق ہیں۔ ان کے لئے متبادل الفاظ تلاش کئے جاتے تو شاید مفہوم الجھ کر رہ جاتا۔ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اس پیراگراف میں بھی باتیں مدلل طور پر بیان ہوئی ہیں۔ چونکہ ذہن موضوع کو پوری طرح اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے اس لئے بیان میں ژولیدگی پیدا نہیں ہوئی اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے فن کار کی تحریر ہے جو معاملات کو نہ صرف گہرائی سے سوچتا ہے بلکہ انہیں بیان کرنے پر قادر ہے۔ پورے اقتباس میں کہیں کوئی لفظ ایسا نہیں جو بھرتی کا معلوم ہو۔ نثر نگار نے اپنے مزاج سے موضوع کے مطابق نثری کیفیت کو رواں رکھا ہے۔ چنانچہ جو نکات ہیں وہ پڑھنے والوں کے ذہن میں کلی طور پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔

تیسرا اقتباس ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "جوش کا نفسیاتی مطالعہ" کے مضمون "مرثیہ عہد بہ عہد" سے ماخوذ ہے۔ اس اقتباس سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ لکھنے والے کی منہج نفسیاتی ہے یعنی وہ نفسیاتی مطالعات میں دلچسپی رکھتا ہے ورنہ وہ ہرگز یہ نہیں لکھتا کہ انسانی زندگی کی اساس جن ہیجانات اور پھر ان سے جنم لینے والے جن جذبات و احساسات پر استوار ہے ان میں شدت، اور پھر اثرات کی ہمہ گیری کے لحاظ سے غم یقیناً سب سے اہم قرار پاتا ہے۔ یہاں غم کی نفسیاتی توجیہات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک چیز بہرحال کھٹکتی ہے یعنی جملے کی طوالت۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ کہیں کہیں جہاں نفسیاتی عوامل سے بحث مقصود ہوتی ہے وہاں سلیم اختر کے جملے از خود طویل ہو جاتے ہیں شاید یہ بھی کوئی نفسیاتی پہلو ہو۔ لیکن جملے کی طوالت کے باوجود ذہن پر بوجھ نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ مصنف ہر لمحہ انکشاف معنی کے درپے ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے احساسات و خیالات ترسیل کی ناکامی کا شکار ہوں۔ اس مختصر سے اقتباس میں موت، غم اور مرثیہ کی تثلیث پر بڑی خوبصورتی سے بحث کی گئی ہے۔ خیال تو عالمانہ ہے لیکن خواہ مخواہ کے عالمانہ اظہار سے عاری۔ لہٰذا اس اسلوب کو منفرد بھی کہہ سکتے ہیں اور ممتاز بھی۔ اور یہ دونوں صورتیں پچھلے دو اقتباسات میں بھی موجود ہیں۔

چوتھے اقتباس میں فیض کے نفس شاعری سے گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے ہی جملے میں مصنف کے نفسیاتی پس منظر کا علم ہو جاتا ہے۔ اگر نفسیاتی مطالعے کی آنچ موجود نہ ہوتی تو فیض کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عارضی زندگی کی تلخیوں کی شدت کو تغزل سے کم کرنے کی کوشش کی۔ یہ اقتباس ایک اہم رومانی اور ترقی پسند شاعر کی شاعری کے خدوخال ابھارنے پر مبنی ہے۔ لہٰذا الفاظ عام طور سے ادبی طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ ایسے الفاظ جو آج کل تنقید میں عام ہیں ان کا استعمال کیا

اورنگ زیب قاسمی

گیا ہے۔ لیکن کسی تصنع اور نقل کے بغیر۔ چنانچہ تلازمات، معانی کی جہات، ابلاغ، ترسیل، علامات، اشارات وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس اقتباس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سلیم اختر نئے الفاظ کی عملی تنقیدی صورت سے نہ صرف آشنا ہیں بلکہ انہیں اپنے انداز میں برت بھی سکتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ نقاد ہی کیا جسے نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات کا علم ہی نہ ہو یا وہ لکیر کا فقیر بنا رہے اور فرسودہ لفظوں سے کام نکالنے میں مگن ہو۔

آخری اقتباس ڈاکٹر سلیم اختر کی مشہور کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" سے ماخوذ ہے۔ اور سودا کی پرگوئی اور قادر الکلامی سے متعلق ہے۔ یہاں میں اس امر کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ متذکرہ کتاب ہر چند کہ ادبی تاریخ ہے۔ لیکن اس تاریخ میں تنقید کا عنصر خاصا نمایاں ہے۔ چنانچہ یہ کیفیت یہاں بھی دیکھی اور محسوس کی جاتی ہے۔ لفظ سامنے کے ہیں کوئی جملہ ژولیدہ نہیں۔ ایک فقرے سے دوسرے فقرے کا ربط گہرا بھی ہے اور فطری بھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ مختصر الفاظ میں جامعیت کا ایسا پہلو سامنے آیا ہے جو شاذ و نادر ہی کہیں اور ملتا ہے۔

ان مباحث کی روشنی میں ڈاکٹر سلیم اختر کے نثری اسلوب کے سلسلے میں مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:۔

۱۔۔۔: ڈاکٹر سلیم اختر کے اسلوب کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ مدلل ہوتا ہے۔

۲۔۔۔: اختصار اور جامعیت سلیم اختر کے اسلوب کا خاصہ ہیں۔

۳۔۔۔: سلیم اختر کا اسلوب ہموار اور رواں ہے۔

۴۔۔۔: سلیم اختر کا اسلوب ژولیدگی، ابہام CIRCUMLOCUTION سے پاک ہے۔

۵۔۔۔: ڈاکٹر سلیم اختر کے اسلوب میں نفسیاتی گرہ کشائیاں ہر جگہ ملتی ہیں۔

۶۔۔۔: ڈاکٹر سلیم اختر مرصع اور مسجع عبارت آرائی کی فضول کوشش نہیں کرتے۔ عام طور سے ان کی نثر نثر عاری کہی جا سکتی ہے۔ جس میں MONOTONY نہیں ہے۔ عام طور سے عاری نثر پڑھنے والوں کے ذہن پر اپنی خشکی کی وجہ سے بار بن جاتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر سلیم اختر سامنے کے الفاظ استعمال کرنے کے باوجود ادبی بنے رہتے ہیں۔

۷۔۔۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا اسلوب موضوع کے اعتبار سے بدلتا جاتا ہے وہ اس بات پر قادر ہیں کہ موضوع کا جو مطالبہ ہے اپنی نثر کو اسی قالب میں ڈھال سکیں۔

۸۔۔۔: ڈاکٹر سلیم اختر انگریزی الفاظ کے استعمال سے گریز نہیں کرتے لیکن یہ الفاظ اوپر سے لادے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ فطری طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

۹۔۔۔: سلیم اختر کے یہاں عجز بیان نہیں ہے۔

۱۰۔۔۔: ڈاکٹر سلیم اختر کا اسلوب اپنے لہجے اور آواز کے اعتبار سے صاف پہچانا جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اسلوب پر ان کی شخصیت کی چھاپ نمایاں ہے۔

تنقیدی دبستان

ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید نگاری اور اس کی معنویت کے کتنے ہی پہلو سامنے آچکے ہیں۔ دوسری کتابوں پر پچھلے صفحات میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ یہاں میں ان کی ایک معروف کتاب "تنقیدی دبستان" کا جائزہ لے رہا ہوں۔ یہ اس لئے بھی کہ مختلف دبستانوں کے بارے میں ان کی رائے معلوم ہو تاکہ ان کی تنقید کی معنویت کا احاطہ کرنے میں قدرے آسانی ہو۔

تنقیدی دبستان ڈاکٹر سلیم اختر کی ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہے اور ایک اہم کتاب ہے۔ اہم کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ یہ اپنے طرز کی اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں دنیا بھر میں رائج ہونے والے مختلف دبستانوں کا خاکہ اور پس منظر ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ طالب علموں کے ساتھ ساتھ تشنگان علم کے لئے بھی یہ ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں اس لئے کہ مختلف دبستانوں کے مطالعہ کے لئے انہیں اردو اور انگریزی کی مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا تب جا کر انہیں مختلف دبستانوں کا علم ہو پاتا۔ بعض بعض دبستانوں کے متعلق تو مواد آسانی سے مل جاتے ہیں جیسے مارکسی دبستان، جمالیاتی، اور نفسیاتی دبستان۔ لیکن اس کتاب میں مختلف اسکولوں کا ایک اجتماع ہے اور آنکھیں حیران رہ جاتی ہیں کہ یا اللہ ادب کا مطالعہ کرنے کے لئے نقادوں نے کتنے پیمانے مرتب کئے ہیں۔ ہر اسکول کا نقاد یہ کہتا ہوا ملتا ہے کہ اصل دبستان یہی ہے جو آپ پڑھ رہے ہیں۔ لیکن یہ تو اپنی اپنی پسند ہے کوئی مارکسی دبستان کو پسند کرتا ہے تو کوئی تاثراتی اسکول کے نقادوں کا گرویدہ ہے۔ لیکن موٹے طور پر دیکھا جائے تو دو ہی اسکول صحیح معنوں میں ہیں جن میں ایک مارکسی اسکول اور دوسرا جمالیاتی یا تاثراتی اسکول۔ ہاں اس اسکول کی مختلف شاخیں ضرور ہیں۔ جو آگے چل کر ایک نئے اسکول کی شکل میں ابھرا ہے۔

پروفیسر حمید احمد خان نے دیباچہ میں لکھا ہے:

"میرے دوست پروفیسر سلیم اختر ملک کے نوجوان نقادوں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر چکے ہیں ان کے مقالات جو چند سال سے ہمارے ادبی رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں ایک وسیع حلقۂ ناظرین میں معروف و مقبول ہیں۔ گذشتہ سال میں نے ان کی مختصر

اورنگ زیب قاسمی

تاریخ ادب اردو بہت دلچسپی سے دیکھی اور مقام مسرت ہے کہ اب تنقید کے متعدد اور مختلف مسالک پر ان کا یہ تبصرہ اہل علم کی ایک اور اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے شائع ہو رہا ہے۔

ہماری اپنی صدی میں ادب اور تنقید کو وہ بین الاقوامی مفہوم پہلی مرتبہ ملا ہے۔ جو ان دونوں کے عالمگیر ذاتی و تہذیبی منصب کے شایان شان ہے۔ دراصل تمام فنون لطیفہ بنی نوع انسان کی مشترک میراث ہیں اور اس میراث سے بہرہ اندوز ہونا ہم سب کا فطری حق ہے۔ تاثراتی تنقید ہو یا نفسیاتی، جمالیاتی ہو یا عمرانی اسے کسی خاص ملک یا قوم کے نظریات تک محدود رکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اب یہ خواہش بجا طور پر عام ہو گئی ہے کہ وہ ہر ادبی تحریک جس نے انسانوں کی کسی جماعت کو مضطرب کیا ہو، اس کا مطالعہ اس تحریک کے نبض شناسوں کی تشریحات کی روشنی میں کیا جائے۔

عالمی ادب سے جو ہم سب کا ادب ہے صحیح رابطہ اس صورت میں قائم ہوتا ہے کہ طالب علم مختلف مسالک تنقید کے بنیادی تصورات سے آگاہ ہو۔"[1]

صحیح تو یہ ہے کہ علم کی وسعت کا اندازہ اسی سے ہو گا کہ اہل علم دنیا کی تہذیبوں، علمی اور ادبی قدروں سے بہتر طور پر آگاہ ہوں، تاکہ اپنے ادب کے مقابلہ میں اور مطالعہ میں انہیں اندازہ ہو سکے کہ ہمارا ادب عالمی ادب کے مقابلہ میں کہاں پر کھڑا ہے۔

"تنقیدی دبستان" کی شان نزول خود مصنف کے الفاظ میں:

"۱۹۶۴ء میں گورنمنٹ کالج ملتان میں ایم۔ اے۔ اردو کے آغاز پر مجھے تنقید کا پانچواں پرچہ پڑھانے پر معمور کیا گیا۔ جب نصاب کے نقطۂ نظر سے کتب تنقید پر نگاہ ڈالی تو سخت مایوسی ہوئی کہ ایک بھی ایسی کتاب نہ ملی جس میں تنقید کے اہم ترین دبستانوں پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ ہمارے یہاں مشہور ناقدین کا ان کی انفرادی حیثیت میں مطالعہ تو ملتا ہے۔ لیکن ہم آراء ناقدین کے نظریات سے جنم لینے والے مختلف تنقیدی دبستانوں کے بارے میں بطور خاص نہ لکھا گیا۔ نتیجتاً کسی راہنمائی کے بغیر کام شروع کر دیا۔ نوٹس بنائے اور کام چل نکلا اور اتنا چلا کہ نوٹس کتابی صورت میں چھپوانے کی فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے اُن کا "نوٹس پن" ختم کر کے باقاعدہ مقالات کی صورت میں از سر نو قلمبند

---

[1] تنقیدی دبستان از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ آزاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۔ ۱۹۸۲ء دیباچہ پروفیسر حمید احمد خاں ص ۶

کیا۔ ان صاحب کی فرمائش تھی۔ مسودہ کی تکمیل تک وہ کتاب کی اشاعت کے قابل نہ ہے۔ چنانچہ یہ مقالات مختلف ادبی جرائد اور اخبارات میں طبع ہو کر ادبی اور امتحانی لحاظ سے خاصے پسند کیے گئے۔

گو یہ تمام مقالات انفرادی حیثیت میں قلمبند کیے گئے تھے لیکن معنوی ربط کی بنا پر تمام کتاب میں تسلسل برقرار رہتا ہے۔" لہ

اب اگلے صفحات میں ہم اس امر پر غور کریں گے آخر دبستان ہے کیا اور اس کا تعلق ادب سے کیوں کر ہے اور اگر ادب میں اس کا اطلاق ہوا تو وہ کس طرح بروئے کار آیا اور کس طرح اپنی ادبی شناخت قائم کر سکا۔ تنقید اور دبستان کے عنوان سے خود مصنف نے لکھا ہے:

"مختلف تنقیدی دبستانوں کے مطالعہ سے پیشتر اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر دبستان ہے کیا؟ وہ کن عوامل سے معرض وجود میں آتا ہے اور اس کی ضرورت کیوں محسوس کی جاتی ہے؟ تو ایسے اور اس نوع کے دیگر سوالات بے محل نہ ہوں گے۔

پہلے سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں کسی بھی نظام فکر سے وابستہ افراد اور ان کی ذہنی کاوشوں کو "دبستان" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسرے سوال کا جواب اتنا مختصر یا آسان نہیں۔ کیونکہ اس کے لئے ان تمام عوامل اور محرکات کا تجزیہ کرنا ہوگا جو کسی نہ کسی طور سے ادبی تخلیقات کی تشکیل میں ممد اور اثر انداز ہو سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس نزاعی امر کا بھی تعین کرنا ہوگا کہ کیا تنقید کے لئے کسی مخصوص نقطۂ نظر کی ضرورت ہے بھی؟ یا تخلیق کار کو فضائے تخلیق میں کسی آزاد پنچھی کی طرح چھوڑ دیا جائے۔

دبستان کی تخلیق کے دو اسباب بہت اہم ہیں ایک تو کسی علمی نظریے کا اثر جس سے اس کے دوسرے پہلو کا ادبی تحریک کی بھنوائی میں بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے کسی مسلّم ادبی نظریے یا ادبی تحریک کے خلاف ردعمل کا اظہار جو انفرادی سطح سے بلند ہو کر بعد ازاں ایک باقاعدہ نظریہ یا تحریک کا روپ دھار لیتا ہے۔

جب علمی انکشافات اور فلسفیانہ نظریات عصر حاضر پر اس طریقہ سے اثر انداز ہوں کہ ان کی چھاپ ہر شعبۂ حیات میں دیکھی جا سکتی ہو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ادب ان سے بچا رہے۔ اس لئے جب عصر حاضر کی ترجمانی کے اہم فرائض سے عہدہ برآئی کے

لہ تنقیدی دبستان از ڈاکٹر سلیم اختر پیش لفظ ص ۸۔۷ اعجاز پبلشنگ ہاؤس دہلی [illegible]

اورنگ زیب قاسمی

نئے ادب کا انداز بدلے تو پھر تنقید کے معائر بھی بدلتے ہیں اور نہیں تو کم از کم اس مخصوص نوعیت کے ادب کی پرکھ ہی کے لئے ہی۔ جیسے مارکسی تنقید۔ علاوہ ازیں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی علمی نظریے کی ہمہ گیری ہی ایک نئے تنقیدی انداز کا محرک بنتے ہوئے نئے دبستان کی تشکیل کا باعث بن جاتی ہے۔ اس سلسلے میں نفسیاتی تنقید کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ان دونوں دبستانوں کی تشکیل میں نازک فرق ہے۔ اشتراکیت کا نظریہ محض کتابی نوعیت ہی نہیں رکھتا بلکہ زندگی معاشرہ، اقتصادیات اور ادبیات کے بارے میں فکر کے نئے پیمانے مہیا کرتا ہے۔ اس نظریے نے پہلے اذہان میں اور بعد ازاں مملکتوں میں انقلابات پیدا کئے۔ یوں ادب نے بھی مساواتی جدلیات کی روشنی میں خود کو تبدیل کیا تو مارکسی کا دبستان وجود میں آیا۔ اس کے برعکس نفسیاتی اہمیت کی تخلیقات فرائڈ یا دیگر ماہرین نفسیات کی تعلیمات سے پہلے بھی تھیں۔" لہ

دراصل یہ تو دو دبستانوں کا مختصر تعارف تھا کہ آخر دبستان کس طرح عالم وجود میں آتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کئی دبستان ہیں جن کی نشاندہی اس کتاب میں کی گئی ہے۔ جس سے قاری کو خاطر خواہ فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد تشنگی دور ہو جاتی ہے اور یہ خیال باقی نہیں رہتا کہ آخر تنقیدی دبستانوں کے وجود کا مقصد کیا تھا۔ اور کیا ہے؟ فرداً فرداً تمام ادبی اور تنقیدی اسکول پر یہاں لکھنا صفحات اور وقت کی کمی کے باعث بس اتنا سمجھ لیجئے کہ جس دبستان کے بارے میں آپ جاننا چاہیں گے یہاں موجود پائیں گے۔

تنقید اور تاریخ

کتابوں کی فہرست ترتیب دینا الگ بات ہے لیکن کتابیات تیار کرنا ایک بالکل ہی دوسری بات ہے اور ملک پاکستان کے اردو داں کے لئے خاصی اہم شے ہے۔ اس لئے پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں کے پبلیشرز کا کیٹلاگ تو فرداً فرداً دستیاب تھا۔ لیکن پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں کا مکمل کیٹلاگ دستیاب نہیں تھا اور اس اہم کام کو ڈاکٹر سلیم اختر نے انجام کار تک پہنچایا۔ وہ لکھتے ہیں:

لہ تنقیدی دبستان از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۱-۱۰

"اقوامِ متحدہ کے ادارہ یونیسکو نے ۱۹۷۲ء کو بین الاقوامی سال کتاب قرار دیا ہے۔ اور عالمی پیمانے پر کتابوں کی طباعت اشاعت اور فروخت سے وابستہ فنی امور کا جائزہ لیا جائے گا۔ پاکستان میں بھی مرکزی وزارت تعلیم کی سرکردگی میں نیشنل بک سینٹر نے ایک جامع منصوبہ کی تشکیل کی ہے' اس ضمن میں جہاں اور بہت کچھ ہونا ہے وہاں مختلف اصحاب پاکستان میں مطبوعہ اردو کتب کی بلحاظ موضوع کتابیات بھی مدون کر رہے ہیں۔

میری یہ کاوش بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ کاوش اس لحاظ سے اپنی نوعیت کی اولین بھی ہے کہ اس سے قبل ادبی تنقید و تحقیق کی ملک گیر سطح پر ایک جامع کتابیات مرتب کرنے کی کوشش نہ کی گئی تھی۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو ہمارے ہاں کتابیات کا سرے سے تصور ہی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے فضل سے پاکستان میں لائبریری اور کتابوں کے بارے میں ہر نوع کی سائنسی معلومات کا فقدان ہے۔ جس ملک میں لائبریریوں کی کثیر تعداد تربیت یافتہ لائبریرین کے بغیر صرف کلرک چلا لیتے ہوں اور جہاں کے اکثر پڑھے لکھے لوگوں کو کیٹلاگ کا استعمال نہ آتا ہو۔ وہاں دیگر کوتاہیوں اور خامیوں کا گلہ ہی کیا ہے۔" [۱]

ملک گیر پیمانے کا کیٹلاگ مرتب کرنا آسان نہیں اس کی دشواریوں کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس کام میں لگا ہے۔ ہندوستان کی صورت حال پاکستان ہی کی طرح ہے خاص طور سے لائبریری اور کتابوں کی ایک جامع فہرست تیار کرنے کے لحاظ سے یہ کام ایسا ہے کہ اب ایک بڑے پروجکٹ کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کام کے لئے زر کثیر خرچ کرنے کی ضرورت ہے اور اس لئے یہ کام سرکاری معاونت سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں اردو کی تو چھوڑ دیجئے اس لئے کہ اس مقبول عام زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہے' ہندی یا انگریزی زبانوں کی کتابوں کا بھی اگر ملک گیر کیٹلاگ تلاش کریں تو نہیں ملے گا اس کی کئی وجہیں ہیں پہلی وجہ یہ کہ سرکاری ذرائع علم اور تعلیم پر کوئی خرچ نہیں کرنا چاہتی' اور دفاعی خرچ کچھ زیادہ ہے۔ سالانہ بجٹ میں سب سے کم خرچ تعلیم پر رکھا گیا ہے۔ اور اس لحاظ سے کوئی بڑا علمی کام ہندوستان میں بھی نہیں ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے یہ کتابیات ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۲ء تک پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں کا جائزہ

---

[۱] تنقید اور تاریخ ادب: مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر ۱۹۷۲ء مطبوعہ نیشنل بک سینٹر پاکستان ص ۷

اورنگ زیب قاسمی

اور اس کی ایک جامع بلکہ مکمل فہرست تیار کی ہے اور مزید برآں یہ کہ یہ کتابیات اردو زبان کی کتابوں تک محدود ہے۔ اس کتابیات کو شائع ہوئے بھی پندرہ سولہ سال کے قریب ہو چکے ہیں۔ اندازہ ہے پاکستان میں ان پندرہ سولہ برسوں کے اندر کچھ اور نئی کتابیں اشاعت پذیر ہوئی ہوں گی۔ لیکن ہم لوگوں تک ابھی نہیں پہنچی ہیں۔ کم از کم کتابیات ہی کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اس پر روشنی ڈالی ہے:

"اردو میں کتابیات کی ترتیب کا رجحان کچھ زیادہ قدیم نہیں۔ خصوصی موضوعات پر فہرست سازی تو اور بھی کمیاب ہے۔ سلیم اختر صاحب نے اردو تنقید اور تحقیق سے متعلق کتب کی فہرست بنانے کا ڈول ڈالا ہے۔ اگرچہ اردو کی سال بسال کتابیات کی روایت کا آغاز تجارت سے ہو چکا ہے لیکن یہ فہرست اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے اہم ہے کہ اس میں اردو تنقید اور اردو تحقیق پر شائع ہونے والی صرف ان کتابوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۲ء کے درمیان پاکستان میں شائع ہوئی ہیں۔ خصوصی موضوعات پر شائع ہونے والی کتابیات میں ہر چند کہ غالب کے سلسلے میں طبع ہونے والی کتابیات کو اولیت حاصل ہے۔ لیکن یہ فہرست اس لحاظ سے زیادہ وقیع ہے کہ اس کے موضوعات کا دائرہ ادب کے ان "رقبوں" سے تعلق رکھتا ہے' جو اردو ادب کے لئے بمنزلہ اساس ہیں۔" [۱]

اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر سلیم اختر کا کام بڑا وقیع ہے۔ انہوں نے تنقید' اصناف کا تعارف' نقد' تنقیدی مقالات' تراجم' تذکرے' تحقیق' لسانیات' صرف و نحو' عروض' اقبالیات اور غالبیات سے متعلق بڑے عظیم سرمائے کا اشاریہ اس "تنقید و تاریخ ادب" میں جمع کر دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر وحید قریشی:

"اردو تنقید میں ظہور پاکستان کے بعد سے فکر و نظر کے جو مختلف دبستان وجود میں آئے ان کی نشاندہی اس کتابیات سے بخوبی ہوتی ہے اس کے علاوہ ہماری تنقید جس بحران' عدم توازن اور خلفشار کا شکار رہی اس کی تصویر بھی اس کے آئینے میں ملتی ہے . . . . اردو تحقیق کے بارے میں پاکستان میں کیا کچھ ہوا؟ اور اس کام کی رفتار اور مقدار کیا رہی؟ اس کی تفصیل بھی کتابیات میں پائی جاتی ہے . . . . . .
اردو تنقید و تحقیق کی یہ کتابیات اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں لائبریری سائنس کے اصولوں کو پہلی بار کتاب کے تار و پود میں پوری دیانتداری کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔

---

[۱] تنقید اور تاریخ ادب: مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ نیشنل بک سینٹر پاکستان ۱۹۷۲ء ص ۱۱

سلیم اختر صاحب ادیب ہی نہیں لائبریری سائنس پر بھی عبور رکھتے ہیں ان کی کتابیات نیشنل بک سینٹر کی پرانی کتابی فہرستوں کے مقابلے میں زیادہ سائنٹفک ہے۔ اب ایک عام قاری اور پختہ کار ادیب دونوں اس سے بخوبی کام لے سکتے ہیں۔[1]

اس طرح یہ کتابیات تنقید اور تحقیق کے علاوہ بھی کئی اصناف ادب پر محیط ہے۔

---

[1] تنقید اور تاریخ ادب: مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ نیشنل بک سینٹر پاکستان ۱۹۷۲ ص ۱۱ - ۱۲

اورنگ زیب قاسمی

ساتواں باب

سلیم اختر کی تنقید کی معنویت

پچھلے صفحات میں ڈاکٹر سلیم اختر کی متعدد کتابوں کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ موصوف کا ذہن خاصا متنوع ہے۔ موضوعات کے تنوع کا احساس تو اسی وقت ہو جاتا ہے جب ان کی نگارشات پر ایک سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے۔ لیکن موضوعات کا تنوع بذات خود بہت اہم نہیں۔ اہم یہ ہے کہ فن کار نے کس طرح انہیں برتنے کی کوشش کی ہے۔ اور گہرائی اور گیرائی کے کتنے ہفت خواں طے کیے ہیں۔ ان باتوں کی تفہیم سے پہلے یہ جان لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ متعلقہ فن کار کا غالب رجحان کیا ہے۔ اور فکر کی کیا نہج ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے خود لکھا ہے:

"جب میں نے نفسیات کی روشنی میں تنقید کا آغاز کیا تو ایک مقصد خاص رکھ کر یعنی ادب اور اس سے وابستہ اہم مسائل اور تخلیق اصناف کا نفسیات کی روشنی میں یوں تجزیاتی مطالعہ کیا جائے کہ اس تنوع کی وحدت کا احساس اجاگر ہو جائے۔ بظاہر یہ ادبی مسائل اور اصناف کے عنوانات تلے جمع کیے گئے متفرق مقالات ہیں۔ کچھ طویل تو کچھ مختصر لیکن انفرادی حیثیت میں مکمل ہونے کے باوجود پہلے مقالے کا دوسرے مقالے سے معنوی رابطہ برقرار رہتا ہے۔ یوں ایک موضوع کی کتاب بن جاتی ہے۔ موضوع ہے ادب اور لاشعور اور ان کی باہمی اثر پذیری سے جنم لینے والے تنوع کے سلسلہ در سلسلے۔

مجھ سے پہلے اور مجھ سے بہتر ناقدین ادب اور ادبی مباحث کی تحلیل و تشریح کے کام سے بطریق احسن عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ سو ان کی کاوشوں کے احترام کے اس اعتراف کے بعد یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اس کتاب کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ ہونا چاہیے کہ پہلی مرتبہ ایک مخصوص نظریہ کی روشنی میں تمام ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے اہم ترین ادبی سوالات کے ایک ہی نظریہ کی روشنی میں جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لاشعور کس طرح تخلیقی محرک بنتے ہوئے تخلیقی عمل کو ایک مخصوص رنگ میں رنگتا ہے اور پھر مختلف ذاتی رجحانات اور نفسی میلانات کس طرح سے انفرادی روپ (تخلیق) اور اجتماعی صورت

(صنف) اختیار کرتا ہے۔ یہ سب واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یوں "ادب اور لاشعور" نفسیاتی نظریہ کی ادبی تاریخ بھی بن جاتی ہے اور تمام ادب پر ایک نظریے کے اطلاق کی اہم کوشش بھی۔" ؎

یہ اقتباس ڈاکٹر صاحب کی کتاب "ادب اور لاشعور" کے پیش لفظ سے ہے۔ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ موصوف نے اپنے ادبی نقطۂ نظر کی کس طرح وضاحت کی ہے۔ اس پر مزید کچھ لکھنا لاحاصل معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی دو باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ پہلی تو یہ کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی تنقید کا آغاز نفسیات کی روشنی میں کیا۔ دوسرے یہ کہ نفسیاتی تجزیاتی مطالعہ کسی ادیب کے شعور اور لاشعور کی تفہیم میں نہ صرف معاون ہے بلکہ کس طرح تخلیقی محرک بن کے تخلیقی عمل کو ایک واضح رنگ عطا کرتا ہے۔ اس کی پہچان اس سے ہوتی ہے۔ ان دونوں صورتوں سے آج ہم بخوبی آشنا ہو چکے ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر کے امتیازات واضح اور روشن ہیں۔ میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ انہوں نے اپنی نگارشات کا بیشتر حصہ شعرا اور ادبا کی نفسیاتی تحلیل اور ان کے شعر و ادب کے نفسیاتی پیچ و خم کے مطالعے میں صرف ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ بہت کم نقادوں نے اتنی گہرائی اور گیرائی سے تنقید کے نفسیاتی دبستان کو اپنی عملی کاوش سے فروغ دینے کی کوشش کی۔ ہندو پاک کے ان نقادوں کو ذہن میں رکھئے جو شعر و ادب کے معنی و مجاز کو نفسیاتی تناظر میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک نظر میں یہ معلوم ہو جائیگا کہ نفسیاتی نقاد تو اردو میں موجود ہیں لیکن ان کے یہاں نہ تو سلیم اختر کا تنوع ہے نہ مطالعہ نہ گہرائی۔ یہ کام انہوں نے تین شقوں میں کیا ہے۔ پہلی شق نفسیات کی فی نفسہٖ مفہوم کی وضاحت ہے اور پھر اس علم کے جتنے قابل لحاظ تناظر ہو سکتے ہیں ان کی گرفت پھر شعر و ادب میں ان کا اطلاق بھی ہے۔ چنانچہ سلیم اختر کی جگہ نہ صرف نفسیاتی نقادوں میں محفوظ ہے بلکہ ممتاز و منفرد ہے۔

تخلیق اور لاشعوری محرکات کی بحث میں وہ قدیم یونانی فلاسفروں کے افکار، یورپ میں نفسیاتی تجربہ گاہ اور اس تجربہ گاہ سے پیدا ہونے والے نتائج وغیرہ کی ضمنی بحث کے بعد موصوف فرائڈ کی تحلیل نفسی کے تمام امور کا بطریق احسن احاطہ کر لیتے ہیں۔ پھر تخلیق کے نفسیاتی عمل کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان امور کی صراحت میں وہ بعض مشکل سوالات اٹھاتے ہیں۔ پھر ان کے جوابات مختلف ماہرین کے حوالے سے دیتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ ڈاکٹر سلیم اختر کسی چیز کو مبہم چھوڑنا نہیں چاہتے اور وہ اپنے موضوع کی باریکیوں میں اتر کر تمام تر الجھے ہوئے معاملات واضح اور صاف اسلوب میں سلجھا دیتے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھئے:

"فرائڈ کی نفسیات میں لاشعور کو جو اساسی حیثیت حاصل ہے اس کی وضاحت

اورنگ زیب قاسمی

کے لئے بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ فرائڈ کے نظام فکر میں لاشعور کو وہی حیثیت حاصل ہے جو نظام شمسی میں سورج کو۔ گو ژونگ اور بعض اور نفسیات دانوں نے بھی لاشعور کے وجود سے انکار نہیں کیا بلکہ ژونگ نے تو اجتماعی لاشعور کے نظریہ کی صورت میں لاشعور کے تصور کو اس کی منطقی انتہا تک پہنچا دیا۔ لیکن طویل ترین وضاحت تک لکھی گئی متنازعہ فیہ تحریروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب فرائڈ اور لاشعور جام و مینا کی مانند لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ شاید اسی لئے ابھی تک لاشعور کی دریافت کا سہرا فرائڈ کے سر بندھتا ہے حالانکہ لانسلاٹ لاوائٹ کی تحقیقی کتاب THE UNCONSCIOUS BEFOR FREUD کے مطالعے سے حقیقت اس کے برعکس نظر آتی ہے۔

تحلیل نفسی کے بموجب تخلیق (یا کوئی بھی فنی روپ) ناکام آرزوؤں کا ارتفاعی روپ ہے۔ یہ لاشعور کے نہاں خانوں میں دبی ہوئی خواہشات کے اظہار کی کشمکش سے نجات پانے کا ایک انداز ہے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں جو ہیجانات جنم لیتے ہیں لاشعور انہیں ایک خاص نہج پر رکھتے ہوئے اور ایک سمت عطا کرتے ہوئے جمالیاتی پیکروں میں رونما کرتا ہے۔ اس عمل میں بعض ایسی خصوصی چیزیں ہوتی ہیں جنہیں صرف فنکارانہ ذہن ہی سے مخصوص قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ فنکارانہ تحریک محض ایک خاص نوع کی مسرت کے حصول کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ درد و کرب سے بھی مملو ہوتی ہے۔ تخلیق کار کی یہ ایک اہم ترین خصوصیت نظر آتی ہے کہ فن کار کسی پراسرار طریقے سے اپنے لیے پریشانی، خوف، اداسی اور کراہت والی چیزوں کو ایسا پیکر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے باعث حظ بن جاتی ہیں۔"

یہ سطور سلیم اختر کے ایک مضمون "تخلیق اور لاشعوری محرکات" ہی سے نقل کئے گئے ہیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موصوف نے چند سطروں میں کس طرح فرائڈ اور ژونگ کی کارکردگی میں حد فاصل قائم کر دی ہے۔ اور دونوں کی اہمیت میں فرق واضح کرنا ہے اس کا بھی شعور عطا کر دیا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ سلیم اختر بہت کم الفاظ میں بڑی الجھی باتوں کا تجزیہ کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں اختصار اور جامعیت کا پہلو ہر جگہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال پر متعدد کتابیں ترتیب دی ہیں ان کی تصنیف کردہ ایک کتاب "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ہے۔ موصوف نے اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کی مختلف جہات کا احاطہ انتہائی فکر انگیز تجزیاتی رویے سے کیا ہے۔ ایک طرف تو ان کی شخصیت کے بعض گوشوں پر نفسیاتی روشنی ڈال کر انتہائی سنجیدگی سے ان کی زندگی کے بعض پیچیدہ مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ دوسری طرف فکر و فن میں ایسے ایشوز اٹھائے ہیں جو واقعی نہ صرف قابل مطالعہ رہے ہیں بلکہ جن پر توجہ کرنی ہی چاہئے تھی۔ کیا اقبال نرگسی تھے؟ اقبال کی پہلی شادی اور خانگی

زندگی کا مسئلہ شخصیات کے وہ پہلو ہیں جن پر لکھنا سخت جان لیوا ہے۔ اسی طرح فکر و فن کی بعض جہتیں مطالعے میں آئی ہیں۔ ان کے بھی امتیازات نئے نمایاں ہیں کہ اکثر لوگوں نے پذیرائی کی ہے۔ یہاں انتظار حسین نے اس کتاب کے بارے میں چند جملے رقم کیے ہیں ان کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ لکھتے ہیں:

"سلیم اختر کا ایک شوق نفسیات بھی ہے۔ اپنے اس شوق میں انہوں نے علامہ اقبال کو موضوع بنایا۔ ان کی نجی زندگی میں تھوڑی سی تاک جھانک کی اور حکیم الامت اور مرد قلندر کے غلافوں میں سے ایک اور آدمی نکالنے کی کوشش کی جو ان کی دانست میں اصلی آدمی ہے۔"

مجھے اس سے بحث نہیں کہ انتظار حسین نے "شوق" "تھوڑی سی تاک جھانک" ان کی دانست میں جیسے الفاظ کیوں استعمال کیے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سلیم اختر علم نفسیات میں ڈوبے ہوئے ایک شخص ہیں۔ انہیں اپنے موضوع کی تاک جھانک میں دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کی رگ و پے میں اترنا چاہتے ہیں۔ پھر اپنا کام پیش کرتے ہیں۔ اس لئے مجھے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی اس بات سے اتفاق ہے کہ:

"اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ڈاکٹر سلیم اختر کی معرکتہ الآرا اور متنازعہ فیہ کتاب ہے۔ خاص طور پر اقبال کا جو نفسیاتی مطالعہ انہوں نے کیا ہے اس پر خاصی تنقید بھی ہوئی اور اسے خاصا سراہا بھی گیا۔ اس طرح اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس لئے بھی کہ اس میں اقبال کا نفسیات کے حوالے سے پہلی بار کھل کر مطالعہ کیا گیا ہے اور وہ بھی بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ۔"

دراصل خود سلیم اختر کی نفسیات یہ ہے کہ جس موضوع کو چھوتے ہیں اس کے تمام امکانات کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر تصنیف و تالیف کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ موصوف کے شعور اقبال کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ مسلسل اس موضوع سے نپٹتے رہے یہاں تک کہ اقبال ممدوح عالم جیسی کتاب بھی مرتب کی تاکہ تفہیم اقبال کا عالمی تناظر واضح اور نمایاں ہو جائے اور اقبال کی اسٹڈی کی نئی نئی راہیں کھلنا شروع ہوں وہ خود لکھتے ہیں:

"ہوا یہ کہ ایک دن اپنے محترم احمد ندیم قاسمی کہنے لگے کہ بزم اقبال کے لئے ہمیں کوئی کتاب مرتب کر دو۔ میرے ذہن میں پہلے سے ہی ایک ایسی کتاب کا منصوبہ تھا۔ جس میں علامہ اقبال کے فکر و فن کی بین الاقوامی تحسین اور غیر ممالک میں اقبال شناسی کی روایات کے نقوش کا سراغ لگایا ہو۔ قاسمی صاحب نے یہ خیال بہت پسند کیا۔ اس کے بعد جب بزم اقبال

اورنگ زیب قاسمی

کی مجلس مشاورت نے کتاب کا خاکہ دیکھا تو انہوں نے بھی بے حد سراہا۔ بالخصوص محترم جسٹس جاوید اقبال صاحب نے تو نام اور مندرجات دونوں کی بہت تعریف کی۔ یوں حوصلہ افزائی سے مجھ میں کام کرنے کی لگن اور بھی بڑھ گئی۔"

تو واضح ہوا کہ ڈاکٹر سلیم اختر بنیادی طور پر ایک نفسیاتی نقاد ہیں لہٰذا اگر انہوں نے اس پس منظر میں دوسرے شعرا اور ادبا کو بھی دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ "موصوف کی ایک کتاب ہے "جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین" اس میں کم از کم پانچ مضامین ایسے ہیں جن کی عقبی زمین نفسیات ہے۔ مثلاً "جوش کا نفسیاتی مطالعہ" کیا جنون کر گیا شعور سے "مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب فلسفۂ الٰہیات کا نفسیاتی مطالعہ"، "اپنی لگن اپنی جلن اور اپنی چبھن کی مستی" "جمیل الدین عالی" "ادب اور لوک ادب نفسیاتی تناظر" اور "اناالحق" یہ سب کے سب قیمتی مضامین ہیں اور اپنا ایک واضح مزاج رکھتے ہیں۔ ایسے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی حقیقی شناخت نفسیاتی نقاد ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں کہ موصوف نے کوئی دوسرا محاذ سنبھالا ہی نہیں"۔ "جوش کا نفسیاتی مطالعہ" جیسی کتاب میں بھی ایسے مضامین ملتے ہیں جن کا تعلق نفسیاتی انداز نظر سے نہیں ہے۔ خالص ادبی نقطۂ نظر سے مولانا حالی، مولانا ظفر علی خاں، نیاز فتحپوری اور مجید امجد کے فکر و فن کا بطریق احسن مطالعہ کیا گیا ہے۔ ایک الگ مضمون میں مرثیے کے ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔ پھر اردو ادب کی تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مجھے بس یہاں یہ کہنا ہے کہ سلیم اختر جس میدان میں بھی ہوتے ہیں اپنی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا نفسیات غالب عنصر ہونے کے باوجود ان کے بعض مطالعات انتہائی وزنی اور قیمتی ہیں۔ مثال کے طور پر صنف انشائیہ ہی کو لے لیجئے۔ موصوف کی ایک کتاب ہے "انشائیہ کی بنیاد" اس پر پچھلے اوراق میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہاں میں اس کتاب کے بارے میں دو افراد کی رائے نقل کر رہا ہوں۔ میری مراد صلاح الدین حیدر اور سید مشکور حسین یاد سے ہے۔ حیدر لکھتے ہیں:

"سلیم اختر نے انشائیہ کی اصطلاح سے بھی بحث کی ہے اور آغاز میں ہی شیکسپیئر کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ گلاب کو کسی نام سے پکارو اس کی خوشبو وہی رہے گی۔ اس حوالے سے سلیم اختر صاحب نے زندگی سے بھرپور انشائیہ تحریروں کو سراہنے کے علاوہ انشائیہ لفظ کے ماخذوں سے بھی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور آدم شیخ کے حوالے سے انہوں نے بتایا ہے کہ انشائیہ کا آغاز عرصے پہلے ہوا تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے نیاز فتحپوری، سید جعفر، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، اور سید محمد حسنین کے حوالے پیش کیے ہیں۔ انہوں نے فیض احمد فیض کا حوالہ بھی دیا ہے کہ "انشائیہ کی صنف چالیس سال سے پہلے بھی موجود تھی۔ اس وقت

اسے "انشائے لطیف" کہا جاتا تھا۔ غرض بے شمار حوالوں سے انہوں نے انشائیہ کی اصطلاح سے بحث کی ہے۔ انشائیہ کی مبادیات میں انہوں نے تخلیق کار کے نفسی میلان سے بحث کی ہے یہاں توقع تھی کہ سلیم اختر صاحب انسانی ذہن کے ردِ عمل سماج کی جڑوں سے ٹٹولیں گے۔ لیکن انہوں نے محض انسانی ذہن کو مدِ نظر رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "انشائیہ ایک مہذب ذہن کی پیداوار ہے اور مہذب قاری ہی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے" سوال یہ ہے کہ مہذب ذہن اور مہذب قاری کیا ہوتا ہے؟ "مہذب" کی طبقاتی بنیادیں نہیں ہوتیں؟ تیسری دنیا کے معاشروں میں زخموں اور بدبختیوں سے چور ذہن زہرناکی اور تلخی سے بھی بھر جاتا ہے اور اس کا انشائیے کے حوالے سے ہماری سماجی صورت میں بھی جواز ہے۔"[1]

یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ انشائیہ کی مبادیات میں نفسی کیفیات کا احاطہ کرنا بالکل صحیح تناظر ہے۔ نفسی کیفیات کو سماج کی کشمکش یا اس کی مختلف صورتوں یا جڑوں سے الگ کرنا درست نہیں۔ انشائیہ کی تخلیق سے لیکر پرکھ تک کے لئے مہذب ذہن کی تلاش بھی بے معنی نہیں اس لئے کہ ELEVATED ذہن ہی جھولوں میں چھپی ہوئی زہرناکی یا تلخی کو محسوس کر سکتا ہے۔ اس لئے مہذب قاری بھی ہوتا ہے اور مہذب ذہن بھی۔ ایسے سوالات اٹھانے کی ضرورت میرے خیال میں نہیں ہے۔ بہرحال ایسے ضمنی مباحث کے باوجود صلاح الدین حیدر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ: "بہرحال موضوع کے حوالے سے یہ ایک اہم دستاویز ہے"

اس کتاب کا ایک مطالعہ سید مشکور حسین یاد نے بھی پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اردو میں پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں تفصیل کے ساتھ صنف انشائیہ کو تنقید کا موضوع بنایا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر نہایت وسعت نظر اور ژرف نگاہی سے روشنی ڈالی ہے۔"[2]

"اردو تنقید کے قارئین جانتے ہیں کہ تنقید میں ڈاکٹر سلیم اختر کا خاص موضوع نفسیات ہے۔ لہٰذا صنف انشائیہ پر بحث کرتے ہوئے بھی وہ اپنے اس خاص موضوع کو فراموش نہیں کر سکے۔ ویسے تو ڈاکٹر صاحب نے ہر باب میں اپنے نفسیاتی شعور اور اس موضوع سے خاص لگاؤ کا اظہار کیا ہے۔ لیکن پانچویں چھٹے باب میں انشائیہ کی اصطلاح اور مبادیات سے ابتدا

---

[1] انشائیہ کی بنیاد ــــ ایک مطالعہ از صلاح الدین حیدر مشمولہ فنون لاہور ۱۹۸۶ء

[2] " " ــــ " " از سید مشکور حسین یاد مشمولہ گوشہ ڈاکٹر سلیم اختر کے مقالات فنون لاہور ۱۹۸۶ء ص ۲۲۲ ـــ ۲۲۰

اورنگ زیب قاسمی

کرنے کے بعد تو اس موضوع پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے اور بقولِ انشائیہ . . . . نفسیات کے آئینہ میں تو وہ ایک ماہر نفسیات نقاد کے طور پر بالکل واضح ہو گئے ہیں اور انہوں نے خوب خوب نفسیاتی نکتے نکالے ہیں۔ حتیٰ کہ انشائیہ کو تحلیل نفسی کی تکنیک سے جا ملایا ہے۔ وہ اس لئے کہ اس تکنیک میں انکشاف ذات ہی سب سے بڑا علاج ثابت ہوتا ہے۔ اور انکشاف ذات ہی انشائیہ کی بھی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔"[1]

یہ دو اقتباسات نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قاری کو اس کا احساس ہو کہ ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی رویے کی شناخت کس طرح لوگ کر رہے ہیں۔ پہلے اقتباس میں یہ بات صاف طریقے سے بیان کی گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے انشائیہ پر جو کچھ لکھا ہے، غالباً اردو میں اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔ دوسرے اقتباس میں ان کے عام رویے یعنی نفسیاتی تناظر کا حال رقم کیا گیا ہے۔ میں یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ انشائیہ کی بنیاد میں چونکہ نفسیات کا رول بہت اہم ہے اس لئے نفسیاتی تنقید کے سب سے اہم نقاد ڈاکٹر سلیم اختر اس پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ دوسرے مباحث کا اس کتاب میں فقدان ہے۔ انشائیہ نگاری کے ضمن میں جتنے اساسی پہلو تھے ان کا تجزیہ کر لیا گیا ہے۔ اور تجزیہ بھی بے دلیل نہیں ہے۔ مجھے تو اس کے اظہار میں ذرا بھی تامل نہیں کہ سلیم اختر کے ساتھ انصاف کیا جاتا تو انہیں نفسیاتی تنقید کے رہنما اور رہبر کی پوزیشن بھی حاصل ہوتی اور عمومی نقاد کی حیثیت سے بھی ان کے اعلیٰ مقام کو تسلیم کر لیا جاتا۔

بہر طور اب میں ایک اور معرکہ آرا کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہوں۔ اس کتاب میں سترہ ابواب ہیں۔ دیباچہ کے بعد "اردو ہے جس کا نام" کے عنوان سے اردو اور ہندی کے رشتے، رسم الخط ریختہ، امیر خسرو، اردوئے معلیٰ، اردو تحقیق کے آئینے میں، اردو کی پہلی نثری تصنیف، ہندوستانی، اردو کے علاقائی نام، اردو یا پاکستانی جیسے عنوانات زیر بحث آئے ہیں۔ یہ حصہ خالصتاً لسانی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں تاریخی بحث موجود ہے۔ اختصار سے موصوف نے بہت اہم مسائل کو گھیرنے کی کوشش کی ہے۔ اس باب میں "اردو کے علاقائی نام" اور "اردو یا پاکستانی" جیسے متنازعہ فیہ امور پر چند سطروں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ لکھنے کا فن آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف طویل طویل مباحث کو چند سطروں میں گرفت میں لے لیتے ہیں۔

دوسرا باب "اردو کے آغاز کے بارے میں مختلف نظریات سے گفتگو کی گئی ہے۔ برج بھاشا، پنجابی اردو، دکنی

---

[1] "انشائیہ کی بنیاد۔ ایک خصوصی مطالعہ" از سید مشکور حسین یاد مشمولہ گوشہ ڈاکٹر سلیم اختر کے مقالات فنون لاہور ۱۹۸۶ء ص ۲۲۲

اردو، سندھ میں اردو، ردِ عمل کے نظریات، قدیم ویدک بولی اور اردو، اردو اور مرہٹی، اردو اور دراوڑی جیسے لسانی مباحث کو انتہائی جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں جنوبی ہند میں اردو ادب کے فروغ اور ارتقاء سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب میں دکنی ادب کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ شمالی ہند میں اردو ادب کی ابتدائی بحث میں افضل، بارہ ماسا کے تذکرے، خان آرزو، حاتم، میر، سودا، درد اور نظیر اکبر آبادی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک اور باب میں لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کے جائزے میں گذشتہ لکھنؤ، دربار اور شاعری، ریختی، مرثیہ، مثنوی جیسے موضوعات کے بعد لکھنویت کیا ہے، پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد ہمدانی، مصحفی، انشاء، جرأت، آتش، اور ناسخ کے کلام اور مزاج کا احاطہ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد کا باب اردو نثر کے ظہور اور مستشرقین پر مشتمل ہے۔ چنانچہ انگریز اور اردو، مستشرقین گارساں دتاسی، ایبنگر، اور دوسرے انگریز شعرائے اردو کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

ایک الگ باب میں فورٹ ولیم کالج اور باغ و بہار کے حوالے سے ڈاکٹر گلکرسٹ اور میر امن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلا سلیس نگار کون ہے؟ اسے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باغ و بہار کے سلسلے میں جتنے مباحث اختصار سے بیان کئے جا سکتے تھے بیان کیے گئے ہیں۔ نوطرزِ مرصع کا بھی ایک تحقیقی مطالعہ سامنے لایا گیا ہے۔ دہلی کے نامور شعراء کے ذیل میں دہلویت کیا نہیں ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر غالب، مومن، ذوق، ظفر، شیفتہ، نصیر، اور داغ کی شاعری پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔

ایک الگ گراں قدر باب میں سر سید تحریک اور ادبی نشاۃ الثانیہ کے ممکن مباحث اور اہم افراد کو زیرِ مطالعہ لایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سر سید احمد خان کے نامور رفقاء مثلاً حالی، شبلی، نذیر احمد وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں پہلے ناول نگار کا مسئلہ بھی حل کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ اس کے علاوہ محمد حسین آزاد، انجمن پنجاب اور محمد اسمٰعیل میرٹھی کا تحقیقی تعارف سامنے آیا ہے۔

عبوری دور کے ادب کے عنوان سے ناول نگاری کی عمومی بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں حقیقت نگاری کے عوامل کو بھی سمیٹا گیا ہے۔ شرر، سرشار، اور رسوا کے ناول زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ یہاں پہلی خاتون ناول نگار کون ہے اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کا ایک الگ باب میں مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس تحریک کا آغاز، سیاست سے اس کا رشتہ، اس کے مقاصد، اس تحریک میں جنس کے برتاؤ کی کیفیت کے ضمنی مباحث

اورنگ زیب قاسمی

کے بعد پریم چند، افسانہ، ناول، خاکہ نگاری، شاعری، تنقید وغیرہ کے موضوعات ابھارے گئے ہیں۔ پھر اس تحریک کے ردِ عمل اور حلقۂ اربابِ ذوق کی کارکردگی پر بھی توجہ کی گئی ہے۔ "محرمِ رازِ درونِ میخانہ" کے عنوان سے اقبال کی شخصیت اور کلام کا ایک خوبصورت جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اردو ڈرامہ کے ذیل میں شکنتلا سے کراچی کے ٹیلی وژن ڈرامہ پر ایک نگاہ ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ مسئلہ واجد علی شاہ کا رہس، امانت کی اندر سبھا، بنگال، بمبئی، اور بلوچستان میں اردو تھیٹر، پارسی تھیٹر کے علاوہ آرام، طالب بنارسی، احسن، بیتاب، آغا حشر، انارکلی، ادبی ڈرامہ، ترقی پسند ڈرامہ اور ٹیلی وژن ڈرامہ کے خدوخال ابھارے گئے ہیں۔

آئندہ چار ابواب پاکستانی ادب کے منظر نامے پر مبنی ہے۔ چنانچہ پاکستان میں تحقیق و تنقید، پاکستان میں اردو نثر کی تخلیقی روش، پاکستان میں شعر کی صورتِ حال اور پاکستان میں ادبی تجربات اور نئے رجحانات پر ایک نگاہ ڈالی گئی ہے۔ گویا اس کتاب کے چار ابواب پاکستانی ادب کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے جو ایڈیشن ہے وہ ۱۹۹۷ء کا ہے۔ اس سے پہلے اس کتاب کے تیرہ ایڈیشن اور شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۱ء میں چھپا تھا اس کے بعد سے اس کے مسلسل نئے ایڈیشن اضافے کے ساتھ چھپتے رہے ہیں۔ موصوف کا اپنا بیان ملاحظہ ہو وہ لکھتے ہیں :

> "اس کتاب کا ۱۹۶۷ء میں ملتان میں ڈول ڈالا گیا تھا۔ اور ۱۹۷۰ء میں جب میں لاہور آ گیا تو کتاب کا مسودہ تقریباً مکمل تھا کتاب میں چند ادبا کا ذکر کیا گیا ان میں سے اکثریت کا میں صورت آشنا بھی نہ تھا۔ چنانچہ جس کے بارے میں جو لکھا ایمانداری سے لکھا۔ میں اب بھی بیشمار ادیبوں سے واقف نہیں بلکہ جن سے اب واقف ہوں ان میں سے بھی بہت سے ادیبوں سے یہ گذارش ہے"۔ "چلو ایک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں"

کتاب کے عنوان میں "مختصر ترین" مجھے رنگ کا دینے والے الفاظ ثابت ہوئے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے بھی ادبی کالموں اور طنزیہ مضامین میں اس کا تذکرہ ہوتا رہا۔ حالانکہ "مختصر ترین" سے صرف اظہارِ عجز مقصود تھا۔ لیکن اس "مختصر ترین" نے مجھ پر بہت بھاری ذمہ داری کا بوجھ بھی ڈال دیا۔ کیونکہ مختصر ترین کا مطلب "سرسری" بنا نا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تاریخ ادب میں جتنے نام آتے ہیں جبکہ نامکمل کے الفاظ میں ادیبوں کی اکثریت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ درد سے نامور کے درمیان "معلق" یا "معلق" ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے صرف ان ہی ادبی شخصیات، واقعات اور کتب کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ہر لحاظ سے ادب میں دائمی اہمیت اختیار کر چکی ہیں اور ان کے تذکرہ میں بھی ملحوظ

اہمیت اور وقعت طوالت یا اختصار سے کام لیا گیا ہے اسی ضمن میں بے جا طوالت سے احتراز کرتے ہوئے بالعموم اجمال اور اشارات پر انحصار کیا گیا۔ اسی طرح مصنفین کی صرف معروف اور زندہ جاوید تصنیفات کا حوالہ دیا گیا اور یوں کتاب کو کیٹلاگ بنانے کی کوشش نہیں کی البتہ اہم ادبی وقوعات اور اشاعت کتب وغیرہ کے سلسلے میں سنین کے تعین میں خصوصی کاوش کی گئی ہے۔ بعض سنین پر محققین اور ناقدین کا اتفاق نہیں جس سنہ پر اکثریت کا اتفاق پایا اسی کو قبول کر لیا۔ ہجری اور عیسوی سنہ کی بنا پر بعض اوقات خاصی الجھنیں ہوتی ہیں اس لئے جہاں تک ہو سکا دونوں سنین فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح ادبی اور بالخصوص لسانی امور میں برپا علمی نزاعات کا ذکر تو کیا مگر صرف تفہیم و تشریح کی حد تک۔ ان مباحث کو سلجھانے کی سعی میں مزید الجھانے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی کسی ایک نظریہ کو دیگر نظریات پر فوقیت دی گئی ہے" ؎۱

یہ طویل اقتباس اس لئے درج کیا گیا کہ تاریخ نویس کے سامنے کون سا موقف تھا۔ اس کا کلی طور پر اظہار ہو جائے۔ تاریخ نگاری آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان ان کے لئے ہے جن کے سامنے تاریخ لکھنے کی کوئی خاص غایت نہیں ہوتی۔ محض وہ ایک کتاب پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے برخلاف تاریخ لکھنے والے کے سامنے ایک واضح نقطۂ نظر اور ایک حد تک متعینہ فلسفہ ہوتا ہے۔ ادبی تاریخ لکھنے میں اس کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جہاں کھل کر لکھنے کا موقع ہو وہاں تو یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ رطب و یابس میں تمیز نہ کی جائے اور جہاں سے جو مواد ملا اسے استعمال کر لیا جائے۔ لیکن اختصار اور جامعیت اور واضح نقطۂ نظر کی عقبی زمین میں لکھنے والا کٹھن کوس طے کرے گا۔ اسے رد و انتخاب کے مرحلے سے گذرنا ہی پڑے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ موضوع پر اس کی نظر گہری بھی ہو اور بسیط بھی۔ ڈاکٹر سلیم اختر جب مختصر ترین تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ تو اس وقت ان کے سامنے ایسے مسائل اور بھی شدید بن کر ابھرے ہوں گے۔ خصوصاً عصری میلانات اور ہمعصر شعراء اور ادباء کی شرکت یا عدم شرکت کے معاملے میں" لہٰذا اگر ان کی کتاب کسی کے لئے متنازعہ فیہ ہے تو یہ غیر فطری بھی نہیں۔ وہ ادیب جو مسائل کو خوبی سے حل کرنا جانتا ہے وہ اپنے کینوس اور مواد کی ضخامت پر بھی حاوی ہوتا ہے۔ لہٰذا مختصر ترین تاریخ ادب اردو اس وقت جو تیور لئے ہوئے ہے وہ انتہائی مستحسن ہے اس لئے کہ اس سے اردو ادب کے نہ صرف غالب رجحانات کا پتہ ملتا ہے بلکہ اہم کتابوں اور اہم شاعروں کے کلیدی مباحث سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔ قارئین کو ڈاکٹر سلیم اختر کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے تاریخ ادب اردو کے ہزاروں صفحات کے ورق گردانی کے

؎۱ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" مشمولہ دیباچہ از سلیم اختر ص ۱۱ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

اورنگ زیب قاسمی

تضیع اوقات سے بچایا ہے اور اردو ادب کے ارتقاء کا عطر اور مغز پیش کر دیا ہے۔ اب جب اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں تو یہ امر اس کی مقبولیت پر دال ہے پھر بھی میں ذیل میں چند افراد کی آراء پیش کرنا چاہتا ہوں :

"ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ کتاب بھی ایک جہان معنی ہے۔ ایک کوزہ ہے جس میں مطالب کا ایک دریا ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے ایسا دریا جس کی تہہ میں اگر بصیرت کے بے شمار موتی ہیں تو سطح پر نباتات کے شاداب کنول اپنی تازگی کی بہار دکھا رہے ہیں۔ آپ کو جگہ جگہ ڈاکٹر صاحب کی دانش افزا عبارات کے چمن کھلے ہوئے نظر آئیں گے۔ ان میں ہائے رنگ رنگ سے جہاں کتاب کی رنگینی و زیبائی ہزار چند فزوں ہوگی" وہاں قاری کے لئے بہت بڑی دولت کی فراہمی کا انتظام بھی ہو گیا ہے" ؎۱

"یہ کتاب بڑی دلکش منیچر MINIATURE ہے اردو ادب کے تمام اہم ناموں کو شاہکار تصانیف کو ڈھائی سو صفحوں میں لانے سے ایک کتب خانے میں رکھنے والی فہرست کے سوا اور کیا چیز بن سکتی تھی۔ مگر سلیم اختر صاحب میں تخلیقی قوتیں موجود ہیں۔ اس لئے ان کی یہ کتاب فنی چیز ہو گئی ہے" ؎۲

"میں اس کام کو ناممکن نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ قلیل ضخامت میں کئی سو سال کے ادب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ

(ا) لکھنے والے کے پاس کہنے کے لئے کچھ باتیں ہوں۔
(ب) الفاظ کا انتخاب موزوں" واضح اور مختصر ہو۔
(ج) تکرار سے بالکل پرہیز کیا گیا ہو۔

سلیم اختر کی کتاب میں تینوں باتیں بہت حد تک موجود ہیں" ؎۳

"اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" اپنی ساخت کے لحاظ سے بہت متوازن ہے اور انداز بیان بہت دلچسپ ہے اس میں مدرسانہ تو قس کی جھلک ہے اور نہ مخصوص تاریخ نویسی کی خشک فضا۔ ساری کتاب میں شگفتہ اور رواں نثر نظر آتی ہے۔ بعض خوب بہت

؎۱ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ مبصر شکور حسین یاد مطبوعہ معاصر شمارہ ۳ لاہور ۱۹۸۰ء ص ۹۱۶

؎۲ " " " " مبصر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مطبوعہ سب رس کراچی ۱۹۷۱ء

؎۳ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ مبصر خواجہ محمد زکریا مطبوعہ سہ ماہی صحیفہ لاہور

دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔ ایجاز اور اختصار کے لئے ایسا ہی طرزِ تحریر موزوں تھا جو سلیم اختر نے اختیار کیا ہے۔" لہ

"اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کی سب سے بڑی خوبی مصنف کا خوبصورت انداز بیان ہے۔ اس کے صفحات پر معلومات کی فراوانی ہے۔ اور نہ کسی مسئلے پر اس طرح داد تحقیق دی گئی ہے کہ صفحات بس اسی کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں۔ مصنف نے خواہ مخواہ کی تحقیقی پیچیدگیوں سے احتراز کیا ہے۔ انہوں نے معنز سے رابطہ استوار کیا ہے۔ طویل و بسیط مباحث کی یہاں گنجائش نہیں تھی۔" کہ

"یہ دریا، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے کوزے میں بند ہو کر سامنے آیا ہے۔ تو سید صاحب کی نظر انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے اس کام کے لئے ایک ایسے نوجوان اور صاحب نظر ادیب کو چنا جو قلیل ترین وقت میں اور مختصر ترین الفاظ میں ایسا بھرپور کام کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ چنانچہ کتاب کے مطالعہ سے تاثر یہی مرتب ہوتا ہے کہ اس میں اختصار کا دامن بہت وسیع ہے۔ اور چند الفاظ میں بہت کچھ کہہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اختصار کو ہر وقت ملحوظ رکھنے میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں 'انقباض' کی کیفیت پیدا نہ ہو جائے اور بات کا ادھورا پن تشنگی کے احساس پر منتج نہ ہونے لگے۔ مگر سلیم اختر صاحب نے اختصار ملحوظ رکھنے کے باوصف نہ تو کئی مسائل کے بارے میں پیش کئے گئے مختلف نظریات میں سے کسی ایک کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کیا ہے اور نہ اردو ادب کی کسی کروٹ کو نظر انداز کرنے کی غلطی کی ہے۔ حد یہ ہے انہوں نے تاریخ نویسوں کے عام رویے کے برعکس اردو ادب کی تاریخ کو نوکِ قلم پر آئے ہوئے لمحے تک سمیٹ کر معاصر ادبا کے چھتے کو چھیڑنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ لہٰذا اگر اس کے نتیجے میں انہیں ایک مسلسل بھنبھناہٹ کا "سہانا نغمہ" سنائی دینے لگے تو یہ قطعاً غیر اغلب نہ ہوگا۔" تہ

"بعض ابواب میں مصنف نے جدید ترین تحقیق کی اساس پر چند قدیم مسلمات کے بتوں کو بھی توڑا ہے اور خود اپنی کاوش پر بھروسہ کیا ہے۔ سلیم اختر محنتی محقق

لہ سلیم اختر کی دو کتابیں مبصر سحر انصاری مشمولہ افکار کراچی

کہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ مختصر بھی ہے؟ مشمولہ مرزا ادیب روزنامہ نوائے وقت

تہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ تبصرہ ڈاکٹر وزیر آغا نقوش لاہور ۱۹۶۲ء

اورنگ زیب قاسمی

ہیں اور معروضی تجزیوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں انہوں نے فالتو باتوں سے پرہیز کیا ہے۔ صرف کام کی باتیں لکھی ہیں۔ جب کہ ارزانہ پبلک ریلیشنگ کے بغیر کوئی نہیں توڑا جاتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے چپ چاپ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔" لہ

"میرے نزدیک اس مختصر ترین تاریخ ادب اردو کی دو خوبیاں ایسی ہیں جو اسے ممتاز حیثیت دیتی ہیں۔ اول یہ کہ اردو کے پورے ادب کے متعلق ناگزیر طور پر ضروری معلومات قاری کو مل جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور بعد از مطالعہ وہ اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اردو ادب کی تاریخ کو جانتا ہے۔" کہ

"برادر! اس کتاب کی مخالفت کی تمام وجوہات کا فارمولا بنا کر یوں بات سمجھائی جا سکتی ہے (۱) وہ لوگ جن کا ذکر کتاب میں نہ آیا تو ظاہر ہے کہ میں ان کے نزدیک گردن زدنی کے لائق ہوں (۲) وہ لوگ جن کا ذکر تھا لیکن ان کے دشمن کی بھی تعریف تھی چنانچہ وہ بھی ناخوش ہوئے (۳) وہ لوگ جن کا ذکر تو تھا لیکن اتنا نہیں جتنا وہ چاہتے تھے۔ یعنی اتنی تعریف نہیں کی گئی تھی جتنا عظیم وہ خود کو گردانتے ہیں —— میرے خیال میں ان تینوں وجوہات میں تمام لوگوں کی ناپسندیدگی سمٹ آتی ہے۔" تہ

اوپر کے آٹھ اقتباسات مختلف از ہان کے ادیبوں اور فن کاروں کے ہیں۔ آخری اقتباس ڈاکٹر سلیم اختر کا ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ عمومی طور پر مختصر ترین تاریخ ادب اردو کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ مصنف کی محنت کو سراہا گیا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ تمام کے تمام افراد محض منہ دیکھ کر تعریف کرنے والے ہیں۔ ان میں بعضوں کی نگاہ کا تو ایک زمانہ قائل ہے۔ لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ کتاب متنازعہ فیہ بھی ہے۔ اس کا سبب آخری اقتباس میں ہے اور اس کتاب کے بعض مخالفین کا پردہ چاک کرنے کے لئے یہ چند سطریں کافی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس موضوع پر یہ ہمیشہ کے لئے اول اور آخری کتاب ہے۔ بلکہ کوششیں تو کی جاتی رہیں گی۔ خود سلیم اختر مختلف ایڈیشنوں میں خوب سے خوب تر کی جستجو میں مصروف نظر آتے ہیں۔ "نگاہ اور نقطے" کے مضامین کا مجموعہ شائع کرتے وقت یقیناً سلیم اختر میدان ادب میں نووارد

لہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اور سلیم اختر از آغا سہیل مشمولہ فنون لاہور ۱۹۷۱ء

کہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ پر تبصرہ ڈاکٹر سید عبداللہ مشمولہ نقوش لاہور

تہ

تھے لیکن اس کتاب سے بھی ان کے اندر جو آگ تھی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا اس میں بارہ مضامین ہیں۔ یقیناً سب کے سب معیاری نہیں ہیں۔ لیکن جو مضامین غالب سے متعلق ہیں اور باغ و بہار کے درویش عاشق پر ہیں وہ آج بھی خاصے اہم سمجھے جا سکتے ہیں۔ اب "نگاہ اور نقطے" کے سفر سے سلیم اختر بہت دور نکل چکے ہیں۔ نگاہ اور نقطے کا سچ نادر و رحمت ہی ہو چکا ہے۔ اس لئے پلٹ کر ان مضامین کو دیکھنا ضروری نہیں معلوم ہوتا ہے۔ وہ شخص جو نفسیات سے بھی دلچسپی رکھتا ہو ادب کے وسیع تناظر سے واقف ہو۔ شخصیات کی داخلی اور خارجی کیفیات کا احاطہ کر سکتا ہو۔ تخلیقی رویے پر اپنی سوچی سمجھی رائے دے سکتا ہو۔ ادبی مباحث میں اپنی تمام تر سنجیدگی سے اور مطالعے سے ان کے اندرون میں داخل ہو سکتا ہو اور کلچر سے لیکر پاکستانی کلچر، قومی کلچر، لسانی کلچر کی لہروں پر نگاہ رکھ سکتا ہو۔ ادب کی تاریخ کو یک کٹ بے کوس طے کر سکتا ہو۔ غالب جیسے شاعر کے شعور اور لاشعور کی تہوں میں اتر سکتا ہو۔ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ کر سکتا ہو۔ اس عظیم شاعر کا عالمی منظر نامہ پیش کر سکتا ہو۔ اس کے ادبی نصب العین کی تفہیم میں معاون ہو۔ اس کے شعار صدرنگ کا عکس پیش کر سکتا ہو۔ اس کے مخفی گوشوں کو مزید منور کر سکتا ہو جوش سے لیکر متعدد دوسرے شاعروں کا نفسیاتی مطالعہ کر سکتا ہو۔ ادب کی فہرست سازی کر سکتا ہو۔ پاکستان میں اردو ادب کے سال بہ سال ارتقا کا جائزہ لے سکتا ہو۔ عورت اور مرد کے رشتے کی تہوں میں اتر سکتا ہو۔ اور جنسی عوامل کی تفہیم میں اکابر کی نگارشات کا مطالعہ کر سکتا ہو۔ سستانے اور زندگی بڑھانے کے نسخے مرتب کر سکتا ہو۔ روزنامچہ جیسی گھنٹے کیسے بسر کرنا چاہئے کسی عظیم لکھنے والے کو پس منظر بنا کر پیش کر سکتا ہو ——— یعنی ادب اور زندگی کے گوناگوں پہلوؤں سے مسلسل ٹکرا رہا ہو، اس کی عظمت کے جتنے اور جیسے بھی گن گائے جائیں کم ہے۔

میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کا ذہن قاموسی ہے اور ان کا تنقیدی وژن غیر معمولی اور گہرا ہے۔ انہیں محض نفسیاتی نقاد باور نہیں کرنا چاہئے بلکہ تنقید کے تمام دبستانوں میں ان کی رسائی کا احساس کرتے ہوئے انہیں ادبی تنقید کی تاریخ میں انتہائی اہم مقام دینا چاہئے

اورنگ زیب قاسمی

کتابیات

شمار	کتاب کا نام	مصنف	پبلی کیشنز	سال اشاعت
۱	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	ڈاکٹر سلیم اختر	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۹
۲	ادب اور لاشعور	" " "	مکتبہ عالیہ "	۱۹۷۶
۳	اقبال کا ادبی نصب العین	" " "	شیخ غلام علی اینڈ سنز	۱۹۷۷
۴	اقبال کا شعار صدرنگ	" " "	سنگ میل پبلی کیشنز	۱۹۷۹
۵	ایران میں اقبال شناسی کی روایت	" " "	" " " لاہور	۱۹۸۳
۶	اقبال ممدوح عالم	" " "	بزم اقبال کلب روڈ "	۱۹۷۹
۷	اقبال کا نفسیاتی مطالعہ	" " "	مکتبہ عالیہ "	۱۹۷۷
۸	انشائیہ کی بنیاد	" " "	سنگ میل پبلی کیشنز "	۱۹۸۷
۹	ادب اور کلچر	" " "	مکتبہ عالیہ "	۱۹۸۳
۱۰	اقبال اور ہمارے فکری زاویے	" " "	سنگ میل پبلی کیشنز "	۱۹۸۲
۱۱	اقبال کا منظر نامہ	" " "		
۱۲	افسانہ حقیقت سے علامت تک	" " "	اسٹوڈنٹس گلڈ الہ آباد	۱۹۹۰
۱۳	اقبالیات کے نقوش	" " "	اقبال اکیڈمی لاہور	۱۹۷۷
۱۴	اقبال اور نظم	پروفیسر آل احمد سرور	دہلی	
۱۵	اقبال جادوگر ہندی نژاد	عتیق احمد صدیقی	دہلی	
۱۶	اقبال شناسی اور فنون	ڈاکٹر سلیم اختر	بزم اقبال لاہور	۱۹۸۸
۱۷	اقبال شناسی کے زاویے	" " "	" " "	۱۹۸۵
۱۸	اردو تنقید کی تاریخ	ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۷

۱۹	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	〃 〃 〃	۱۹۸۷
۲۰	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۱۹۸۸
۲۱	آگہی کا منظرنامہ	ڈاکٹر وہاب اشرفی	بہار پبلی کیشن پٹنہ	۱۹۸۹
۲۲	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر محمود الحسن رضوی	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۸
۲۳	ادبی قدریں اور نفسیات	شکیل احمد	معصوم پبلی کیشن سری نگر	۱۹۶۵
۲۴	اردو شاعری میں نرگسیت	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۷
۲۵	اردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی		
۲۶	ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	
۲۷	باغ و بہار کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سلیم اختر	میری لائبریری لاہور	۱۹۶۸
۲۸	باغ و بہار (تلخیص)	〃 〃 〃	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۷۲
۲۹	پاکستان میں اردو ادب	〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃	۱۹۸۹
۳۰	پاکستانی ادب اور کلچر کا مسئلہ	شاہد ماہلی		
۳۱	تنقیدی دبستان	ڈاکٹر سلیم اختر	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۷۱
۳۲	تخلیق اور لاشعوری محرکات	〃 〃 〃	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۳
۳۳	تنقید اور تاریخ ادب	مکتبہ عالیہ لاہور		۱۹۷۳
۳۴	تین بڑے نفسیات داں	مکتبہ شاہکار لاہور		۱۹۷۷
۳۵	تلاش و توازن	قمر رئیس	دہلی	۱۹۶۸
۳۶	تنقیدی تناظر	〃 〃	〃	۱۹۷۹
۳۷	تنقید اور عصری آگہی	ڈاکٹر سید محمد عقیل	انجمن تہذیب نو پبلیکیشنز ڈویژن الہ آباد	۱۹۷۶
۳۸	تنقید کیا ہے ؟	پروفیسر آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۱۹۸۴
۳۹	جوش کا نفسیاتی مطالعہ	ڈاکٹر سلیم اختر	فیروز اینڈ سنز لاہور	۱۹۸۷
۴۰	جوش انسان اور شاعر	احتشام حسین	دہلی	
۴۱	جدید اردو تنقید اصول و نظریات	شارب ردولوی	اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ	
۴۲	جدید ادب منظر پس منظر	سید احتشام حسین	〃 〃 〃 〃 〃	
۴۳	جدیدیت اور ادب	آل احمد سرور	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۶۹

اورنگ زیب قاسمی

۴۴	جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	شمیم حنفی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	
۴۵	جدید اردو ادب	ڈاکٹر محمد حسن	دہلی	۱۹۷۵
۴۶	چہرہ پس چہرہ	ابن فرید	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۰
۴۷	دائرے اور لکیریں	وزیر آغا	مکتبہ فکر و خیال لاہور	
۴۸	داستان سے افسانے تک	پروفیسر وقار عظیم	کراچی	۱۹۶۰
۴۹	روزانہ چوبیس گھنٹے کیسے زندہ رہیں	ڈاکٹر سلیم اختر	مکتبہ میری لائبریری لاہور	۱۹۷۱
۵۰	روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین	لکھنؤ	۱۹۷۲
۵۱	سستائیے اور زندگی بڑھائیے	ڈاکٹر سلیم اختر	مکتبہ میری لائبریری لاہور	۱۹۷۶
۵۲	ستارہ یا بادبان	محمد حسن عسکری	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	
۵۳	شعور اور لاشعور کا شاعر غالب	ڈاکٹر سلیم اختر	فیروز سنز لاہور	۱۹۸۷
۵۴	شاعری جنس اور جذبات	〃 〃	شیخ غلام علی اینڈ سنز	۱۹۷۹
۵۵	شعر غیر شعر اور نثر	شمس الرحمٰن فاروقی	شب خون کتاب گھر۔ الہ آباد	۱۹۷۳
۵۶	شناسا چہرے	ڈاکٹر محمد حسن	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	
۵۷	صنف انشائیہ اور چند انشائیے	سید محمد حسنین	موتی لال بنارسی داس پٹنہ	۱۹۷۶
۵۸	ضبط کی دیوار	سلیم اختر	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۷۷
۵۹	عورت جنس اور جذبات	〃 〃	مکتبہ جدید لاہور	۱۹۸۲
۶۰	عورت جنس کے آئینے میں	〃 〃	شیخ غلام علی اینڈ سنز	۱۹۷۶
۶۱	غالب : تقلید اور اجتہاد	پروفیسر خورشید الاسلام	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	
۶۲	غالب: شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری		
۶۳	فکر اقبال کے منور گوشے	ڈاکٹر سلیم اختر	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۷۷
۶۴	فکر اقبال ایک تعارف	〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃	۱۹۸۳
۶۵	ادب و حقیقت	کرسٹوفر کاڈویل		۱۹۵۵
۶۶	فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں		
۶۷	کڑوے بادام (افسانے)	ڈاکٹر سلیم اختر	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۸
۶۸	کلام نرم و نازک	〃 〃	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	
۶۹	مرد جنس کے آئینے میں			

۷۰	میں ہم اور ادب	ابن فرید	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۷
۷۱	معیار و اقدار	عبدالمغنی	حکمت پبلی کیشنز پٹنہ	۱۹۸۱
۷۲	مضامین نو	خلیل الرحمن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	
۷۳	نگاہ اور نقطے	ڈاکٹر سلیم اختر	جدید ناشرین	۱۹۸۸
۷۴	نئی علامت نگاری	ڈاکٹر سید محمد عقیل	انجمن تہذیب نو، الٰہ آباد	۱۹۷۵
۷۵	نئے ادبی رجحانات	سید اعجاز حسین		۱۹۵۷
۷۶	نظر اور نظریے	آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۱۹۷۳
۷۷	نقطۂ نظر	عبدالمغنی	کتاب منزل پٹنہ	۱۹۶۵
۷۸	نئی شعری روایات	ڈاکٹر شمیم حنفی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	
۷۹	وجودیت پر ایک نظر	سلطان علی شیدا	اتر پردیش اردو اکادمی	۱۹۷۸
۸۰	ہماری جنس اور جذباتی زندگی	ڈاکٹر سلیم اختر	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	۱۹۷۵
۸۱	ہم سفر بگولوں کا	ڈاکٹر طاہر تونسوی	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۵
۸۲	ملاقاتیں	انتظار حسین	مکتبہ عالیہ — لاہور	۱۹۸۸

اورنگ زیب قاسمی

نمبر شمار	عنوان	مقالہ نگار	رسالے کا نام	سن اشاعت
۱	نفسیاتی تنقید (تبصرہ)	احسان الحق	ماہنامہ کتاب لاہور	دسمبر ۱۹۶۷
۲	سلیم اختر	مرزا ادیب	تخلیق شمارہ ۱۲-۱۳	۱۹۷۲
۳	بکری دودھ اور مینگنیاں	مسعود اشعر	سیپ کراچی	اگست ستمبر ۱۹۷۵
۴	ن۔ م۔ راشد کی تنقید کا نفسیاتی مزاج	سلیم اختر	شاعر بمبئی	شمارہ ۵ ۱۹۷۹
۵	محمد حسن عسکری کی تنقید کا نفسیاتی لب و لہجہ	"	سب رس کراچی	جنوری ۱۹۸۰
۶	شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب پر ایک نظر	احمد ندیم قاسمی	فنون لاہور	—
۷	شعور اور لاشعور کا شاعر — غالب	نظیر صدیقی	قومی زبان کراچی	فروری ۱۹۸۹
۸	شعور اور لاشعور کا شاعر — غالب	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	ماہ نو لاہور	فروری ۱۹۸۵
۹	شعور اور لاشعور کا شاعر —	منصور آفاقی	ماہ نو "	مارچ ۱۹۸۵
۱۰	شعور اور لاشعور کا شاعر — غالب	مرزا ادیب	نقوش "	سالنامہ جون ۱۹۸۵

۱۱	اقبال اور ہمارے فکری رویے — ایک مطالعہ	نور علی صدیقی	افکار کراچی	
۱۲	ڈبویا مجھ کو ہونے نے	سلیم اختر	سیپ کراچی	اگست ستمبر ۱۹۷۵
۱۳	میرے شب و روز	"	بیسویں صدی نئی دہلی	اکتوبر ۱۹۸۰
۱۴	مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب فلسفۂ الٰہیات کا نفسیاتی مطالعہ	"	گورنمنٹ کالج محمد حسین آزاد نمبر	۱۹۸۳
۱۵	ڈاکٹر سلیم اختر گوشہ	صہبا لکھنوی	ماہنامہ افکار	جون ۱۹۸۵
۱۶	عورت جنس اور جذبات۔ تبصرہ	عرش صدیقی	سیپ کراچی	
۱۷	زندگی کے موڑ پر	ڈاکٹر سلیم اختر	ماہنامہ کتاب لاہور	اکتوبر ۱۹۹۱
۱۸	ہماری جنس اور جذباتی زندگی	عاصم صہبائی	تخلیق لاہور	شمارہ ۷-۸ ۱۹۷۴
۱۹	میں کیا ہوں گا؟	ڈاکٹر سلیم اختر	ہدایت سالنامہ	جنوری ۱۹۷۹
۲۰	اقبال شناسی کے زاویے۔ تبصرہ	خواجہ حمید یزدانی	جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان	جلد ۳۴ شمارہ ۱ جنوری ۱۹۹۷
۲۱	باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	شمس الرحمن فاروقی	شب خون	اگست ۱۹۶۹
۲۲	اردو ادب کی متنازعہ فیہ شخصیت	سعادت سعید	تلاش ماہنامہ لاہور	شمارہ ۱ ۱۹۸۳
۲۳	نگاہ اور نقطے۔ تبصرہ	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	نگار پاکستان	جون جولائی ۱۹۶۸
۲۴	"	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	سیپ کراچی	
۲۵	نگاہ اور نقطے ایک تجزیہ	اے۔ بی۔ اشرف	نئی قدریں حیدرآباد	۱۹۶۷
۲۶	نگاہ اور نقطے۔ تبصرہ	کرامت علی کرامت	شاخسار	شمارہ ۲۹-۳۰-۳۱ ۱۹۷۰
۲۷	"	شمیم حنفی	آج کل دہلی	فروری ۱۹۷۰
۲۸	سلیم اختر کی نگاہ اور نقطے	نوشابہ نرگس	نیرنگ خیال راولپنڈی	جولائی ۱۹۶۹
۲۹	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ پر ایک نظر	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	طلوع افکار کراچی	نومبر ۱۹۸۲
۳۰	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	مشکور حسین یاد	معاصر لاہور	شمارہ ۳ ۱۹۸۳
۳۱	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اور سلیم اختر	ڈاکٹر آغا سہیل	فنون لاہور	۱۹۸۲
۳۲	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ تبصرہ	ڈاکٹر سید عبداللہ	نقوش لاہور	
۳۳	"	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	سیپ کراچی	۱۹۷۲
۳۴	"	عرش صدیقی	فنون لاہور	۱۹۷۲
۳۵	"	ڈاکٹر وزیر آغا	نقوش لاہور	۱۹۷۲

۳۶	" " " "	خواجہ محمد ذکریا	سہ ماہی صحیفہ لاہور		۱۹۷۲
۳۷	" " " "	مرزا ادیب	ادب لطیف لاہور		۱۹۷۲
۳۸	ادب اور لاشعور	ابن فرید	الفاظ علی گڑھ	مارچ اپریل	۱۹۷۹
۳۹	ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت اقبال شناس	سجاد باقر رضوی	افکار کراچی		
۴۰	اقبال ممدوح عالم ایک جائزہ	خواجہ عبدالحمید یزدانی	شاعر بمبئی	شمارہ ۳، ۴ تا	۱۹۸۴
۴۱	اقبال اور ہمارے فکری رویے	ادیب سہیل	افکار کراچی	مارچ	۱۹۸۴
۴۲	اقبال کا نفسیاتی مطالعہ	احمد ہمدانی	سیپ کراچی		۱۹۷۹
۴۳	اقبال کا نفسیاتی مطالعہ ۔ تبصرہ	عارف عبدالمتین	نقوش لاہور		۱۹۷۸
۴۴	اقبال شناس صد رنگ "	احمد ہمدانی	سیپ کراچی		
۴۵	اقبال کا نفسیاتی مطالعہ	محمد معروف ڈاکٹر	ماہنامہ ماہ نو لاہور	اپریل	۱۹۷۹
۴۶	ادب اور لاشعور	ڈاکٹر محمد معروف	نئی قدریں حیدرآباد	سلسلہ جمیل نمبر	۱۹۸۰
۴۷	ادب اور لاشعور تبصرہ	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	سیپ کراچی		
۴۸	" " " "	مرزا ادیب	ماہنامہ کتاب لاہور	ستمبر	۱۹۷۶
۴۹	تنقیدی دبستان "	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	نگار کراچی	جنوری فروری	۱۹۷۵
۵۰	" "	مرزا ادیب	کتاب لاہور	نومبر	۱۹۷۴
۵۱	افسانہ حقیقت سے علامت تک	" "	فنون لاہور		۱۹۷۷
۵۲	" " " "	رشید امجد	الفاظ کراچی	جنوری فروری	۱۹۷۷
۵۳	" " " "	سراج منیر	تخلیق لاہور	شمارہ ۱۱-۱۲	۱۹۷۶
۵۴	" " " "	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	سیپ کراچی		
۵۵	نگاہ اور نقطے تبصرہ	مرزا ادیب	سہ ماہی اردو	شمارہ ۲	۱۹۷۹
۵۶	" " "	مظفر حنفی	تحریک دہلی	مئی	۱۹۷۹
۵۷	سلیم اختر کی دو کتابیں "	سحر انصاری	افکار کراچی		
۵۸	گفتگو سلیم اختر سے انٹرویو	ڈاکٹر آغا سہیل	ماہنامہ ماہ نو لاہور	مئی	۱۹۸۲
۵۹	انشائیہ کی بنیاد ایک مطالعہ تبصرہ	صلاح الدین حیدر	فنون لاہور	—	۱۹۸۷
۶۰	انشائیہ کی بنیاد خصوصی مطالعہ	سید مشکور حسین یاد	" "	—	۱۹۸۷

اورنگ زیب قاسمی

۶۱	پاجامہ عینک اور قلم	عطاء الحق قاسمی	افکار کراچی		
۶۲	ڈاکٹر سلیم اختر	قائم نقوی	ماہ نو لاہور	جنوری	۱۹۸۴
۶۳	پراگندہ طبع لوگ	ڈاکٹر آغا سہیل	" " "	"	"
۶۴	سچائی کا پرشور گھر	منصور قیصر	" " "	"	"
۶۵	ایک متنازعہ مگر مقبول نقاد	محمد اجمل خان نیازی	" " "	"	"
۶۶	سلیم اختر کی تنقید نگاری	وزیری پانی پتی	طلوع افکار کراچی		۱۹۶۳
۶۷	ڈاکٹر سلیم اختر ہم سفر بگولوں کا	اصغر ندیم سید	الفاظ کراچی		۱۹۸۵
۶۸	ہم سفر بگولوں کا ـــ ایک مطالعہ	محمد اجمل نیازی	فنون لاہور		
۶۹	جدید افسانہ	ڈاکٹر سلیم اختر	ماہ نو لاہور	جنوری	۱۹۸۴
۷۰	طرز کہن پہ اڑنا	ڈاکٹر سلیم اختر	ماہ نو لاہور	جنوری	۱۹۸۴
۷۱	ادب اور ماحول	" " "	کوہسار راولپنڈی	گورنمنٹ کالج میگزین نومبر	۱۹۵۴
۷۲	نرگسیت اور تخلیقی شخصیت	" " "	سیپ کراچی	شمارہ ۴۵ جولائی اگست	۱۹۷۷
۷۳	علامت کا جنم	" " "	فنون لاہور		
۷۴	مطالعہ ادب میں تحلیل نفسی کا کردار	" " "	ماہ نو لاہور	اپریل	۱۹۷۷
۷۵	تعقل ـــ نفسیات کی روشنی میں	" " "	ماہ نو	دسمبر	۱۹۷۷
۷۶	انا الحق	" " "	مجلہ اقبال لاہور	اکتوبر	۱۹۸۱
۷۷	تخلیق کار تخلیق اور جنون	" " "	نقوش لاہور	شمارہ ۱۲۲ جنوری	۱۹۷۷
۷۸	تخلیق اور لاشعوری محرکات	" " "	نیا دور لاہور		
۷۹	فراق گورکھپوری کے تنقیدی انداز	" " "	انعکاس مظفرپور	دسمبر	۱۹۸۳
۸۰	پیام اقبال کی عالمگیر مقبولیت	" " "	اقبال ریویو لاہور		۱۹۸۳
۸۱	علامہ اقبال اور زوال آدم	" " "	" " "	اکتوبر	۱۹۸۴
۸۲	حضور! عدم آیا ہے	" " "	فنون لاہور		۱۹۸۴
۸۳	اقبال بچوں کے شاعر کی حیثیت سے	" " "	تعلیم و تربیت لاہور	اپریل	۱۹۵۱
۸۴	نازک مزاج شاعر میر	" " "	سدا بہار	نومبر	۱۹۸۴

نمبر شمار	عنوان	مقالہ نگار	اخبار کا نام	تاریخ اشاعت	
۸۵	میں ادیب کیسے بنا	〃 〃 〃	تعلیم و تربیت لاہور	اپریل	۱۹۸۵
۸۶	میں	〃 〃 〃	الفاظ کراچی	مارچ	۱۹۸۴
۸۷	سخنور	لطیف الزماں خاں	الفاظ کراچی	مارچ	۱۹۸۴
۸۸	مردم گو بسیار توفیق	مشکور حسین یاد	〃	〃	〃
۸۹	استادوں کا استاد	رحیم گل	〃	〃	〃
۹۰	اردو دنیا کا انوکھا سلیم اختر	طاہر تونسوی	〃	〃	〃
۹۱	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	احمد ندیم قاسمی	〃	〃	〃
۹۲	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	ڈاکٹر وحید قریشی	الفاظ کراچی	مارچ	۱۹۸۴
۹۳	〃 〃 〃	اصغر ندیم سید	〃	〃	〃
۹۴	انسان کی تنقید کے چھ سوال اور سلیم اختر	انوار احمد	〃	〃	〃

S.No.	Subject	Auther	Magazines /Books	Year
1.	A Thing of Beauty	Saleem Akhtar	The Kohsar	May 1955
2.	Herbert Read on Iqbal	Saleem Akhtar	Iqbal Review	1982
3.	Literature and Culture	M. Afsar Sajid	Carvan Book Centre Multan	1989
4.	Theory and Practice of Inshaiya	" " "	" " "	"
5.	Ghalib : A Psychounalysis	" " "	" " "	"

اورنگ زیب قاسمی

نمبر شمار	عنوان	مقالہ نگار	اخبار کا نام	تاریخ اشاعت	
۱	اکبر کی شاعری	ڈاکٹر سلیم اختر	روزنامہ تعمیر راولپنڈی	۲۴ مارچ	۱۹۵۲ء
۲	لکھنؤ اسکول کی شاعری			۱۹ مئی	۱۹۵۲ء
۳	غزل کی ابتدا			۲۴ جون	۱۹۵۲ء
۴	حالی ــــ غزل کا نیا موڑ			۲۱ جولائی	۱۹۵۲ء
۵	اردو ناول			۲ نومبر	۱۹۵۳ء
۶	نظیر اکبر آبادی ــــ عوامی شاعر			۱۱ اپریل	۱۹۵۵ء
۷	ڈاکٹر سلیم اختر سے ایک ملاقات	گفتگو طاہر تونسوی	جسارت کراچی	۱۱ اگست	۱۹۷۶ء
۸	گفتگو		جنگ راولپنڈی	۹ مارچ	۱۹۷۹ء
۹	ڈاکٹر سلیم اختر سے ایک ملاقات	گفتگو عطاء الحق قاسمی	نوائے وقت لاہور	۳ جنوری	۱۹۸۱ء
۱۰	تعلم خورد	ڈاکٹر سلیم اختر	پندرہ روزہ تقاضے	۱ دسمبر	۱۹۸۱ء
۱۱	رو برو	〃 〃	روزنامہ جنگ لاہور	۳ نومبر	۱۹۸۲ء
۱۲	موٹی کھال کا نقاد سلیم اختر	انتظار حسین	مشرق 〃	۲۱ مارچ	۱۹۸۳ء
۱۳	ڈاکٹر سلیم اختر ــــ ایک گفتگو	ڈاکٹر طاہر تونسوی	آفتاب ملتان	۱۰ مارچ	۱۹۸۳ء
۱۴	کھل کھیڑ کی	اختر شمار	〃	〃	۱۹۸۳ء
۱۵	ڈاکٹر سلیم اختر ــ بگولوں کا ہمسفر	انتظار حسین	مشرق میگزین	۱۳ نومبر	۱۹۸۶ء
۱۶	ڈاکٹر سلیم اختر سے ایک مکالمہ	انٹرویو عبداللطیف اختر	قسط اول نوائے وقت ملتان	۵ مئی	۱۹۸۸ء
۱۷	〃 〃 〃	〃 〃	〃	۱۹ مئی	۱۹۸۸ء
۱۸	نئی کتابیں	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	ہماری زبان	۱۵ اگست	۱۹۶۹ء
۱۹	اقبالیات کے نقوش	مرزا ادیب	روزنامہ نوائے وقت لاہور	۱۸ اپریل	۱۹۸۰ء
۲۰	فکر اقبال کے منور گوشے	محمد علی صدیقی	روزنامہ حریت کراچی	۱۰ مارچ	۱۹۷۷ء
۲۱	اقبال ممدوح عالم	انتظار حسین	مشرق لاہور	۱۲ اگست	۱۹۷۷ء
۲۲	اقبال کا کلام امریکہ میں	سید سرفراز احمد		۱۲ اپریل	۱۹۸۳ء
۲۳	علامہ اقبال اور ہمارے فکری رویے	ڈاکٹر آغا سہیل	روزنامہ نوائے وقت لاہور	۲۰ مئی	۱۹۸۳ء

۲۴	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	انتظار حسین	روزنامہ مشرق لاہور	۱۹ دسمبر ۱۹۸۰ء
۲۵	اردو ادب کی تاریخ کا مسئلہ	"	" " "	۳۱ مارچ ۱۹۸۱ء
۲۶	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ مختصر جائزہ	مرزا ادیب	" نوائے وقت لاہور	۵ مئی ۱۹۸۱ء
۲۷	ہماری جنسی اور جذباتی زندگی	محمد علی صدیقی	" حریت کراچی	۷ جون ۱۹۷۶ء
۲۸	تنقیدی دبستان	"	" " "	۱ مارچ ۱۹۷۶ء
۲۹	اردو کا ماہر نفسیات کا ڈاکٹر		پلک لاہور	اگست ۱۹۶۹ء
۳۰	ڈاکٹر سلیم اختر مکالمہ	سعادت سعید، طاہر تونسوی، حسن رضوی	روزنامہ جنگ لاہور	مئی ۱۹۸۴ء
۳۱	" " " "	عطاء الحق قاسمی	" نوائے وقت "	۲۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء
۳۲	رواں دواں	احمد ندیم قاسمی	" جنگ "	۲ اپریل ۱۹۸۴ء
۳۳	شعور اور لاشعور کا شاعر — غالب	ڈاکٹر ظفر علی راجا	" مشرق میگزین "	۸ فروری ۱۹۸۵ء
۳۴	" " " "	احمد ندیم قاسمی	" جنگ "	۲۷ مئی ۱۹۸۵ء
۳۵	" " " "	ڈاکٹر طاہر تونسوی	" نوائے وقت "	۳۱ اگست ۱۹۸۵ء
۳۶	سلیم اختر کا اسلوب تحریر	محمد افسر ساجد	" امروز "	۱۳ اپریل ۱۹۸۶ء
۳۷	ڈاکٹر سلیم اختر ایک خالص نفسیاتی نقاد	انتظار	" مشرق "	۲۴ جولائی ۱۹۷۹ء
۳۸	نفسیاتی تنقید تبصرہ	ڈاکٹر سہیل احمد	مجلہ صحیفہ	۱۹۸۶ء
۳۹	تنقید کے نفسیاتی دبستان کا سرخیل — ڈاکٹر سلیم اختر	طاہر تونسوی	ریحانات لاہور مکتبہ عالیہ	۱۹۸۷ء
۴۰	کتابیات تنقید و تحقیق پر ایک نظر	ڈاکٹر وحید قریشی	مقالات تحقیق مغربی پاکستان اردو اکادمی	۱۹۸۶ء
۴۱	ڈاکٹر سلیم اختر	فرزانہ سید	نقوش ادب لاہور	۱۹۸۷ء
۴۲	ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید نگاری	ڈاکٹر خورشید جہاں	ماہنامہ گلبن احمد آباد	مارچ اپریل ۱۹۸۹ء

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر سلیم اختر

(کی ادبی خدمات پر ریسرچ، اعزازات، رکنیت وغیرہ کا سلسلہ جاری)

فن و شخصیت پر کتب و مقالات:

"ہمسفر جگنوؤں کا رفن اور شخصیت"

ڈاکٹر طاہر تونسوی

لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۵ء دہلی: شان ہند

پبلی کیشنز ۱۹۹۲ء

"اردو کے رونفسیاتی نقاد"

سعیدہ بانو

مقالہ برائے ایم۔ اے اردو بہاؤ الدین ذکریا

یونیورسٹی ملتان ۱۹۸۷ء

"اردو افسانے میں ڈاکٹر سلیم اختر کا مقام"

یاسمین اشرف

مقالہ برائے ایم۔ اے اردو، بہاؤ الدین ذکریا

یونیورسٹی ملتان ۱۹۹۱ء

"اردو تنقید کے فروغ میں سلیم اختر کا حصہ"

(ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد)

ڈاکٹر جلیل اشرف (ہزاری باغ)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

رانچی یونیورسٹی (بہار بھارت) ۱۹۹۱ء

اخبارات اور رسائل جن میں ڈاکٹر سلیم اختر کے لئے الگ گوشے بنائے گئے:

۱ — سیپ، کراچی

۲ — الفاظ، کراچی (ڈاکٹر سلیم اختر نمبر)

۳ — ماہ نو، لاہور

۴ — عصری ادب، دہلی

۵ — فنون لاہور

۶ — بیسویں صدی، دہلی

۷ — افکار، کراچی

۸ — روزنامہ آفتاب، ملتان

۹ — نقوش، لاہور

۱۰ — تخلیق، لاہور

اعزازات:

۱ — داؤد ادبی انعام برائے تحقیق و تنقید:

"ادب اور لاشعور" ۱۹۷۷ء

۲ — گلڈ انعام برائے تنقید۔

"اقبال اور ہمارے فکری رویے" ۱۹۸۲

۳ — نقوش ایوارڈ برائے سفرنامہ

"بھارت" ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۹ء

۴ — نیاز فتحپوری ایوارڈ، ۱۹۹۳ء

رکنیت (سابق احال):

۱ــــ مرکزی فلم سنسر بورڈ

۲ــــ لاہور آرٹس کونسل (الحمراء) برائے مطالعہ

وتجزیہ ڈرامہ سکرپٹ

۳ــــ مجلس ترقی ادب

۴ــــ رائٹرز ویلفیر فنڈ حکومت پنجاب

۵ــــ ادیبوں کی بہبود کے لئے کمیٹی، اکادمی

ادبیات پاکستان

۶ــــ غالب کمیٹی اکادمی ادبیات پاکستان

۷ــــ مجلس شوریٰ شام ہمدرد

۸ــــ الیکشن کمشنر حلقہ ارباب ذوق

۹ــــ الیکشن کمیٹی برائے انتخابات پاکستان رائٹرز گلڈ

سیمینار کانفرنس:

چند اہم علمی سیمناروں کانفرسوں میں تحقیقی مقالات کی پیشکش

۱ــــ اقبال انٹرنیشنل کانگریس، لاہور ۱۹۷۷ء، ۱۹۹۳ء

۲ــــ ادبیاتِ تعلیم کانفرنس، اسلام آباد ۱۹۸۹ء

۳ــــ نگار و نیاز فتحپوری گولڈن جوبلی کانفرنس، کراچی

۴ــــ نیاز فتحپوری یادگاری کلیدی خطبہ: ۱۹۹۳ء

۵ــــ سیمینار برائے اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان،

اسلام آباد: ۱۹۹۹ء

۶ــــ احتشام حسین سیمینار کراچی ۱۹۹۳ء

۷ــــ بین الاقوامی اردو کانفرنس ملتان، ۱۹۹۰

۸ــــ اقبال کانفرنس، ملتان، ۱۹۹۰ء

۹ انشائیہ سیمنار ۱۹۹۰ء

۱۰ اقبال کانفرنس ۱۹۹۱ء، یونیورسٹی بہاولپور

۱۱ اقبال سیمنار، اقبال اکادمی لاہور ۱۹۹۴ء

۱۲ "قومی زبان عصری تقاضے"، مقتدرہ قومی زبان

اسلام آباد ۱۹۹۵ء

بیرون ممالک کے سیمنار:

۱ غالب سیمنار غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۱۹۶۹ء

۲ بزمِ اردو قطر، میر تقی میر سیمنار، دوحہ ۱۹۸۹ء

مستقل پتہ:

"المحروت": ۵۶۹۔ جہاں زیب بلاک

علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر جلیل اشرف

ایم اے (اردو) پی ایچ ڈی (رانچی یونیورسٹی) رانچی انڈیا

پیشہ: درس وتدریس مارکھم کالج آف کامرس

ونوبا بھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ انڈیا

زیر ترتیب تصنیف: پھر اس انداز سے بہار آئی (کہانیوں کا مجموعہ)

مستقل پتہ: افق آزاد نگر پلاول روڈ ہزاری باغ انڈیا

T&T PUBLISHERS

ٹی اینڈ ٹی پبلشرز

E/101-S-31 بینک کالونی سمن آباد

لاہور (پاکستان) 7576894 (042)

ISBN NO: 969-8305-05-X